جلد نمبر ۱۰۸ (۵۲۰) جولائی ۱۹۷۱ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کتبہ سید اقبال احمد)

مجلسِ ادارت

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات و احکام و قوانین کے لحاظ سے بلا تفریق مذہب و ملت نسل و رنگ نزاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے، اور اس کو اختیار کرنے اور اسی کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے یہاں سے اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے حقوق میں اہل کتاب اور مشرکین عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب داخل ہیں، اور حیوانات کے حقوق، اور ان سب کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات ان کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں ان کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا ہے۔

......((مرتبہ))......

شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت: ۳۲۰ صفحے قیمت: ۔/ بے

جلد ۱۰۸ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۷۱ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ ہندوستان کی دو نامور شخصیتوں سری پرکاش جی اور پروفیسر محمد حبیب نے وفات پائی، سری پرکاش کی شخصیت مختلف حیثیتوں سے بڑی اہم تھی، وہ ہندوستان کے مشہور فلسفی ڈاکٹر بھگوان داس کے فرزند اور پنڈت جواہر لال نہرو کے پرانے معتمد علیہ رفیق تھے، انگلستان کی تعلیم کے زمانہ سے لیکر ہندوستان کی جنگ آزادی اور اسکے بعد تک ہر مرحلہ میں دونوں کا ساتھ رہا، آزادی کے بعد سری پرکاش حکومت کے ذمہ دار عہدوں پر رہے اور بڑی خوبی سے اپنے فرائض انجام دیئے اور اپنے اخلاص اور سلامت روی کی بنا پر پاکستان میں بھی ہائی کمشنری کے زمانہ میں مقبول رہے، اور دونوں ملکوں کو قریب لانے کی کوشش کی وہ ہماری پرانی مشترک تہذیب کی یادگار اور ہندو مسلم اتحاد کے بہت بڑے علمبردار تھے اور آخر تک اس پر قائم رہے ان کا سب سے بڑا وصف انکی بے تعصبی، فراخدلی اور اخلاقی بلندی تھی، وہ سیاست میں بھی صداقت و اخلاص پر عامل تھے، جو آجکل کے سیاسی لیڈروں میں کمیاب ہے، اس لیے آزادی کے بعد کے حالات سے بہت بددل تھے، عرصہ سے خانہ نشینی اختیار کر لی تھی، لیکن کبھی کبھی اپنے خیالات اخبار کے ذریعہ ظاہر کرتے رہتے تھے، ایک مرتبہ پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ دار المصنفین بھی آئے تھے، اور یہاں کے بزرگوں سے ان کے تعلقات تھے، وہ جس تہذیب کی پیداوار تھے اس کا دور اب ختم ہو گیا، سری پرکاش اس کی آخری یادگار تھے، اب ایسے نمونے نہ پیدا ہوں گے۔

پروفیسر محمد حبیب ہندوستان کی قرون وسطیٰ کی تاریخ کے نامور مورخ تھے، اور اسکے ماہر مانے جاتے تھے، پوری عمر مسلم یونیورسٹی سے وابستہ رہے، اور شعبۂ تاریخ کی صدارت سے ریٹائر ہوئے، وہ صحیح معنوں میں عالم

تھے، انکی پوری زندگی تعلیم و تدریس اور تالیف و تصنیف میں گذری، اس کا ان کو ایسا چسکا تھا کہ ریٹائر ہونے کے بعد بھی مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کی علمی و تعلیمی رہنمائی کرتے رہتے تھے، انھوں نے اسلامی ہند کی تاریخ پر سیکڑوں مضامین لکھے لیکن اس کے بعض پہلوؤں کے متعلق ان کے خیالات دوسرے مسلمان مورخین سے مختلف تھے، اور اس میں اعتدال و توازن نہ تھا جس کا نمونہ ان کی کتاب محمود غزنوی اور ڈاکٹر اطہر عباس رضوی کی کتاب کا مقدمہ ہے جس میں انھوں نے مصنف کو البیرونی، بوعلی سینا، خواجہ نظام الدین لیا، اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا ہم پایہ بنا دیا ہے، لیکن اس سے ان کے علمی کمال میں فرق نہیں آتا، عملی سیاست کے آدمی نہیں تھے لیکن خیالات کے لحاظ سے پکے نیشلسٹ سمجھے جاتے تھے، انکی موت سے ایک نامور مسلمان مورخ اٹھ گیا، اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں سے درگذر کرے، اور ان کی مغفرت فرمائے۔

ہمارے لیے تیسرا حادثہ مولانا سید محمد ہاشم ندوی کی وفات کا ہے، وہ ندوہ کے لائق فرزند تھے جس سال راقم ندوہ میں داخل ہوا ہے، اسی سال وہ فارغ ہوئے تھے، اور حضرت سید صاحب کی سفارش سے اسی زمانہ میں دائرۃ المعارف حیدرآباد میں ملازم ہوگئے تھے جس سے ریٹائر ہونے تک وابستہ رہے، وہ اس کے اہم رکن تھے، بہت سی کتابیں انکے اہتمام میں شائع ہوئیں، بعض کی انھوں نے تصحیح بھی کی اور بعض پر مقدمے لکھے، انھوں نے ایک مفید علمی خدمت یہ انجام دی کہ دنیا کے مختلف کتب خانوں میں عربی کی جو اہم اور نادر و نایاب کتابیں ہیں ان کی فن وار فہرست "تذکرۃ النوادر" کے نام سے مرتب کی جو دائرۃ المعارف سے شائع ہوگئی ہے، ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد حیدرآباد ہی میں متوطن ہو گئے تھے، ان کی صحت عرصہ سے خراب تھی، گذشتہ مہینہ حیدرآباد کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ ان کا انتقال ہوگیا، ستر سے کچھ اوپر عمر رہی ہوگی، اللہ تعالیٰ اس خادم علم کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔

وزیر اعظم نے گذشتہ الیکشن میں اردو کے بارہ میں جو وعدے کیے تھے، ان کی ایک تقریر سے معلوم ہوا

کہ اس سلسلہ میں انھوں نے اتر پردیش کی حکومت کو اردو کی تعلیم کی طرف توجہ دلائی ہے، مگر محض اتنا کافی نہیں ہے، اردو کا اصل مطالبہ تو یہ ہے کہ ہندوستان کی ہندی ریاستوں میں اس کو دوسری سرکاری زبان بنایا جائے، اس کے بغیر اس کا پورا حق نہیں مل سکتا، ورنہ کم سے کم تعلیم کے ساتھ عدالتوں اور دوسرے سرکاری محکموں میں اردو میں درخواست دینے کا حق حاصل ہو، اور جو حقوق بھی ملیں اس کو قانونی شکل دی جائے، ورنہ ان پر عمل نہ ہوگا، جس کا تجربہ برسوں سے ہو رہا ہے، اور ان سب کے لیے اردو کی تعلیم ضروری ہے، اس کے بغیر نہ صرف عدالتوں اور سرکاری محکموں میں اردو سمجھنے والے بلکہ شعبۂ تعلیم میں اردو پڑھانے والے تک نہ ملیں گے، اس کی آسان شکل یہی ہے کہ آٹھویں تک اردو کی تعلیم لازمی کردی جائے، اس کے بغیر جو حقوق ملیں گے، ان سے پورا فائدہ حاصل نہ ہوگا۔

یہ تو حکومت کا کام ہے، اردو والوں کا یہ فرض ہے کہ اردو کو جو حقوق بھی ملیں، ان سے پورا فائدہ اٹھائیں، اردو کی بقا و ترقی کے جو وسائل ہیں ان کو اختیار کریں، اردو کے مکتب قائم کریں، اردو کے اخبارات، رسالوں اور کتابوں سے دلچسپی لیں، ان کی توسیع اشاعت کی کوشش کریں، اس وقت اردو کی خدمت کا ایک موقع یہ پیدا ہوگیا ہے کہ مرکزی انجمن ترقی اردو کی عمارت دلی میں بننے والی ہے، اس کے مصارف کا تخمینہ پانچ لاکھ ہے، کچھ رقم تو انجمن کے پاس ہے اور کچھ حکومت دے گی، لیکن یہ دونوں عمارت کی تکمیل کے لیے ناکافی ہیں، اس لیے انجمن نے اس کی فراہمی کے لیے مختلف رقموں کی رسیدیں چھپوائی ہیں، اردو والوں کو چاہیے کہ وہ ان رسیدوں کو منگوا کر مطلوبہ رقم فراہم کرنے کی کوشش کریں، اردو کے حامی تو کھیل تماشوں کے لیے ہزاروں روپئے جمع کر لیتے ہیں، کیا انجمن اس کی بھی مستحق نہیں ہے۔

مقالات

ارمغانِ سلیمانؒ

از شاہ معین الدین احمد ندوی

مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی سید صاحب کے ادبی و شعری ذوق کے بارہ میں لکھتے ہیں:

سید صاحب کے فاضلِ اجل اور عالمِ بے بدل ہونے کا ایک زمانہ قائل ہے، دنیا کو تسلیم ہے کہ فنِ تاریخ کے امامِ وقت تھے، اور سیرت نگاری میں اپنی نظیر آپ لیکن آخر دم تک کم ہی لوگوں نے ان کے ادبی، شعری اور تنقیدی مرتبہ کو جانا اور کمتر ہی لوگوں نے انھیں ادیب، انشاء پرداز اور سخن سنج کی حیثیت سے پہچانا، علم و ادب کی تاریخ میں ایسی ناشناسی اور کم شناسی کی مثالیں نہ معدوم ہیں نہ غیر معلوم''۔

سید صاحب کے علمی اور تصنیفی کارناموں پر تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا، لیکن ان کی شاعری کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی، ان کے داماد سید حسین صاحب نے سلیمان نمبر میں حضرت قبلہ کا عارفانہ کلامؒ کے عنوان سے ایک مختصر مضمون لکھا تھا، اور ان کے مجموعۂ کلامؒ ارمغانِ سلیمانؒ کے دیباچہ میں اس کے مرتب غلام محمد صاحب نے انکی شاعری پر مختصر تبصرہ کیا ہے، لیکن یہ دونوں مضامین ان کے مرتبۂ شاعری کو سمجھنے کے لیے ناکافی ہیں، ان سے صرف اس کی ایک جھلک نظر آتی ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ ان کے

کمال کا یہ رخ بھی پیش کر دیا جائے۔

شعر و شاعری سے اُن کے ذوق کی بنیاد ابتدائی تعلیم ہی کے زمانہ میں بیت بازی سے پڑی تھی، ان کے بھتیجے مولانا ابوظفر صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

ان مکاتب میں بیت بازی بھی ہوتی تھی کبھی ایک ہی مکتب کے طلبہ دو جماعتوں میں تقسیم ہو کر بیت بازی کرتے تھے، اور کبھی دو مکتبوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ ہوتا تھا، علامہ سید سلیمان ندوی کے مکتب میں بھی دو پارٹیاں تھیں، جہاں تک مجھے یاد ہے ایک پارٹی کے امیر علامۂ موصوف اور ان کے مشیر خاص مولوی حکیم سید نجم الہدیٰ صاحب ندوی تھے، اور دوسری کے مولوی محمد قاسم صاحب، یہ دونوں آج بھی بقید حیات ہیں، اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علامۂ موصوف کو شاعری سے ایک خاص لگاؤ ہو گیا، اور ہزاروں اشعار ان کو زبانی یاد ہو گئے۔

اس سلسلہ میں علامۂ موصوف نے ایک بیاض تیار کی تھی جس کے سرورق کو رنگ سے خوشنما بنا دیا تھا، اس میں ہزاروں منتخب اشعار درج تھے، میرے والد مرحوم کی وفات ۱۹۲۹ء تک میرے ذاتی کتب خانے میں یہ بیاض موجود تھی، چونکہ بیت بازی کے حریف خود ساختہ اشعار بھی پیش کرتے تھے، اس لیے علامۂ موصوف کو تقطیع کی طرف خاص توجہ کرنا پڑی جس سے انکو فن عروض میں اتنا عبور ہو گیا تھا کہ علما میں اس کی مثالیں کم ملیں گی" (معارف سلیمان نمبر)

ابتدائی تعلیم کے بعد وہ عربی کی تعلیم کے لیے پھلواری بھیجے گئے، یہاں خانقاہ کی قوالی کے اثر سے شعر و شاعری کا بڑا چرچا تھا، سید صاحب کو اس کا چسکا بیت بازی سے پڑ چکا تھا، قوالی کی محفلوں نے اس کا ذوق اور بڑھا دیا، وہ خود لکھتے ہیں:

"یہاں (پھلواری) خانقاہ میں ہر ہفتہ قوالی ہوتی تھی، اس کے اثر سے شعر و شاعری

کا خاصہ چرچا تھا، اس فضا میں میں نے سانس لی۔ اور یہیں سب سے پہلے مولوی عبدالحلیم شرر کا ناول منصور موہنا پڑھا، اور جب کتاب ختم کی تو خوب پھوٹ پھوٹ کر رو دیا" (معارف جولائی ۵۳ء)

اس کے بعد وہ مزید تعلیم کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے۔ اس زمانہ میں لکھنؤ کی پوری فضا پر شعر و شاعری چھائی ہوئی تھی، ہر طرف امیر و جلال کے نغمے گونج رہے تھے اور آئے دن مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ اس فضا نے شاعری کا نشہ اور تیز کر دیا، مولانا عبدالماجد صاحب لکھتے ہیں:۔

آخر زمانہ میں تو ان کا مطالعہ یوں بھی بہت گھٹ گیا تھا، بلکہ کہنا چاہیے کہ سمٹ سمٹا کر صرف دینیات تک محدود ہو کر رہ گیا تھا لیکن جن دنوں ذوق مطالعہ جوان تھا اور سن بھی جوانی کے تھے، تو اردو کی غزلیات کیا معنی ہزلیات تک کا دفتر بے معنی و با معنی ان کی انگلیوں کی نوک پر تھا، کلیات پر کلیات ختم کر دیے اور گلدستہ کا تو اب لفظ بھی تشریح طلب ہو گیا ہے۔ (اپنے زمانہ میں تازہ غزلوں کے ماہنامہ کو کہتے تھے) ایک زمانہ میں ان گل دستوں کی بہار تھی، لکھنؤ تو پھر بھی لکھنؤ ہے، اور شہروں بلکہ قصبوں تک میں ان کے ورق ورق گل کی طرح پھیلے ہوئے تھے، اور سید صاحب تھے کہ ان خوشبوؤں میں بسے ہوئے تھے، سید صاحب کا وطن پٹنہ خود ہی اردو شعر و سخن کے حق میں گلزار اور پھر سید کا لکھنؤ کا سالہا سال کا قیام، جو کور کسر رہ گئی تھی وہ پوری ہو گئی اور سید صاحب اس چمن کے ایک خوش نوا بلبل بن گئے (معارف سلیمان نمبر)

لکھنؤ کی اس شعر پرور فضا نے سید صاحب کو پورا شاعر بنا دیا، وہ خود بھی شعر کہنے لگے، کبھی کبھی مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے، مولانا ابو ظفر صاحب لکھتے ہیں:۔

شاعری کا نشہ لکھنؤ آکر اور تیز ہو گیا، ندوہ کے طلبہ میں مولوی رکن الدین دانا سہرامی،

سید عبدالغفور شہرر، مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی کے صاحبزادے مولوی مبین وغیرہ شاعری کرتے تھے، اس زمانہ کے اساتذہ میں داغ، امیر، جلال، ریاض، مضطر وغیرہ بقید حیات تھے، لکھنؤ میں گذشتہ ادبی سرگرمیاں موجود تھیں، "پیام یار" نامی رسالہ طرحی اور غیر طرحی غزلوں کے ساتھ ہر ماہ نکلتا تھا، شہر میں مجلسیں اور مشاعرے بکثرت ہوتے تھے، علامۂ موصوف ان مشاعروں میں اکثر شرکت کرتے تھے، آخر میں خود بھی شعر کہنے لگے تھے، اور انھیں اپنے احباب خاص طور سے مولوی صدیق حسن اور عثمان پاشا کو سناتے تھے، وہ اکثر مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے، اور غزل بھی سناتے تھے، ایک مرتبہ ایک مشاعرے کی خبر شام کو ملی، رات کو مشاعرہ تھا، غزل کہنے کی کوشش کی، اور صرف ایک شعر کہنے پائے تھے کہ احباب آگئے، اور ان کے ساتھ چل پڑے،۔۔۔۔ ان کی صورت شکل اور لباس دیکھکر شمع ان کے سامنے بھی آئی، پہلے تو بہت پریشان ہوئے، لیکن انتقال ذہن نے پریشانی دور کردی، انھوں نے معذرت کی کہ مجھے مشاعرے کی مطلق خبر نہ تھی، ابھی احباب نے اطلاع دی، فوراً اٹھا اور چلا آیا، اس لیے صرف ایک شعر ذہن میں آیا ہے، وہ عرض کرتا ہوں:

سرسے قدم تلک ہے ردائے حیا پڑی ۔۔۔ حاجت ہی کیا ہے آپ کو حضرت حجاب کی

شعر لکھنؤ کے رنگ کا تھا، خوب داد ملی۔ (معارف سلیمان نمبر)

اس زمانہ میں داغ اور امیر کا رنگ چھایا ہوا تھا، سید صاحب امیر کے زیادہ قائل تھے، ان کے دواوین ان کے مطالعہ میں رہتے تھے، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ان کی فن دانی اور تحقیق لغت کے تو معترف تھے مگر ان کی غزل گوئی کے قائل نہ تھے، اس بارہ میں انھوں نے اپنا اور سید صاحب کا ایک مکالمہ نقل کیا ہے:

سید صاحب۔ تو یہ کہئے آپ امیر مینائی کی غزل گوئی کے قائل نہیں، صرف ان کی فن دانی اور تحقیق لغت و زبان کے قائل ہیں، اچھا ایک شعر سناتا ہوں.........
بتائیے کیسا ہے؟

مولانا عبدالماجد۔ بہت اچھا ہے۔

سید صاحب۔ اور یہ شعر ....

مولانا عبدالماجد۔ یہ بھی خوب ہے سبحان اللہ۔

سید صاحب۔ اچھا اور یہ......... اور یہ......... اب کہاں تک سنیے گا

یہ سارے شعر امیر ہی کے تھے، اس لیے سید صاحب کا ابتدائی کلام بھی اسی رنگ کا ہے،
اس کا نمونہ یہ ہے:۔

دست نازک سے اٹھاتے ہیں وہ میت میری	بعد مدت کے ٹھکانے لگی محنت میری
تجلی کی طرح قبر پر آئے چلے گئے	ابتک ہمارے دل کو وہ تڑپائے جاتے ہیں
پہلے تو چھیڑتے تھے تصور میں بار بار	اب کیوں شب وصال وہ شرمائے جاتے ہیں
ادھر گلچیں خفا ہے اور ادھر بیتاب ہے بجلی	خدا حافظ ہے اے بلبل ترے اب آشیانے کا

یہ اشعار طالب علمی کے زمانہ کے ہیں، دوسرا دور قیام دارالمصنفین کے بعد سے شروع ہوتا ہے اس زمانہ میں مولوی اقبال احمد خاں صاحب سہیل اور مرزا احسان احمد صاحب کی نواسنجیوں سے اعظم گڈھ میں شعر و شاعری کا بڑا چرچا تھا، اس لیے یہاں بھی شاعرانہ ماحول ملا پھر آگے چل کر دارالمصنفین خود ایک بڑا ادبی مرکز بن گیا، اور اس عہد کے بہت سے شعراء کا تعارف معارف کے ذریعہ ہوا، جگر مرادآبادی کی شہرت کا آغاز بھی یہیں اعظم گڈھ سے ہوا، وہ اس زمانہ میں چشمہ کے ایجنٹ تھے، اس سلسلہ میں جب اعظم گڈھ آنا ہوتا تو مرزا احسان احمد صاحب

کے یہاں ٹھہرتے تھے، اور شعر و شاعری کی محفلیں جمتی تھیں، ان کے کلام کا پہلا مجموعہ داغ جگر مرزا احسان صاحب نے مرتب کیا تھا، جو معارف پریس میں چھپا تھا، اس پر ان کا مقدمہ بھی ہے، اسی سے جگر صاحب کی شہرت کا آغاز ہوا، ان کے دوسرے مجموعۂ کلام شعلۂ طور پر سید صاحب نے مقدمہ لکھا تھا، جو لطافت و شعریت میں جگر صاحب کی شاعری کا جواب ہے، اصغر گونڈوی کا مجموعۂ کلام نشاط روح معارف پریس میں چھپا، اس پر سہیل صاحب کا مبسوط مقدمہ ہے، جو بجائے خود ایک ادبی شاہکار ہے۔ مولانا عبد السلام ندوی خود شاعر اور نقاد سخن تھے، اُن کا خاص موضوع تنقید شعر و ادب تھا، انھوں نے شعر الہند لکھی جن کا ادبی اور شعری ذوق بنانے میں بڑا حصہ ہے، اور بکثرت ادبی و تنقیدی مضامین لکھے جس کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے، دار المصنفین نے مولانا حکیم عبد الحئی صاحب کی کتاب گل رعنا شائع کی، اردو زبان و ادب کی تاریخ و تنقید پر سید صاحب کے فاضلانہ مقالات اور تقریروں کا مجموعہ نقوش سلیمانی کے نام سے چھپ گیا ہے۔ راقم نے اس دور کے بہت سے ممتاز شعراء اصغر، جگر، فانی، ریاض خیرآبادی، جوش ملیح آبادی، خواجہ عزیز الحسن مجذوب اور حضرت سہیل کے کلام پر مبسوط تنقیدی مضامین اور متعدد شعراء کے دواوین پر مقدمے لکھے، جن کا مجموعہ نقوش ادب کے نام سے شائع ہو چکا ہے، سید صباح الدین عبد الرحمن نے ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی فارسی شاعری کی پوری تاریخ لکھی ہے جس کی کئی جلدیں چھپ چکی ہیں، اور بہت مقبول ہوئیں، دار المصنفین کے ان کارناموں نے اس کو علمی مرکز کے ساتھ ایک بڑا ادبی مرکز بھی بنا دیا۔

اس زمانہ میں کبھی کبھی یوں بھی مشاعرے ہوا کرتے تھے، جگر صاحب کی آمد پر خصوصیت کے ساتھ بزم مشاعرہ گرم ہوتی تھی، اس میں سید صاحب بھی شرکت فرماتے تھے، اور کبھی کبھی غزل بھی پڑھتے تھے، اور مولانا عبد السلام تو پابندی سے کہتے تھے، ان کی بیشتر غزلیں ان ہی مشاعروں

کی یادگار ہیں۔

سید صاحب کی شاعری کا دوسرا دور جو قیام دارالمصنفین کے بعد سے شروع ہوا، مولانا اشرف علی صاحب کی ارادت یعنی سنہ ۱۹۴۲ء تک قائم رہا، اس دور کے کلام میں نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے، اب ان کی شاعری محض گل وبلبل اور ہجر و وصال کی داستان نہیں رہ گئی، انکے جذبات میں لطافت اور خیالات میں معنویت اور گہرائی پیدا ہوگئی، اس دور کا نمونۂ کلام یہ ہے:

ہے کائنات کا ہر ایک ذرہ گردش میں ... پتہ جو چل نہ سکا تیری جستجو میں ہے

دہن میں تیغ کے اب بھی ہو تشنگی باقی ... عجیب لذتِ پنہاں مرے لہو میں ہے

نگاہِ لطف ادھر ہو کہ آ چلا ہو کیف ... بچا نہ رکھ مرے ساقی جو کچھ سبو میں ہے

اس کا بیت الغزل یہ شعر ہے:

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں ... وہ ایک قطرۂ خوں جو رگ گلو میں ہے

مولانا محمد علی مرحوم کی ایک مشہور غزل ہے، جس کا مطلع ہے:

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ ... دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

اسی زمین میں سید صاحب اور مولانا عبد الماجد صاحب نے بھی غزلیں کہیں، سید صاحب کی غزل کے چند اشعار یہ ہیں:

تشہیر کا باعث ہو نہ دامانِ قبا دیکھ ... لائے نہ کہیں رنگ یہ خونِ شہدا دیکھ

یہ عالمِ امکاں ہے تماشا گہِ قدرت ... جو کچھ تجھے دکھلائے یہاں دستِ قضا دیکھ

تاثیرِ وفا وعدۂ باطل ہے سراسر ... اب شوخ ستمگار یہ کچھ کر کے جفا دیکھ

انکار تھا تجھکو مری تاثیرِ دعا سے ... اب میری طرف دیکھ تو تاثیرِ دعا دیکھ

آزاد مکاں سے ہوا ہے قید مکاں کیا ... گر آنکھ ہے تجا میں بھی نورِ خدا دیکھ

نکلے گا وہ خورشید جمال آج ادھر سے　　اڑ جائیں میری خاک کے ذرے نہ صبا دیکھ

مقبول ہوئے یوسفِ زنداں[1] مرا تحفہ　　لایا ہے جو پیغام سبا ملک سبا دیکھ

مولانا عبدالماجد صاحب کی غزل

رفتارِ فلک دیکھ زمانہ کی ہوا دیکھ　　لے کورِ بصر دہر کا انجام ذرا دیکھ

ہر شے سے ٹپکتا ہے میرا جذب تمنا　　نالہ کا اثر دیکھ کہ تاثیرِ دعا دیکھ

آشفتہ سری پر میری کیوں طنز ہو اتنا　　تو خود بھی ذرا پرہمی زلف دوتا دیکھ

لازم ہے کبھی دلبری ان کی بھی ستم گر　　ٹوٹے نہ کہیں ہمتِ اربابِ وفا دیکھ

خودداری و تقوی پہ یہ کیوں ناز ہے زاہد　　ناظر کو در بت پہ کبھی ناصیہ سا دیکھ

اس غزل سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر مولانا نے شاعری کا کوچہ نہ چھوڑ دیا ہوتا تو اس میدان میں بھی ان کا قدم کسی سے پیچھے نہ رہتا، مگر ان کے صحیفۂ ادب نے صحیفۂ شاعری کو منسوخ کر دیا، پھر بھی ان کا شعری ذوق اتنا بلند ہے کہ وہ اشعار کو نثر میں نگینہ کی طرح جڑ دیتے ہیں،

اس زمانہ میں سید صاحب نے ایک نظم نما غزل "اخفائے محبت" کے عنوان سے کہی ہے جو خیالات کی رفعت و پاکیزگی کے لحاظ سے پڑھنے کے لائق ہے۔ اس کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ کیسی بیکسی ضبطِ محبت میں الٰہی ہے　　کہ اسکا نام بھی میری زباں پر آنہیں سکتا

لب خاموش بھی بیگانۂ رازِ دروں ہے　　کوئی حرف اس تمنا کا لبوں پر آنہیں سکتا

بشکلِ نافہ اسکو بند ہو کر دل میں رہنا ہے　　میں اس بوئے محبت کو کبھی پھیلا نہیں سکتا

نظر اپنی سرِ بزم انکی جانب اٹھ نہیں سکتی　　کہ اسرار دروں میں برملا بتلا نہیں سکتا

---

[1] یہ مولانا محمد علی کی طرف اشارہ ہے جو اس زمانہ میں جیل میں تھے [2] یعنی سلیمان

جو تنہائی بھی حاصل ہو تو لب کچھ کہہ نہیں سکتے
کہ صورت دل کی خلوت میں بھی یہ کھلا نہیں سکتا

اس اخفائے محبت میں جو لطفِ روح پرور ہے
کسی صورت میں وہ ضبطِ بیاں میں آ نہیں سکتا

اس دور کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

نازک بہت ہے عشق و محبت کا آئینہ
سایہ پڑے بھی غیر کا اس پر تو ٹوٹ جائے

یہ آبگینے مجھکو نہایت عزیز ہیں
اے خارِ دشت آبلہ کوئی نہ پھوٹ جائے

یہ کیسی آگ ہے سینہ میں دب دب کر سلگتی ہو
ذرا دامن سے دی تم نے ہوا اور دل میں لگتی ہے

نہ بجھ جانے کی رخصت ہو نہ جل جانے کی ہمت ہے
سلگ کر پھر وہ بجھتی ہے وہ بجھ کر پھر سلگتی ہے

یہ دل وہ شیشۂ نازک ہو میرے سینہ میں
نظر سے بھی جو گرے پاش پاش ہو جائے

نگاہِ شوق ذرا دیکھ بھال کر اٹھے
چھپا ہے راز جو دل میں نہ فاش ہو جائے

شکستِ رونقِ بتخانہ ہو نہیں سکتی
خلیل خود ہی اگر بت تراش ہو جائے

یہ رنگ اگرچہ پہلے رنگ کے مقابلہ میں بہت ستھرا ہے، لیکن سید صاحب کا شہبازِ علم اس سے بلند آشیانہ کا طالب تھا، اس لیے رفتہ رفتہ اس میں بڑا تغیر بلکہ انقلاب آگیا اور انکا کلام درمیانی عبوری دور کو طے کرکے شاعری کے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ گیا، اس وقت ان کی شاعری تمامتر دل کی آواز بن گئی، وہ خود فرماتے ہیں:

دامن کو آنسوؤں سے جو نم کر رہا ہوں میں
شرحِ غمِ فراق رقم کر رہا ہوں میں

جو شعر بھی سپردِ قلم کر رہا ہوں میں
سب وارداتِ عشق رقم کر رہا ہوں میں

مولانا روم کی زبان میں

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق
تا بگویم شرحِ دردِ اشتیاق

ایک دوسرے شعر میں فرماتے ہیں:

شعلے اٹھیں ہزار تجلی مگر کہاں | یہ آگ ہے ضرور مگر طور کی نہیں
سمجھیں مرے کلام کو جو ہوشمند ہیں | مستی مری یہ بادۂ انگور کی نہیں

اس دور کا کلام تمام تر تاہی واردات کا ترجمان اور بادۂ عرفان کا چھلکتا ہوا جام ہے، آخری دور کے کلام میں تو طور کی تجلیاں اور وادی ایمن کی شرر باریاں نظر آتی ہیں، یہ دور حضرت مولانا اشرف علی سے ارادت سے کچھ پہلے شروع ہوتا ہے، اور ارادت پر کمال کو پہنچتا ہے، اس میں راہ سلوک و معرفت کے ہر مرحلہ کے نشانات ملتے ہیں، ابتدائی دور کی خلش و تپش، اضطراب و بےچینی، حیرانی و سراسیمگی اور طلب و تمنا کے کوائف ملاحظہ ہوں:

بت پرستی بھی کروں اور بت شکن بھی میں بنوں | کیش ابراہیم رکھ کر پیشۂ آذر کروں
دل میں بتخانہ بسا ہے آنکھ ہے کعبہ کی سمت | حیف اس مومن نما کافر کو گر رہبر کروں
کفر پہ ہے دل کبھی مائل کبھی اسلام پر | معرکہ اس نور و ظلمت کا میں کیسے سر کروں
آنکھ میں توبہ کے آنسو دل میں اس بت کی ہوس | ہائے گنگا جل کو کیسے کوثر و زمزم کروں

یہ نغمہ ایک دوسری غزل میں اس سے زیادہ پرسوز ہوتا ہے، ایک طالب صادق کس کس عنوان سے اصلاح حال کی التجا کرتا ہے:

زباں تسبیح میں شاغل دل اسکی یاد سے غافل | لبوں پہ ذکر حق جاری مگر ساکت زبان دل
زباں تہلیل سے تر ہے خیالوں میں پھنسا ہو دل | نہ کھل جائے کہیں یارب یہ اسرار نہان دل
زباں تاثیر کی طالب ہے دل تاثیر سے خالی | زباں میں ہو نہ دل شامل نہ دل میں ہو زبان دل
خدا جانے کہاں دل ہو کہاں پر اسکی منزل ہو | نہیں ملتا سراغ دل، نہیں ملتا نشان دل
کوئی چوٹ ایسی لگ جائے الٰہی میرے سینہ میں | کہ فوارہ سا بنجائے یہ زخم خوں چکان دل

اگر ساقی تری چشم فسوں گر کام کر جائے
بدل جائے نظام دل، بدل جائے جہانِ دل

کشایش ہائے رنگا رنگ سے چھوٹوں قرار آئے
مقیم اس گھر میں ہو جائے اگر یہ مہمانِ دل

دورا ہے خرد کے جب سے آیا ہوں رہِ دل پر
یقیں کی شکل بنتا جا رہا ہے ہر گمانِ دل

یہ پرسوز صدا ایک غزل میں اور زیادہ دل گداز بن جاتی ہے :

صدق احساس کی دولت مرے مولیٰ دیدے
غم امروز بھلا دے غم فردا دیدے

وہ جن کچھ ایسی ہو فراموش ہو اپنی ہستی
دلِ دیوانہ و سودائی و شیدا دیدے

اپنے میخانہ سے اور دستِ کرم سے اپنے
دونوں ہاتھوں میں مرے ساغر و مینا دیدے

کھول دے میرے لیے علم حقیقت کے در
دلِ دانا دلِ بینا دلِ شنوا دیدے

دلِ بیتاب ملے دیدۂ پر آب ملے
تپ آتش مجھے دیدے نم دریا دیدے

درد دل سینہ میں رہ رہ کے ٹھہر جاتا ہے

جو نہ ٹھہرے مجھے وہ درد خدایا دیدے

طلب صادق اپنا اثر دکھاتی ہے، التجا قبول ہوتی ہے، اور اس کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں ۔

اے خوشا جذب محبت اے خوشا تاثیر عشق
گا ہے گا ہے ان کو میری یاد بھی آنے لگی

نامۂ عرض محبت شوق سے پڑھنے لگے
خط سے کیا دل کے دھڑکنے کی صدا آنے لگی

میری وارستہ مزاجی مدح کے قابل ہوئی
اب مرے جوشِ جنوں کی بھی ادا بھانے لگی

نغمۂ اللہ سے طبع حزیں موزوں ہوئی
جو کبھی گاتی نہ تھی اب وجد میں گانے لگی

تصور میں کیا کیا عنایت ہے انکی
مرے گھر میں آئے ہیں مہمان ہو کر

ستم بھی کرم ہے کہ شورِ محبت
مزا دے رہا ہے نمکدان ہو کر

جہاں کو معطر بنائے ہوئے ہے وہ زلفِ معنبر پریشان ہوکر
یہ کس میکدے سے اٹھی موجِ مے ہے چلی آرہی ہے جو فیضان ہوکر

حضرت سید صاحب کو خوش قسمتی سے علم و معرفت دونوں راہوں میں ایسے کامل شیوخ ملے جن کی توجہ نے دونوں میں کامل بنا دیا، ایک نے ان کو اپنی علمی جانشینی کا منصب عطا کیا، دوسرے نے روحانی خلافت سے سرفراز فرمایا۔

ایک طرف حضرت تھانویؒ جیسے شیخ کو سید صاحب جیسے شہباز علم کی ارادت پر ناز تھا تو دوسری طرف عقیدت کیش مرید نے باہمہ جلالت علم اپنے کو شیخ میں فنا اور اپنی ساری خواہشات اور مرضیات اور افکار و تصورات کو مرشد کے تابع کر دیا تھا۔

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

انھی کی ذات ان کا کعبۂ مقصود ۔ ۔ ۔ ۔ بن گئی تھی، مرشد و مسترشد کے اس تعلق اور اس کے اثرات و نتائج کے بڑے موثر مرقعے سید صاحب کے کلام میں ملتے ہیں:

اس زمانہ میں ان کے قلب پر فیضان کی اتنی بارش تھی کہ شاعری کا فوارہ پھوٹتا تھا۔ اس میں قلبی واردات و کوائف کا ایک عالم نظر آتا ہے، جن کی نزاکت شرح و بیان کی متحمل نہیں، اس لیے بغیر کسی شرح کے اسکے کچھ مرقعے پیش کیے جاتے ہیں۔

فنا فی الشیخ

جس دن سے میرے دل میں تری یاد بسی ہے ہر ایک کو میں تیرے سوا بھول گیا ہوں
آتا ہے خدا بھی ترے صدقے میں مجھے یاد گویا کہ بظاہر میں خدا بھول گیا ہوں
عالم کے تماشے نہیں اب جاذبِ دل ہیں ہر لذتِ ہستی کا مزا بھول گیا ہوں
ہر سمت نظر آتے ہیں ہر وقت وہ مجھ کو دوریِ مسافت کا گلہ بھول گیا ہوں

منظور تری چشم رضا جب سے ہوئی ہے | امید جزا خوف سزا بھول گیا ہوں
اے رہبر توفیق مجھے راہ بتا دے | نقش قدم راہنما بھول گیا ہوں

الٹا ہے ورق آج سے افسانۂ نو کا
افسانۂ پارینہ دلا بھول گیا ہوں

پیر میخانہ کی محفل اور چشم ساقی کے اثرات و کوائف کے اتنے دلکش مرقعے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کو لیا جائے اور کس کو چھوڑا جائے، کچھ مرقعے ملاحظہ ہوں،

ذرہ ذرہ عالم محسوس کا خاموش ہے | یار ہے گرم سخن محفل سراپا گوش ہے
چشم ساقی میں بھرا کیا بادۂ سرجوش ہے | جس طرف آنکھ اٹھ گئی وہ مست بیہوش ہے
جذب پیر مغاں دریا دل و دریا نوال | جمع ہیں میخوار میخانے میں نوشا نوش ہے
تیرے میخواروں کے ساقی کچھ عجب انداز ہیں | دل سراپا جوش ہے لیکن زباں خاموش ہے
اک نظر میں کچھ سے کچھ ہے میری دنیائے حواس | ہوش تھا جو بیہوشی ہے بیہوشی اب ہوش ہے

اس کا دوسرا منظر

ہر چیز میں جس کی ہے کیفیت مستانہ | آباد رہے یارب تا حشر یہ میخانہ
چھائی ہے یہاں مستی ہر ایک نمازی پر | حیرت ہے یہ گھر لے دل مسجد ہو کہ میخانہ
زاہد نے کہاں پائی زاہد نے کہاں پی لی | گفتار ہے رندانہ رفتار ہے مستانہ
دستار فضیلت ہو یا دلق مرقع ہو | ہوتا ہے لئے اک دن نذر مے و میخانہ
وہ چشم محبت تو جویائے محبت ہے | دیکھے تو ذرا کرکے اس سے کوئی یارانہ

حاصل رہے کیفیت ہر وقت حضوری کی
آ دل میں مرے چھپ جا لے صورت جانانہ

تیسری تصویر

کیا بھری تاثیر میں مطرب تری آواز ہے
جو تری محفل میں بیٹھا وہ سراپا ساز ہے

باغ میں صحرا نظر آتا ہے اور صحرا میں باغ
اب مرے جوشِ جنوں کا اور ہی انداز ہے

نام ان کا ہر نفس میں لب پہ یوں آیا کیا
تن میں جیسے روحِ بسمل مائلِ پرواز ہے

دیکھئے ملتی ہے کب دولت سکونِ عشق کی
ہائے ہوئے وجوش تو ہنگامہ آغاز ہے

گاہ دیکھا تھا مری چشمِ تصور نے تمہیں
اب وہی تصویر میری ہمدم و دمساز ہے

شیخ کے فیضان سے دنیائے دل بدل جاتی ہے، اضطراب کی جگہ سکون، شک و تذبذب کی جگہ اذعان و یقین پیدا ہو جاتا اور دل انوار و تجلیات سے معمور ہو جاتا ہے۔

اے مسیحِ دردِ دل چارہ گرِ آزارِ دل
پا رہا ہے تیرے درماں سے شفا بیمار دل

دور باش انکار باطل دور باش اغیار دل
سج رہا ہے شاہِ خوباں کیلئے دربارِ دل

تیرے اک چھینٹے سے لے ابر بہاری ان دنوں
سبز ہے شاداب ہے سیراب ہے گلزار دل

دور ہوتی جا رہی ہے ہر کھٹک جو دل میں تھی
تیرے سوزن سے نکلتے جا رہے ہیں خار دل

ہوش ہے گرمی و مستی ہے و نور شوق ہے
شکر ہے رونق پہ ہے امروز کاروبار دل

الحمد توفیق ضبط و الحمد تاب سکوت
لب پہ لے آئے نہ جوشِ دل کہیں اسرار دل

قلبِ عاشق بھی ہو پھر ہم پایۂ عرش بریں
جلوہ فرما مسندِ دل پہ اگر ہو یارِ دل

فخر تو اس رشتۂ تسبیح پر فرمانہ شیخ
دل کی رگ رگ سے تو پہلے کھینچ لے زنارِ دل

اس کیفیت کی دوسری تصویر

ساز کا راب گردشِ ایام ہے
دور میں ہشتاد سالہ جام ہے

لذتِ خلوت بیاں کیا کیجئے ایک میں ہوں ایک انکا نام ہے
دل ہوئے ناداں تجلی گاہِ دوست کیوں نگاہِ شوق سوئے بام ہے

تیرے یاد آنے سے ہر غم مٹ گیا دارو ئے ہر درد تیرا نام ہے
نام لیتے ہی نشہ سا چھا گیا ذکر میں تاثیرِ دورِ جام ہے
اس کی ذرہ دیدہ نگاہی کے نثار آج ہی آغاز کا انجام ہے
تھی جو آزادی تو ہر سو دوڑ تھی قید میں آرام ہی آرام ہے
اب درِ پیرِ مغاں چھوٹے نہیں اس کی مٹی میں بھی کیف جام ہے
فیض ہے یہ کس ولی وقت کا
اب مرا جو شعر ہے الہام ہے

اس راہ میں سب سے بڑی دولت محبت ہے،

اس فقر میں بھی عاشق کیا صاحبِ دولت ہے اک ذرہ محبت کا کونین کی دولت ہو
اک غم نے بنایا ہے ہر غم سے مجھے فارغ اندوہِ محبت بھی گنجینۂ حسرت ہے
آباد ہے اک عالم ہر گوشۂ خاطر میں دنیائے محبت میں افلاک کی وسعت ہے
اک گھونٹ میں بھولا ہے میخوار دو عالم کو کیا تند نشہ تیرا اے جامِ محبت ہے

ترے نام ہی میں حلاوت ملے جو ذوقِ محبت کی دولت ملے
ترے عشق کے غم کی دولت ملے تو سارے غموں سے فراغت ملے
محبت تو اے دل بڑی بات ہے یہ کیا کم ہے اس کی جو حسرت ملے
یہی زندگی جاودانی بنے
جو آبِ حیاتِ محبت ملے

آخری منزل عرفان حق

ذکر حق سے صیقلِ کامل ہوا　　محو دل سے نقش ہر باطل ہوا
چار جانب بارشِ انوار ہے　　جلوہ فرما دہ مہ کامل ہوا
قیل و قالِ مدرسہ کو چھوڑ کر　　شیخ بھی رندوں میں اب شامل ہوا
آج ہی پایا مزا ایمان کا　　جیسے قرآن آج ہی نازل ہوا
ایسے کچھ انداز سے تقریر کی　　پھر نہ پیدا شبہہ باطل ہوا
بزم میں دیکھا کیے اس ناز سے　　جس طرف دیکھا نشانہ دل ہوا

دیکھکر سب کو اس کو چن لیا
جو نگاہ ناز کے قابل ہوا

اس مقام پر پہنچ کر لا الہ الا اللہ کی حقیقت منکشف ہوتی ہے، اور ہر موئے بدن اسکا ساز بن جاتا ہے، اور ہر سو اسی کا جلوہ نظر آنے لگا

کس نے بھر دی یہ صدائے دلنواز　　ہر رگِ جاں ساز الا اللہ ہے
کوئی ہو آواز میرے کان میں　　ہر صدا آواز الا اللہ ہے
کار فرما ایک آتا ہے نظر　　منکشف اب راز الا اللہ ہے
دل سے ہوتا ہے ترانہ خود بلند　　قلبِ ذاکر ساز الا اللہ ہے

وجد میں جاں ہے تو اعضا رقص میں
جام سے آواز الا اللہ ہے

اس دور کا کلام اس قبیل کے وجدانی کوائف اور عارفانہ معارف حقائق سے معمور ہے، اتنی مثالیں اس کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔

سید صاحب نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے، غزل کے علاوہ نعتیں، قومی نظمیں، مراثی، اور قطعات و رباعیات بھی کہے ہیں، جس سے ان کی قدرت کلام کا اندازہ ہوتا ہے، ان نظموں کی تعداد خاصی ہے، ان سب کی تفصیل طویل بھی ہے اور غیر ضروری بھی، اس لیے صرف ان کے نمونے نقل کیے جاتے ہیں۔

حج کے موقع پر انھوں نے کئی نعتیں کہی تھیں، مگر وہ محض شاعر نہیں بلکہ مقام نبوت کے مرتبہ شناس اور اوصاف و خصائص نبوت کے عارف بھی تھے۔ اس لیے ان کی نعتوں میں شاعری سے زیادہ حقیقت کا بیان ہے، مدینہ طیبہ کی حاضری کے وقت بارگاہ رسالت میں یہ نعت پیش کی تھی،

آدم کے لیے فخر یہ عالی نسبی ہے　　مکی مدنی ہاشمی و مطلبی ہے
پاکیزہ تر از عرش و سما جنت و فردوس　　آرامگہ پاک رسول عربی ہے
آہستہ قدم نیچی نگہ پست صدا ہو　　خوابیدہ یہاں روح رسول عربی ہے
اے زائر بیت نبوی یاد رہے یہ　　بے قاعدہ یاں جنبش لب بے ادبی ہے
کیا شان ہے اللہ رے محبوب نبی کی　　محبوب خدا ہو وہ جو محبوب نبی ہے

بجھ جائے ترے چھینٹوں سے اے ابر کرم آج
جو آگ مرے سینہ میں مدت سے دبی ہے

سفر حج سے واپسی کے وقت حسب ذیل نعت کہی تھی

عشق نبوی درد معاصی کی دوا ہو　　ظلمتکدۂ دہر میں وہ شمع ہدی ہے
پڑھتا ہو درود آپ ہی تجھ پر ترا خالق　　تصویر پہ خود اپنی مصور بھی فدا ہے
نور نبوی مقتبس از نور خدا ہے　　بندہ کو شرف نسبت مولیٰ سے ملا ہے

احمد سے پتہ ذات احد کا جو ملا ہے
مصنوع سے صانع کا پتہ سب کو چلا ہے

بندہ کی محبت سے ہے آقا کی محبت
جو پیرو احمد ہو وہ محبوب خدا ہے

آمد تری اے ابر کرم رونقِ عالم
تیرے ہی لیے گلشنِ ہستی یہ بنا ہے

فردوس و جہنم تری تخلیق سے قائم
یہ فرق بد و نیک ترے دم کو جلا ہے

فرمانِ دو عالم تری توقیع سے نافذ
تیری ہی شفاعت پہ رحیمی کی بنا ہے

لیجائے گا ہر رو کو وہ منزل سے بہت دور
جو جادہ سفر کا ترے جادہ کے سوا ہے

ایک نظم "سر الحیات" میں قوم کی زبان سے مسلمانوں کی غفلت اور ان کے زوال کے اسباب کا ذکر کر کے ان کی تجدید کی اصل روح بیان کی،

(۱)
اک شور ہو کہ قوم میں اب زندگی نہیں
شیرازۂ جماعتِ قومی ہے منتشر

فقدانِ آرزو ہے تمنا کا قحط ہے
ترغیب کا نہ ذوق نہ ترہیب کا اثر

قوت نہ بازوؤں میں نہ سر میں بلند فکر
کچھ اضطرابِ قلب نہ کچھ کاوشِ جگر

جوششِ عمل نہ ولولۂ کاروبار ہے
اک موت سی ہے چھائی ہر اک فرد قوم پر

نے آرزوئے علم، نہ فکرِ حصول جاہ
فارغ ہیں احتیاج زمانہ سے سربسر

(۲)
اے چارہ گر تغافلِ دیریں سے ہوشیار
معلوم ہے تو رمز حیات امم مگر

مانا کہ دست و پیر میں اب ارتعاش ہے
مانا کہ پاؤں میں نہ رہی طاقت سفر

مانا کہ آبلوں سے ہیں تلوے بھرے ہوئے
چرکے لگے ہوئے ہیں بہت جسم زار پر

مانا زباں میں طاقتِ گفتار بھی نہیں
مانا نہیں ہے آنکھوں میں اب قوتِ نظر

یہ سب صحیح پر ہے ضروری بقائے روح
لازم ہے فکرِ زخم جگر سب سے بیشتر

تعلیم نو، سیاستِ ملکی، فنونِ حال
اکسیر ہیں مگر نہ دوائے دل و جگر

وہ جذبِ مذہبی ہو وہ ملت کا جوش ہے
جو چشمۂ حیات ہے اور قوتِ بشر

پیدا ہو جب وہ آگ کے شعلوں کی شکل میں
ہو جائے جب وہ برق کی صورت میں جلوہ گر

ان سست بازوؤں میں پہاڑوں کا زور ہو
ان مضمحل قویٰ میں ہو طوفان کا اثر

درسِ مساوات

نازشِ دودۂ عباسیہ ہارون رشید
اک دفعہ شہرِ مدینہ کا کیا اس نے سفر

ساتھ شاہزادۂ مامون و امین دونوں تھے
ایک تھا لختِ جگر دوسرا تھا نورِ بصر

اس زمانہ میں مدینہ کا تھا گوشہ گوشہ
چشمۂ نورِ ہدیٰ منبعِ قرآن و اثر

ہر طرف زمزمۂ حدثنا اخبرنا
ہر طرف شورِ فگن صلے علیٰ خیرِ بشر

ایک نقطہ پہ یہاں جمع تھا سارا عالم
سندھ و چیں، شام و عرب، مغرب و مصر و بربر

آرزو تھی یہ خلیفہ کو مدینہ جا کر
جائیں محروم نہ اس در سے مرے لختِ جگر

حکم پہنچا یہ خلافت سے کہ اے ابنِ انس
مجمعِ عام میں جا سکتے نہیں میرے پسر

اس لیے آج یہ بہتر ہے کہ تعلیم حدیث
آپ دیں خاص انھیں ایوانِ شہی میں آکر

سن کے فرمانِ خلافت کو یہ ارشاد ہوا
اے خلیفہ تری تعمیل ضروری ہے مگر

ہے یہ علم نبوی تیرے ہی گھر کی دولت
خواہ حرمت اسے دے خواہ اہانت اسے کر

سن کے ہارون نے دربارِ امامت کا جواب
بھیجا پیغام کہ خیر آپ نہ آئیں گے اگر

خود یہ شہزادے وہاں درس میں حاضر ہوں گے
مگر اوروں کا نہو بزم میں اس وقت گذر

مالک ابنِ انس نے اسے کہلا بھیجا
میرے کاشانہ میں ممکن نہیں تمیزِ بشر

مساوات بشر معنی اسلام ہے یہ درگہ خاص نہیں درس گہ عام ہے یہ

ان نظموں میں مولانا شبلی کا رنگ نمایاں ہے۔

دریائے نربدا

اقبال کو گنگا کے کنارے اپنے کاروان رفتہ کی یاد آئی تھی،

اے آب رود گنگا وہ دن ہیں یاد تجھکو اترا ترے کنارے جب کاروان ہمارا

سید صاحب کو دریائے نربدا دیکھکر اس کارواں کی یاد آئی اور اُن کے جذبات میں تلاطم پیدا ہوا

نربدا، اے نربدا، اے جادۂ بحر عرب گرچہ تو ہندی ہے لیکن زادۂ بحر عرب

ہاں گذشتہ کارواں کا تو نشان راہ ہے ہند میں اسلام کی تاریخ سے تو آگاہ ہے

جانتا ہے تو مری تاریخ کا پوشیدہ راز تیرے دروازے پہ ٹھہرا تھا مرا پہلا جہاز

ہند میں اسلام کے انجام کا آغاز تو چار صدیوں تک رہا اسلام کا دمساز تو

رشتۂ ہند و عرب تجھسے ہوا تھا استوار تیرے ساحل کا ہر اک ذرہ ہے اسکی یادگار

آج کس کو یاد ہے وہ داستان باستاں تیرے ساحل پر جب اترا تھا عرب کا کارواں

تو ہی دریائی پری یا شاہد عالم ہے تو اس سمندر کے گلے کی شہ رگ اعظم ہے تو

اے بھروچ اے خاتم انگشت زرد نربدا عہد ماضی کی تری عزت رہے قائم سدا

تو بتا اے چشم زائر آج تیری خاک ہے تیرا ساحل یادگار امت لولاک ہے

جب نگاہیں تیری جانب میں نے مشتاقانہ کیں
تیری موجیں کہنہ افسانوں کی سطریں بن گئیں

ایک حکیمانہ نظم "تسلسل حوادث" تاثیر اور سبق آموزی کے ساتھ سلاست بیان

کا بھی نمونہ ہے،

دم سرد ہے آہ پر آہ ہے
تسلسل حوادث کا جانکاہ ہے

بھروسہ نہیں اب بجھا تب بجھا
دم اپنا چراغ سر راہ ہے

اٹھا بستر خواب آگے کو چل
ہوئی ختم شب اب سحرگاہ ہے

یہاں پیش بینی کوئی کیا کرے
یہاں جو مصیبت ہے ناگاہ ہے

اسے کب غموں سے رہائی ملے
جو وابستۂ ما سوی اللہ ہے

گدا سب کے در کے ہوس سے بنے
جو سب سے غنی ہے وہی شاہ ہے

ہر اک کی خوشامد ہر اک کی تمنا
اسیر بلا طالب جاہ ہے

سفر کی صعوبت سے دل کیوں ڈرے
اگر خضر توفیق ہمراہ ہے

اندھیرا جو عالم میں چھایا ہوا
چراغ جہاں قلب آگاہ ہے

مولانا شبلی مرحوم اور اپنی پہلی بیوی کی وفات پر بڑے دردانگیز مرثیے کہے ۔
استاد کا مرثیہ بہت طویل ہے، بیوی کے مرثیے کے چند اشعار یہ ہیں ۔

ہم سفر وادی ہستی میں وہ دلبر نہوا
شمع اس راہ میں اس کا رخ روشن نہوا

درد اٹھ اٹھ کے مرے دل میں ٹھہر جاتا ہے
کیوں رگ دل کی جگہ سینہ میں نشتر نہوا

یہ تماشائے جہاں خواب پریشاں ہی سہی
پر یہ کیوں خواب مرے واسطے شب بھر نہوا

کس سے کیجیے دل شیدا گلۂ تنہائی
مسند آرا مرے پہلو میں جو دلبر نہوا

تیرے جانے پہ گماں تھا کہ نہو حشر بپا
تو گیا اور بپا دھر میں محشر نہوا

حیف اس خون کی قیمت جو مژہ سے ٹپکے
قطرۂ اشک ہوا گوہر احمر نہوا

فارسی شاعری پر ان کی نظر بہت وسیع تھی اور اس کا ذوق بھی تھا مگر خود فارسی میں

مشق سخن کی طرف توجہ نہیں کی، اس لیے ان کی صرف دو نظمیں فارسی میں ملتی ہیں، ایک ندوہ میں مولانا شبلی کی مستقل آمد کے موقع پر ان کے استقبال کا قصیدہ، دوسری نظم یا غزل بہت بعد میں کہی تھی۔ قصیدہ کے اشعار یہ ہیں :-

بدہ ساقی مئے کو افگند جلباب ظلمانی   خرد را نور بخشد از چراغ طور ایمانی
مئے کز جرعہ اش رونق فزاید لفظ و معنی را   دہد تیغ زباں را جوہر تیغ صفاہانی
مپرس افسانۂ دارا و اسکندر کہ می باشد   مپرس از دفتر پارینِ حکمت ہائے یونانی
ندارم گوش بر این نغمہ سنجیہائے داؤدی   کہ گوشم ہست بر آواز مرغِ باغِ یزدانی
فدائے آں حدیثِ روح پرور باد ہر جانے   کہ جان نو دمد در مردہ دل چوں آبِ حیوانی
خدیو کشورِ معنی کہ فرمانش برد دلہا   چہ دلہا سکہ بر جاں زد چہ بر قاصی چہ بر دانی
بیائے قصہ خوانِ جاہ و افریدون و کیخسرو   ببیں اینجا کہ درویشے کند در فقر سلطانی
نہ ایوانے نہ دربانے نہ دیہیمے نہ اورنگے   نمی دارد بہ بستش ہیچ اسباب جہانبانی
و نا قش سجدہ گاہِ قصرِ ایوانِ شہنشاہی   بساطش بوسہ گاہِ دانش آموزانِ یونانی
کہن دستارِ او بالاتر از اکلیل سلطانی   حصیر کلبہ اش بہتر ز اورنگِ سلیمانی
عصائے موسوی کلکش ید بیضا ست قرطاسش   سطور صفحہ اش چوں عقد بر رخسار نورانی
صریر خامہ اش نغمہ سرائے گلشنِ حکمت   مدادش از پئے چشم ورق کحلِ صفاہانی
سخن گوید لبش یا گوہر شہوار می بارد   بہ چنیں گوہر نہ زنہار آفریدست ابر نیسانی
سنانِ خامہ اش کشورکشائے معنی و دانش   زبانگ طبلِ صیتش پر فضائے کونِ امکانی
ضمیرش چوں کند غواصیِ جیحونِ مشکلہا   برآرد دستِ فکرش صد درِ ناسفتۂ نورانی
بیانش ابر باران است چوں می بخشد و می بارد   بہ بوم شورہ سرسبزی و سبزہ را فراوانی

مسیحا دم باعجاز قلم جانِ دگر بخشد | بحکمِ قم باذن اللہ آں تن راکشد فانی
بجز اسم از خداوندے کزاں شد حی وقیوم است | بماند زندہ جاوید این شبلیِ نعمانی

یہ قصیدہ طالب علمی کے زمانہ کا ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر انھوں نے فارسی شاعری کی طرف توجہ کی ہوتی تو اس میں بھی انکا پایہ اُردو شاعری سے کم نہوتا۔ دوسری نظم یا غزل انھوں نے ۱۹۴۳ء میں مولانا اشرف علی صاحب سے ارادت کے بعد کہی تھی، اس میں ان کی باطنی کیفیت کا رنگ جھلکتا ہے۔

شیوۂ صیدِ زبونم آرزوست	سینۂ آغشتہ بخونم آرزوست
گوش می جوید پیام از وصلِ دوست	ارجعی ورا جعونم آرزوست
عشق راگوئی جنوں اے بیخبر	با ہمہ ہوش ایں جنونم آرزوست
داغ بر دل از غمِ انجامِ دل	مژدۂ لاتحزنونم آرزوست
قرب بے غیبت نماز عاشقاں	فی صلوٰۃ دائمونم آرزوست
می برد بیتابئ دل کو بہ کو	بر درت صبر وسکونم آرزوست
از حصار ایں دل آں بیروں کشد	آن نگاہ پرفسونم آرزوست
بسکہ دزدیدہ نگہ بر من فگن	نشترِ زخمِ درونم آرزوست

خیرِ من ہست انچہ تو فرمودۂ
انچہ فرمودی ہمونم آرزوست

اس غزل کی شانِ نزول کے متعلق فرماتے ہیں کہ انتیسویں شب رمضان کو نماز تہجد پڑھکر ذکر کے لیے بیٹھا تھا کہ دفعۃً پوری غزل قلب پر وارد ہوئی، اس سے اس کی قیمت اور بڑھ جاتی ہے۔

فارسی کا ایک قطعہ بھی ملتا ہے۔ اس کی تقریب یہ ہے کہ سید صاحب ایک مرتبہ قیام حیدرآباد کے زمانہ میں حکیم الشعرا امجد حیدرآبادی سے ملنے کے لیے ان کے گھر تشریف لے گئے، امجد نے اس عزت افزائی پر یہ قطعہ کہا:

از جلوۂ حسنِ خویش حیراں کردی — کافر دل را اگر مسلماں کردی

بنواختی از قدومِ خود امجد را — ایں مورِ ضعیف را سلیماں کردی

سید صاحب نے اس کے جواب میں یہ قطعہ ارشاد فرمایا

امجد تو اسیرِ لطف احساں کردی — در زور سخن دلم درخشاں کردی

منت بہ غریب شہر حیداں کردی — کاں مورِ ضعیف را سلیماں کردی

اگرچہ سید صاحب نے فارسی شاعری کی طرف بہت کم توجہ کی لیکن اس کے رموز و اسرار پر ان کی نظر بڑی گہری تھی۔ اسکا اندازہ علامہ اقبال کی مثنوی رموزِ بیخودی پر ان کے ریویو کے سلسلہ میں دونوں کی خط و کتابت سے ہوتا ہے۔ اس ریویو میں سید صاحب نے مثنوی کے محاسن اور معنوی خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ اس کی لسانی فروگذاشتوں کی طرف اجمالی اشارہ کر دیا تھا، مگر اسکی وضاحت نہیں کی تھی۔ پھر علامہ اقبال کے استفسار پر انھوں نے انکے مسامحات لکھ بھیجے، اور اس سلسلہ میں دونوں میں خط و کتابت ہوئی جس میں اقبال نے سید صاحب کے بعض اعتراضات کو تسلیم کیا ہے اور بعض کے جوابات دیے ہیں، سید صاحب کے خطوط جن میں انھوں نے مسامحات کی تفصیل لکھی تھی، تو نظر سے نہیں گذرے لیکن ان کے جواب میں اقبال نے جو خطوط لکھے ہیں وہ اقبال نامے میں چھپ گئے ہیں۔ ان سے فارسی زبان میں سید صاحب کی دیدہ وری کا اندازہ ہوتا ہے، مگر طوالت کی وجہ سے ان کے نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

حضرت سید عربی کے ممتاز ادیب تھے، ان کا عربی زبان و ادب کا ذوق بہت بلند تھا، ندوہ میں عربی ادب و انشاء کے استاد بھی رہ چکے تھے، طالب علمی کے زمانہ میں لکھنؤ کے عربی رسالہ البیان میں ان کے مضامین نکلتے تھے، انھوں نے عربی میں بھی شاعری کی ہے، اور چند نظمیں ایک نوٹ بک میں جمع کی تھیں، اس کو وہ غالباً اپنے ساتھ پاکستان لیتے گئے۔ افسوس ہے کہ وہ یہاں نہیں ہے، ورنہ ان کی عربی شاعری کا نمونہ بھی سامنے آجاتا،

مگر اس ذوقِ سخن اور تین زبانوں میں قدرت کلام کے باوجود، آخری دور کو چھوڑ کر وہ ایک عرصہ تک محض تفننِ طبع کے طور پر شاعری کرتے تھے اور اس کو انھوں نے کوئی اہمیت نہیں دی، اس لیے کوئی تخلص اختیار نہیں کیا، اور جو غزلیں اور نظمیں شائع کیں وہ "رمزی" کے پردہ میں ہیں، ان کا اصلی میدان علم وفن اور تلاش و تحقیق تھا، اس میں ان کے کارنامے غیر فانی ہیں،

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اس کی آب و تاب میں ان کی شاعری ماند پڑ گئی تھی،

تفسیر ماجدی اردو

تفسیر ماجدی اردو کا دوسرا اڈیشن بکثرت اضافوں کیساتھ خود صاحب تفسیر مولانا عبدالماجد دریابادی کے اہتمام و نگرانی میں ہندوستان میں چھپ رہا ہے، جسکی اب تک بحمداللہ دو جلدیں مختلف پاروں سے چھپ کر شائع ہو چکی ہیں، ایک سورہ فاتحہ سے آل عمران تک ہے اور دوسری سورۂ نساء سے سورہ توبہ تک۔ ہدیہ جلد اول طبع ثانی مجلد ۱۰؎، جلد دوم غیر مجلد ۱۵؎

پتہ: صدق بک ایجنسی، کچہری روڈ، لکھنؤ۔ دارالمصنفین اعظم گڈھ

ابوالفضل اور اس کی انشا پردازی پر ایک نظر

از سید صباح الدین عبد الرحمن

اکبر کو اکبر اعظم بنانے والا شیخ ابوالفضل ۹۵۸ھ (۱۵۵۱ء) میں پیدا ہوا، بچپن ہی سے اپنی ذہانت کے لیے بے نظیر تھا، اس نے آئین اکبری کے آخر میں اپنے اور اپنے خاندان کے جو حالات لکھے ہیں، اس میں وہ بیان کرتا ہے کہ جب وہ ایک سال کا تھا تو اس کو قوتِ گویائی حاصل ہو گئی، اور جب وہ پانچ سال کا تھا تو اس کو غیر متعارف اشیاء سے آگاہی ہو گئی، اور جب وہ سات برس کا ہوا تو اپنے والد بزرگوار کے علم کا خزانہ دار اور جواہر معانی کا نگہبان اور امین ہو گیا، اور جب وہ مدرسہ میں داخل ہوا تو جو کتاب اس کی نظر سے کبھی نہیں گذری تھی، وہ اس کی پڑھی ہوئی کتاب سے زیادہ سمجھ میں آنے لگی، وہ اپنی اس ذہانت کو نعمت الٰہی قرار دیتا ہے، جو بقول اس کے عرش تقدس سے اسکے قلب میں نزول صعودی کر گئی تھی، وہ کھانے پینے سے بے نیاز ہو کر صرف مطالعۂ کتب میں لگا رہتا، اس کے درس میں جو کتاب بھی ہوتی، اس کو زبانی یاد ہو جاتی، خواجہ ابوالقاسم کا حاشیہ زبانی سنا سکتا تھا، وہ لکھتا ہے کہ اسی طالب علمی کے زمانہ میں صفاہانی کے حاشیے کا نصف سے زیادہ حصہ دیمک نے کھا لیا تھا، اس نے اس دیمک خوردہ حصہ کو

علیحدہ کرکے دوسرا کاغذ اس میں جوڑ دیا، اور پھر ذہن پر زور دیکر اندازہ سے دیمک خوردہ حصہ کو بھرنے لگا، اور جب سارے حصے بھر چکا تو اصل کتاب سے عبارت ملائی گئی، مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ دو مقامات پر مترادف یعنی ہم معنی الفاظ بدلے ہوئے تھے، اور تین چار جگہوں پر متقارب یعنی ملتے ہوئے الفاظ میں تھوڑا بہت فرق تھا، اس کی اس ذہانت پر تمام لوگ دنگ تھے۔ (آئین اکبری جلد سوم ص ۱۷ - ۲۱۵)

اکبرنامہ (جلد سوم ص ۸۴ - ۸۳) میں وہ لکھتا ہے کہ کمسنی ہی میں اپنی خود بینی اور خویش آرائی میں ظاہر بینی اور تقلید پرستی کے خلاف اس کو جنون پیدا ہو گیا تھا، والد بزرگوار کی خواہش کے خلاف اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنے مزاج کی شوریدگی کو دبانے کی خاطر خطا کے داناؤں کے پاس چلا جاتا، یا کوہ لبنان کے مرتاضوں کی صحبت میں جاکر رہتا، یا تبت کے جوگیوں سے جاکر گفتگو کرتا، یا پرتگال کے پادریوں کا دامن جاکر تھام لیتا، یا فارس کے موبدوں کی صحبت میں بیٹھا رہتا، یا ہندوستان کے رموز دانوں کے یہاں جاکر پناہ لیتا، اسی شوریدگی میں ارباب صحو اور اصحاب سکر کی صحبتوں سے دل برداشتہ رہتا، ان ہی دنوں جب کہ وہ ذہنی پریشانیوں میں مبتلا تھا، تو آیۃ الکرسی کی ایک تفسیر لکھی اور اکبر کے حضور میں پیش کی، اکبر نے اس کو حسن قبول عطا کیا، اور اپنی نوازشوں سے نوازا کے اپنی ملازمت میں داخل کیا جس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ اس رابطۂ روحانی کے بعد اس کی سراسیمگی اور حیرت جاتی رہی، اور وہ اکبر کو دانائے نہانخانۂ اسرار الٰہی سمجھتا رہا (اکبرنامہ ج ۳ ص ۵۸)

ملا عبدالقادر بدایونی ابوالفضل کے مذہبی عقیدوں سے خوش نہ تھے، وہ اکبر کے دین الٰہی کا علمبردار بھی بن گیا تھا، اس لیے ملا صاحب نے اس کے خلاف اپنی آزردگی اور کبیدگی کا اظہار نہایت سخت الفاظ میں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "شیخ ابوالفضل نے دوسری بار باریابی کے

موقع پر آیۃ الکرسی کی تفسیر پیش کی جس میں بہت سے قرآنی دقائق و نکات تھے، مگر کہا جاتا ہے کہ یہ تصنیف اس کے والد کی ہے۔ بادشاہ نے اس کو پسند فرمایا، اور اس کی تاریخ "تفسیر اکبری" سے نکالی گئی، اس کے بعد ملا صاحب رقمطراز ہیں کہ بادشاہ نے فرعون صفت ملاؤں کی گوشمالی کے لیے ان سے (یعنی ملا صاحب سے) توقع لگا رکھی تھی، لیکن اب ان کو ایک موزوں آدمی مل گیا، ابوالفضل پہلے ہی سے علما، کا مخالف تھا، کیونکہ جیسا کہ ملا صاحب لکھتے ہیں شیخ عبد النبی، مخدوم الملک اور دوسرے تمام علما، نے ایک زمانہ میں شیخ مبارک ناگوری کی گرفتاری کے لیے محتسبوں کو مقرر کر رکھا تھا۔ ملا صاحب کا بیان ہے کہ شیخ ابوالفضل نے جلد ہی اپنی خدمت، زمانہ سازی، بد دیانتی، مزاج شناسی اور خوشامد سے بادشاہ کا زیادہ تقرب حاصل کیا، اور جیسے ہی اس کو موقع ملا، اس نے بادشاہ کی مدد سے ان تمام لوگوں کو رسوا کیا جنھوں نے اس کے خاندان کو تکلیف پہنچائی تھی، ایک ایک سے انتقام لیا، اس کی وجہ سے بہت سے بزرگوں، لوگوں اور یتیموں کی مدد معاش اور وظیفے بند ہو گئے، اور جب اس کی وجہ سے فتنہ اٹھ کھڑا ہوا تو وہ یہ رباعی پڑھا کرتا تھا:

آتش بدو دست خویش در خرمن خویش چو خود زدہ ام چہ نالم از دشمن خویش
کس دشمنِ من نیست منم دشمنِ خویش اے وائے من و دست من و دامنِ خویش

بحث کے وقت اگر کوئی مجتہدین کا حوالہ دیتا تو وہ کہتا کہ فلاں حلوائی، فلاں موچی، اور فلاں چمار کی بات میرے لیے حجت نہیں، مشائخ اور علما، کا انکار اس کے لئے سازگار رہا، (منتخب التواریخ جلد دوم ص ۲۰۰ - ۱۹۹) - آگے چل کر ملا صاحب لکھتے ہیں: کہ ان سے ایک بار فتحپور کے دیوان خانہ میں اس سے بحث ہو گئی تو انھوں نے

اس سے پوچھا مشہور مذہبوں میں سے تمھارا میلان کس مذہب کی طرف ہے، تو اس نے جواب دیا کہ ابھی تو وہ چند دن الحاد کی وادی میں سیر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، ملا صاحب نے پھر طنزاً جواب دیا کہ نیک ارادہ ہے بشرطیکہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو، جیسا کہ کہا گیا ہے،

برداشت غل شرع بہ تائید ایزدی   از گردن زمانہ علی ذکرہ السلام

یہ سنکر ابوالفضل ہنس پڑا، ملا صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ وہ اپنی بد اعتقادیوں کی بنا پر حکومت کے صدر، قاضی حکیم الملک اور مخدوم الملک جیسے بڈھوں سے بحثیں کیا کرتا تھا، اور ان کی بے عزتی کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا تھا، اور خود بادشاہ اس کی ان باتوں سے خوش ہوتا، ایک دفعہ علماء نے آصف خاں میر بخشی کے ذریعہ خفیہ طور سے اس کے پاس یہ پیام بھجوایا کہ تم ہم لوگوں کے پیچھے کیوں پڑے رہتے ہو، تو اس نے جواب دیا کہ مجھکو اس حکایت کے مطابق سمجھو کہ میں ایک آدمی کا نوکر ہوں، بیگن کا نوکر نہیں ہوں، اس نے تھوڑی ہی مدت میں اپنی ذہانت، باپ کی معاونت، بادشاہ کی اعانت اور اپنی قسمت کی مساعدت سے ایک ایک کو ذلیل کیا، کوئی مسلمان بھی سوائے حکیم ابوالفتح اور ملا یزدی جو بعض مسائل میں اس سے متفق نہیں تھے، اس کے سامنے فروغ نہ پا سکا (ج ۲ ص ۲۶۲-۲۶۳)

یہ تو ابوالفضل کی سیرت کے متعلق ملا صاحب کا تجزیہ ہے، مگر مآثر الامرا کے مصنف نے ابوالفضل کے حالات میں اس کی سیرت کی برائیوں اور اچھائیوں دونوں پر تبصرہ کیا ہے، اس کی برائیاں جس طرح بیان کی گئی ہیں، ان کے علحدہ علحدہ ٹکڑوں کو ملا کر ہم یہاں پر درج کرتے ہیں:

مآثر الامراء کا مصنف لکھتا ہے: مشہور ہے کہ ایک روز سلطان سلیم (یعنی جہانگیر)

شیخ کے گھر پر آیا، دیکھا کہ چالیس کاتب بیٹھے قرآن اور تفسیر لکھ رہے ہیں، ان سب کو کتا
کے اجزا کے ساتھ بادشاہ کے پاس لے گیا، اور بادشاہ کو شیخ ابوالفضل سے بدظن
کیا کہ ہم کو تو یہ اور چیزوں کی ترغیب دیتے ہیں، لیکن جب خلوت میں ہوتے ہیں تو کچھ
اور ہی کام کرتے ہیں، اس روز سے قرب اور مصاحبت میں فتور واقع ہو گیا (مآثر الامراء ج ۲ ص ۶۱۱)
یہی مصنف یہ بھی تحریر کرتا ہے کہ جنت مکانی یعنی جہانگیر بادشاہ خود لکھتا ہے کہ شیخ
ابوالفضل نے میرے والد کو یہ ذہن نشین کرا دیا تھا کہ جناب ختمی پناہی صلی اللہ علیہ وسلم میں
بڑی فصاحت تھی، قرآن ان ہی کا کلام ہے، اس لیے جب وہ دکن سے آ رہا تھا تو میں نے
نرسنگھ دیو سے کہا کہ اس کو قتل کر دے، اس کے بعد میرے والد اس اعتقاد سے باز
آ گئے (ص ۶۱۰)

تزک جہانگیری کے نولکشور اڈیشن میں تو جہانگیر کا یہ بیان نہیں ہے لیکن تزک جہانگیری
کے اس انگریزی ترجمہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے جو میجر ڈیوڈ پرائس نے کیا تھا (ص ۵۴ - ۵۳)
مآثر الامراء کے مصنف کا یہ بھی بیان ہے کہ شیخ ابوالفضل کی تکفیر خاص و عام دونوں
کی زبان پر ہے، کچھ لوگ اس کو برہمنی طریقہ کا طعنہ دیتے ہیں، اور بعض لوگ اس کو آفتاب
پرست کہتے ہیں، ایک گروہ اس کو دہریہ قرار دیتا ہے، اور جو لوگ تفریط سے کام لیتے
ہیں، اس پر الحاد اور زندقہ کا الزام رکھتے ہیں، اور جو لوگ انصاف کو راہ دیتے ہیں، اس کو
متصوفوں کے مقلدوں کی طرح صلح کل، وسیع المشرب، ہمہ اوست کا دعویدار، شریعت
سے آزاد اور طریقہ اباحت کا پابند قرار دیتے ہیں، عالم آرائے عباسی کے مصنف کا بیان
ہے کہ شیخ ابوالفضل نقطوی تھا...... علم نقطہ سے مراد الحاد، زندقہ، اباحت اور توسیع
مشرب ہے، فلسفیوں کی طرح اس کے ماننے والے دنیا کی قدامت کے قائل ہیں حشر اور قیامت

سے انکار کرتے ہیں، اعمال کے حسن اور دنیا میں عافیت کو جنت، اور اعمال کے قبح اور دنیا میں تکلیفوں کو دوزخ قرار دیتے ہیں۔

مآثر الامرا کے مؤلف نے خود ہی یہ سوال کیا ہے کہ شیخ ابوالفضل میں بڑی ذہانت، دقت نظر اور تحقیق تھی، تو پھر اس نے آخرت کے معاملہ میں دیدہ و دانستہ کیوں نقصان برداشت کر لیا، اس کا جواب بھی وہ خود یہ دیتا ہے کہ اکبر سن شعور کے آغاز ہی سے ہندوستان کے رسوم و رواج کی طرف مائل تھا، وہ راجپوتوں کے تالیف قلب کو ملک کا سب سے اہم معاملہ سمجھتا تھا، اور اسی کے لیے کوشاں رہا، یہانتک کہ ذبیحہ گاؤ کی ممانعت کر دی، داڑھی منڈوانے لگا، کانوں میں مروارید کے بندے پہننے لگا، دسہرہ اور دیوالی کا جشن بھی منانا شروع کر دیا، شیخ ابوالفضل کو بادشاہ کے مزاج میں بڑا دخل تھا، وہ اس کو ان باتوں سے روک سکتا تھا لیکن اپنے حب جاہ کی خاطر ایسا نہ کر سکا، اور ان باتوں کا الزام اس پر بھی آتا ہے (۲۰-۶۱۹)

مآثر الامرا کے مولف نے ابوالفضل پر اس قسم کی تنقید یں کر کے یہ بھی لکھا ہے کہ ذخیرۃ الخوانین میں ہے کہ وہ راتوں کو درویشوں کے گھروں پر جاتا، ان کو اشرفیاں دیتا، اور ان سے التماس کرتا کہ وہ اس کے ایمان کی سلامتی کے لیے دعائیں کریں، اس کی باتوں کا زور اس پر ہوتا کہ آہ اب کیا کرنا چاہیے، وہ رانوں پر ہاتھ مارتا اور آہ سرد کھینچتا، اس کی زبان پر کبھی ناروا بات نہیں آتی، اس کی سرکار میں بدگوئی، غیر حاضری کا جرمانہ، بازیافت اور فروعی یعنی قرقی وغیرہ نہیں ہوتی، جس کسی کو وہ مال مقرر کر دیتا، اگر وہ برا بھی ثابت ہوتا تو حتی المقدور اس کو نہ بدلتا، کہا کرتا کہ لوگ مجھکو بیوقوف سمجھیں گے کہ یہ برا تھا تو اسکی تربیت کیوں نہ کی۔ (ج ۲ ص ۶۲۰)

مآثر الامراء کے مصنف کا یہ بھی بیان ہے کہ جب شیخ ابوالفضل کا انتقال ہوا تو خان اعظم نے اسکی تاریخ وفات یہ کہہ کر نکالی

تیغ اعجاز نبی اللہ سیر باغی برید

لیکن کہتے ہیں کہ شیخ نے خواب میں آکر کہا کہ میری تاریخ وفات بندہ ابوالفضل ہے، (۱۰۱۱) کارخانۂ قدرت میں حیران نہیں ہونا چاہیے، اس کا فضل بہت وسیع ہے، کسی کو نا امید ہونے کی ضرورت نہیں،

مآثر الامراء کے مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ شاہ ابوالمعالی قادری سے جو کہ لاہور کے مشائخ میں سے تھے، روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ میں ابوالفضل کے کاموں کا منکر تھا، مگر میں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ جناب رسالت کی مجلس میں ابوالفضل کو حاضر کیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا جبۂ مبارک شیخ کے منہ پر ڈال دیا اور مجلس میں بٹھایا، اور فرمایا کہ یہ شخص اپنی زندگی میں کچھ روز برے افعال کا مرتکب ہوا لیکن اسکی وہ مناجات اس کی نجات کا سبب بن گئی جس کی ابتدا میں یہ کہا گیا ہے:

الٰہی نیکاں را بوسیلۂ نیکی سرفرازی بخشی

و بداں را بمقتضائے کرم دلنوازی کنی

ابوالفضل نے آئین کے آخر میں اپنے خاندان کے حالات کے علاوہ اپنے کچھ جذبات وخیالات کا بھی اظہار کیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ملحد تو ہرگز نہ تھا بلکہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کا طلب گار رہا، وہ لکھتا ہے کہ آغاز پیدائش سے پروردگار عالم نے اس کو اپنی متواتر نعمتوں سے اپنی پناہ اور حمایت میں لیا۔ اور اس کو امید ہے کہ اس کا آخری نفس اسی کی رضامندی میں صرف ہوگا، اور

اسی کی یہ دولت اس کو نام گاہ جاوید میں جگہ ملے گی، اس کے بعد وہ خدا وند تعالیٰ کی ان چوبیس نعمتوں کا ذکر کرتا ہے، جن سے وہ سرفراز ہوتا رہا ہے، ان میں سے کچھ یہ ہیں:

(۱) اس کو والدین کی رضا جوئی کا روز افزوں شوق رہا (۲) وہ بارگاہ ایزدی کا ہمیشہ نیازمند رہا (۳) وہ ہر مذہب و ملت کے علوم کے راز کو جاننے کی کوشش کرتا رہا، (۴) وہ خدا کے اُن بندوں کے دروازے پر حاضر ہوتا رہا جو گوشہ نشین تھے، اور اپنی پختہ عقل کے معیار میں درست ثابت ہو چکے تھے (۵) وہ اپنی طبیعت کی نیرنگیوں کی وجہ سے نئی نئی باتیں دریافت کر کے متحیر ہوتا رہا (۶) وہ جہاں پناہ یعنی اکبر کی ملازمت کی برکت سے غرور سے پاک رہا (۷) وہ صلح کل تھا، اس لیے ہر گروہ کے نیک افراد سے صلح کرتا رہا برے لوگوں کی معذرت کو بھی قبول کر کے ان کے ساتھ مصالحت کی بنیاد ڈال دی، اسی سلسلے میں یہ دعا کرتا ہے:

"اللہ تعالےٰ از لوح آگہی نقش بدی دور ساز د۔"

اس کا مذہبی عقیدہ جو بھی رہا ہو لیکن وہ ایک بے مثل ادیب کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کیا جاتا رہا ہے، مآثر الامراء کے مصنف نے لکھا ہے کہ وہ اپنی جودت طبع، رسائی فہم علوِ نظرت اور طلاقت لسانی کی وجہ سے یگانۂ دبے همتائے وقت تھا (حصہ دوم ص ۶۰۸) محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ شیخ کی انشاء پردازی اور مطلب نگاری کی تعریف نہیں ہو سکتی، یہ نعمت خدا داد ہے کہ خدا کے ہاں سے اپنے ساتھ لایا تھا، ہر ایک مطلب کو اس خوبی سے ادا کرتا ہے کہ سمجھنے والا دیکھتا رہ جاتا ہے۔ . . . . . یہ قادر الکلام اپنے پاک خیالات اور سادہ الفاظ میں اصلی مطلب کو اس طرح ادا کرتا ہے کہ ہزار رنگینیاں ان پر قربان ہوتی ہیں، اس کی سادگی کے باغ میں رنگ آمیزی کا مصور قلم لگائے تو ہاتھ قلم ہو جائیں، وہ

انشاء پردازی کا خدا ہے، اپنے لطف خیالات سے جیسی مخلوق چاہتا ہے الفاظ کے قالب میں ڈھال دیتا ہے، لطف یہ ہے کہ جس عالم میں لکھتا ہے، نیا ڈھنگ ہے اور جتنا لکھتا جاتا ہے، عبارت کا زور بڑھتا اور چڑھتا چلا جاتا ہے (دربار اکبری ص ۴۹۳)۔ بلاخمن آئین اکبری کی تمہید میں کہتا ہے کہ "عبداللہ شاہ بخارا کہا کرتا تھا کہ وہ اکبر کے تیروں سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا کہ ابوالفضل کے قلم سے ڈرتا ہے"۔

ابوالفضل نے اپنی علمی سرگرمیوں کے سلسلہ میں مہابھارت کے فارسی ترجمہ رزم نامہ کے لیے دو جزو کا حصہ لکھا، انجیل کا فارسی ترجمہ بھی کیا، ملاحسین واعظ نے کلیلہ دمنہ کا جو ترجمہ فارسی میں کیا تھا، اس کو آسان اور سلیس کیا، اور اس کا نام عیار دانش رکھا، ان کے علاوہ انشائے ابوالفضل، کشکول اور جامع اللغات بھی اس کی علمی یادگاریں ہیں لیکن اسکی زیادہ شہرت اس کے اکبرنامہ اور آئین اکبری کی وجہ سے ہوئی، ان دونوں کتابوں کے لکھتے وقت وہ بڑا مبالغہ پرداز مصنف نظر آتا ہے، لیکن اس کی مبالغہ پردازی، مداحی، خوشامد پرستی اور چاپلوسی پر چاہے کتنے ہی اعتراضات کیے جائیں، اس کی انشا پردازی کی سحر نگاری اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے، مآثر الامراء کے مصنف کا بیان ہے کہ لوگوں کا خیال تھا کہ ابوالفضل نے اکبرنامہ میں خمسۂ نظامی کی نثر کر دی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اکبرنامہ اور آئین اکبری میں انشاء پردازی کی گلکاریاں اور جلوہ سامانیاں کن کن طریقوں سے دکھائی دیتی ہیں، اسکے مصنف نے اکبر کی ذات کو اپنے لیے شمع بنا رکھا تھا، اور اس کے گرد پروانہ کی طرح رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے، اسکی مدح میں اسکا قلم چلتا ہو تو کسی طرح رو کے نہیں رکتا ہے، فوج در فوج الفاظ کے سہارے اپنی انشاپردازی میں قوت بھی پیدا کرتا ہے، اور اپنے شاہی آقا کی تعریف کر کے ذہنی سکون اور روحانی لذت

محسوس کرتا ہے، اکبرنامہ جلد سوم کے آغاز میں اس کی قصیدہ خوانی اس طرح کرتا ہے:

دیدۂ باریک بینش اصطرلاب آفتاب ذات و دل حق گزینش، رصدخانۂ سماوات صفات، نژاد بزرگ روے خوش، خوے نیک، پیشانی کشادہ، قامت معتدل فطرت عالی، ہمت والا، نیت صافی، توکل بر دوام، دانش برکمال، گرد آمدن گوناگوں ہنر، حوصلۂ فراخ، آزرم سترگ، شجاعت شگرف، راے درست، تدبیر گزین بخشش بے محابا، بخشایش بیکراں، افزایش عاطفت، صلح کل، انبوہی ملک، فراوانی ارباب اخلاص بسیاے مبارزان یک جہت، فزونی مال، فراہم شدن نفائس عالم، صفائی ضمیر، پاکی از آلایش تعلق، پیشواے جہان معنی، آگہی دانی چگونہ دریک جاے فراہم آید، وچسان یک تن بر دوش ہمت بردارد،

سپہر دانش و بینش یگانہ اکبرشاہ کہ ہم چو صبح بروے جہاں کشادہ جبیں
شہے کہ دیدہ نہ آموزگار دل تعلیم شہے کہ یافتہ از مرشد خرد تلقین

اور نثر کی عبارت میں جو رنگینی اور شگفتگی ہے، وہ بڑے بڑے شعرا نظم میں بھی نہیں پیدا کر سکتے، اس نثر میں حسین اشعار کا لطف آتا ہے، پڑھتے وقت لکھنے والے کے نہ صرف زور بیان اور قدرت الفاظ کا سکہ جمتا ہے، بلکہ اس نثر میں کسی مثنوی کے اشعار کے پڑھنے کی لذت محسوس ہوتی ہے۔

ابوالفضل غایت احترام میں اپنی کتاب اکبرنامہ کو اکبرنامہ نہیں لکھتا ہے، کیونکہ اس کے خیال میں اکبر کا نام لکھنے میں بھی سوء احترام کا احتمال پیدا ہوتا تھا، اس لیے اپنی کتاب کو کبھی تو اقبال نامہ، کبھی نگارین نامہ اور کبھی شگرف نامہ کے نام سے یاد کرتا ہے، پھر پوری کتاب میں کہیں اکبر کا نام نہیں آیا ہے، اس کے لیے طرح طرح کے القاب استعمال

کرتا ہے۔ ان القاب کے ڈھونڈنے میں اس کا ذہن خوب کام کرتا ہے جن میں سے کچھ یہ ہیں:
شہریار جہانگیر، آئین عظمت و جلالت، شہریار آگاہ دل، شہریار جہاں آرا، شہریار دانش پژوہ،
شہریار معدلت دوست، شہریار دادگر، خدیو خدا پرست، حق سگال، گیہاں خدیو دادگر،
خدیو دانش پژوہ، گیتی خدیو، خدیو عالم، خدیو جہاں آرا، ہمت والائے شاہنشاہی، جہاں کشائے
شاہنشاہی گیتی کشائی، جہانگیر کشورکشائی، زینت بخش اورنگ سلطنت، فرہنگ آرائے بزم
آفرینش گیتی آرائے حکمت پژوہ، فرہنگ افزائے ملکوتیان قدس وغیرہ۔
اکبر جب کہیں اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ ڈالتا تو ابوالفضل اسکو اس طرح ادا کرتا:
"مخیم سرادقات اقبال گشت"۔ "مخیم سرادقات عظمت شد"۔ "مخیم ہمایوں شد"
"ضرب خیام عز و جلال شد"۔ "گیہاں خدیو داد دہاں دنوازش کناں با ہزاراں
شکوہ صوری و معنوی بر کنار دریائے سند نزول اجلال فرمود"۔ "شعشعۂ رایات ہمایوں
درحوالی پالسنوالہ پرتو شکوہ انداخت"۔
اور جب اکبر دار السلطنت کی طرف واپس ہوتا تو اسکے ادا کرنے کیلیے یہ طریقہ استعمال کرتا ہے:
"ہم عنانی دولت روز افزوں متوجہ دار الخلافہ شدند"۔ "رایات نصرت شعاع
درمستقر سلطنت نہضت فرماید"۔
اور جب سفر میں لوگوں کی باریابی ہوتی تو اس کو اس طرح ادا کرتا:
"طبقات انام از اشراف تا محترفہ جوق در جوق اعتماد بر معدلت و رافت شاہنشاہی
نمودہ بدولت زمین بوس سعادت پذیر گشتہ"۔
یا جب دو چار افراد باریاب ہوتے تو اس کے بارے میں لکھتا ہے:
"بسجدۂ نیایش ناصیۂ بخت وری برافروختند"۔

اکبر فتح و تسخیر کے سلسلہ میں لشکرکشی کرتا تو اس کی انشاپردازانہ تاویل اس طرح کرتا:

"وچوں در دین سلطنت وآئین جہانداری قناعت در ملک ستانی و حرص تجرد گزینیاں نکوہیدۂ عقل و ناپسندیدۂ خرد پژوہان است۔ تسخیر قلعہ رنتا س پیش نہاد ہمت والا شد۔" (جلد سوم ص ۱۰۴)

"دولت افزائی را سرمایۂ ایزدی نیایش انگاشتہ خداوندی را ہم آغوش پرستاری دارد۔" (جلد سوم ص ۵۱۱)

اکبر کا سب سے کمزور پہلو اسلام سے منحرف ہو کر دین الٰہی کا بانی ہو جانا تھا لیکن اکبر نامہ میں کہیں "دین الٰہی" کا نام نہیں آنے پایا ہے۔ اس انحراف کی تاویل ابوالفضل کی انشاپردازی کے کمالات کی ایک بڑی دلیل ہے۔ وہ اکبر نامہ میں عبادت خانہ کے مباحث کی بڑی اچھی تصویر کھینچتا ہے، پھر جب اکبر اعلان کرتا ہے کہ کلمہ پڑھنا، ختنہ کرانا، سجدہ کرنا جیسے ظواہر مذہب کے لیے ضروری نہیں، مذہب وہی اچھا ہے جو عقل تسلیم کرے۔ اور عقل کو قائل کرنے کے لیے دلیل چاہیے۔ سچائی کسی کی پیشانی پر لکھی ہوئی نہیں رہتی ہے، تو اس کو ابوالفضل اپنے انشاپردازانہ انداز میں اس طرح پیش کرتا ہے۔ (جلد سوم ص ۲۵۵)

"ہموارہ دراں شبہائے روز آسا جلائل نکات و سخنان دل آویز بر زبان گوہر آمود گذارش یافتے۔ از انجملہ بر لوحۂ بیان نگارش فرمودند کہ بیشتر از ہم زبانی ظاہر آرایان خراب دروں چناں بخاطر می رسید کہ صورت آرائی و حرف مسلمانی بے پذیرائی چیزے فائدہ بخشد، بدیں جہت بسیارے گرویدگان کیش برہمن را بہیم افزائی و زور آوری رہ گرائے دین بزرگان خود گردانیدیم امروز کہ بر توحقیقت شہرستان باطن را فراگرفتہ، چناں فروغ آگہی می تابد کہ دریں آشوب گاہ اختلاف کہ تیرگی بند از

وتاریکی خودبینی تو بر تو فراہم آمدہ) بے مشعل دلیل قدمے نتواں رفت و آں روشن سود مند آید کہ بصواب دید خود برگیرند از نہیب سلطانی کلمۂ شہادت بر زبان راندن و پوست پارہ جدا کردن و سر استخوانی بر زمین ماندن خدا پژوہی نبود۔"

طاعت آں نیست کہ بر خاک نہی پیشانی
صدق پیش آر کہ اخلاص بہ پیشانی نیست

وہ دین الٰہی کے حامیوں کے عقیدہ و مسلک کی کوئی تفصیل نہیں بتاتا ہے، بلکہ آئین اکبری میں دین الٰہی کے لیے رہنمونی کا لفظ استعمال کرتا ہے، اور اس کی وکالت اس طرح کرتا ہے کہ جب پروردگار عالم چاہتا ہے کہ انسان کا جوہر ظاہر ہو اور اہل علم نظر کی کشادگی کے ساتھ ہمت کی پستی سے بھی آشنا ہوں تو انسانی نگاہ دورنگی کے غبار سے آلودہ ہو جاتی ہے، اور ہر شخص ایک نیا دین اپنے لیے منتخب کرلیتا ہے، جس کے بعد بداندیشی اور کوتاہ نظری نمایاں ہو جاتی ہے، اور قدر شناسی اور ہنراندوزی ختم ہو جاتی ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ دین کیا اور دنیا کیا، ایک ہی دل آویز حسن ہے، جس میں ہزار پردوں کے باوجود ایک خاص قسم کی تابش ہے، اب اس کو ابوالفضل اپنے قلم سے اس طرح ادا کرتا ہے۔

ایزد خرد بخش جہاں آرا چوں خواہد گوہر مردم زاد بظہور آید و پایہ فراخی و تنگی حوصلہ برہمگناں پیدائی گیرد، غبار دورنگی برانگیزد و دین و دنیا برطرازد، ہر نشاء دارکار کیائی جداجدا پدید آید و در نکوہش یک دیگر آویزش رود، ناتواں بینی و بے دانشی عیار گرفتہ قدردانی و ہنراندوزی گراں ارز گردد و گرنہ کدام دین و چہ دنیا، یک حسن دل آویز در ہزار پردہ جمالش می دہد، گلیمے پیشانہ گستردہ اند و گوناگوں رنگ چہرہ می افروزد

درحقیقت نسب عاشق و معشوق یکے است
بوالفضولاں صنم و برہمنے ساختہ اند

یک چراغست دریں خانہ و از پرتو آں ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

اور پھر وہ یہ بتاتا ہے کہ وجود کی ایک وسیع چادر پھیلی ہوئی ہے جس پر طرح طرح کے
نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ کوئی نفس کی توہین میں لگا ہوا ہے، اور کوئی اہل عالم کی نگہبانی
میں مشغول ہے۔ لیکن جب انسان پر یک رنگی نمودار ہوتی ہے تو وہ پردۂ تقلید کے تار و پود
کو بکھیر دیتا ہے۔ لیکن ہر گھر میں اس دانائی کی مشعل روشن نہیں ہو سکتی، دردآشنا قلب ہی
میں یہ روشنی دکھائی دیتی ہے، اور جب بنی نوع انسان کی قسمت کی بلندی کا وقت
آتا ہے، تو مشیت الٰہی فرمانروائے وقت اسرار یکرنگی سے آشنا کرتا ہے۔ اس کے
قلب میں نور آگاہی کی شمع روشن ہوتی ہے، اور اس کے صحیفۂ دل سے دوئی کے نقوش
مٹ جاتے ہیں، اور پھر وہ کثرت میں وحدت کا جلوہ دیکھتا ہے، اس کے بعد اکبر کو اس
مذہب کے بانی کی حیثیت سے اس طرح پیش کرتا ہے

سواد خوانان ناصیۂ روزگار از سر آغاز ایں والا گوہر شناسا می شدند و
بارانہ داران زمزمۂ شادمانی داشتند و شہریار دوربین روزگارے بآئین
بیگانگاں پردہ آراستی و خود را آشنائے ایں کار نساختی لیکن بر انچہ خدا
خواہد گرانبرد کراز اں برکنارہ شود بخستین حال انچہ عادتیان روزگار اند و
بشگفت زار درشوند تا خواستہ بر تراز دیدی چند انکہ بے خواہش دل افزائش گرفت
و بر فراز پیدائی بر آمد تا گزیر رہنمونی را رضامندی ایزد برشمردہ در ہدایت نشود
و تشنہ دلاں تفسیدۂ دشت جویائی راسیراب گردانید (آئین اکبری جلد اول ص ۱۰۹)

وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ بادشاہ کے دل میں حقائق و معارف کا ظہور ہونے لگا، ان
میں ہدایت و رہنمائی کی لہریں اٹھنے لگیں، اور انھوں نے مجبور ہو کر پیشوائی اختیار کی،

کیونکہ یہی مرضی الٰہی تھی، اور پھر وہ یہ لکھتا ہے کہ فقیر، سنیاسی، جوگی، قلندر، حکیم، صوفی سب ہی ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے لگے، لوگ ان سے سعادت دارین، صحت، تندرستی، بینائی چشم، تمنائے اولاد، درازی عمر، وسعت ترقی وغیرہ کی دعائیں کراتے تھے۔ اسی سلسلہ میں اکبر کے ایک دو معجزہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے، لیکن اس کے ذکر کرنے کا انداز کچھ ایسا ہے کہ اس پیمبرانہ شان میں اکبر کی ذات مضحک نہیں بننے پاتی، بلکہ اس کا شاہانہ وقار قائم رہتا ہے، وہ اس مذہب کے عقائد کے بارے میں صرف اتنا لکھتا ہے کہ جب کوئی اس حلقۂ ارادت میں داخل ہوتا ہے تو وہ اپنے ارادت مند کو زنار یا انگشتری دیتے ہیں جس پر اسم اعظم و نقش اللہ اکبر کندہ ہوتا ہے۔ اس ارادت کے وقت ارادت مند کو اس نے اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ زبان حال سے یہ کہتا ہے کہ میں نے اپنے طالع کی یاوری اور ستارۂ اقبال کے عروج سے خود غرضی اور ریاکاری سے جو تمام برائیوں کی جڑ ہے، کنارہ کشی کی،

زبان حال چناں سراید کہ بیاوری بخت بیدار و رہنمونی ستارۂ خود آرائی و خویشتن گزینی کہ بنگاہ گزناگوں گزند بود از سر افگندہ روے دل بعنایش گری آورد۔ (آئین اکبری ج ۳ ص ۱۱)

لفظ زبان حال سے ظاہر ہے کہ ان الفاظ کا دہرانا ضروری تھا،

ابوالفضل کا بیان ہے کہ ارادت مندوں کا دستور تھا کہ ایک اللہ اکبر کہتا تو دوسرا اس کے جواب میں جل جلالہ کہتا، اس کی تاویل میں ابوالفضل لکھتا ہے کہ اس کا صرف مقصد یہ تھا کہ بنی نوع انسان سرچشمۂ ہستی کو فراموش نہ کریں، اور ہر وقت ذکر الٰہی سے سیراب دل، تر زبان اور شیریں زبان رہیں،

ہنگام دیدار ہم آنکہ یکے اللہ اکبر گوید و دیگرے جل جلالہ سراید ہمگی قدس بسیج

آئست از سرچشمۂ ہستی فراموشی میارند و بیاد ذکر الٰہی سیراب دل، و ترزبان
و شیریں کام باشند (ایضاً ص ۱۱۰)

اس مذہب کے جو عقائد ابوالفضل نے بتائے ہیں، وہ صرف یہ ہیں:-

(۱) مرنے کے بعد خیر و خیرات کرنے کے بجائے زندگی ہی میں کیجائے، تاکہ سفر آخرت کا پورا سامان ہو (۲) اس طرح سالگرہ کے موقع پر دعوت کیجائے، طرح طرح کے کھانے ہوں، تاکہ اس طرح جود و سخا کے ساتھ آیندہ سفر کا زاد راہ بھی تیار ہوتا رہے (۳) گوشت خواری سے حتی الامکان پرہیز ہو (۴) اس مذہب کے پیرو قصاب، ماہی گیر اور چڑیماروں وغیرہ کے ساتھ کھانا نہ کھائیں (۵) اور وہ حاملہ عورتوں بوڑھوں عقیموں اور نابالغ لڑکوں سے میل جول نہ رکھیں، ان کو وہ آئین ارادت گزینان کے تحت اس طرح ادا کرتا ہے:

دنیز بفرمائش آن پیشوائے آگاہ دلان ہشیار خرام استی کہ مردم پس از فروشدن بکار بجز ند در زندگی سرانجام دہند و توشۂ واپسیں سفر پیش رواں شود، ہر سال روز ولادت انجمنے برسازند و خوان گوناگون نعمت برکشند، دست نوال برکشایند و زاد راہ دراز آمادہ گردد، نیز بآئین مقدس در ناخوردن گوشت ہمت گمارند و برغے در ہماں ہنگام کہ تنگنان را باردارند دست بد و نیالانید لیکن در ماہ ولادت خود نزد آں نشوند، و نیز پیرامون کشتہ خود نگردند و بگزرد آں نشتابند و با قصاب و ماہی شکار، و کنجشک گیر ہم کاسے نکنند و با آبستن و کہن سال و نارہی و نارس ننہ پیوندند (جلد اول ص ۱۱۰)

ابوالفضل کی تحریر کے ایجاز کی یہ بڑی اچھی مثال ہے، معلوم نہیں اکبر اس ایجاز سے

مطمئن تھا کہ نہیں یا شاید اپنے علم کی بے بضاعتی کی وجہ سے اس عبارت کو پوری طرح سمجھ نہ سکا ہو، اس دیباچے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابوالفضل بطیب خاطر اس مذہب کا قائل نہ تھا۔ اس لیے اس کی تفصیل لکھنے میں اس کے قلم میں وہ روانی اور توانائی نہ پیدا ہو سکی جو اس کی امتیازی خصوصیت ہے، وہ رموز حقیقت زبان گو مگو میں بھی بیان کرنے میں ماہر تھا،

(جلد دوم ص ۳۸۰)

اس کا قلم اکبر کے رزم اور بزم دونوں کی نقش آرائی میں طاؤس کی طرح رقص کرنے لگتا ہے، اکبر کے دور حکومت میں بکثرت لڑائیاں ہوتی رہیں، ابوالفضل ہر لڑائی کی تصویر کشی میں جدا جدا رنگ اختیار کرتا ہے، وہ شاہی لشکر کے فوجیوں کے لیے مردان کارزار، کند آوران ہمت گزیں، دلیران کار طلب، گروہ پردلان، اخلاص مندان کار طلب، سپاہ نیک فرجام، دلیران ناموس دوست، یلان گرم کیں، سپاہ چیرہ دست، مجاہدان نصرت طراز، ہوا خواہان جاوید دولت، فیروزی سپاہ وغیرہ، اور شاہی لشکر کے دشمنوں کیلئے غنیم غدا ستیز، بدگوہران نافرجام، ناسپاسان بدگوہر، بیم تا کان گریز پا تباہ ایشان برزہ درا، سرتابان باطل ستیز، سرگردان بادیہ ادبار وغیرہ طرح طرح کے الفاظ اور فقرے استعمال کرنے میں اپنی قدرت زبان کا ثبوت دیتا ہے، ایک جنگ کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے　(ج ۲ ص ۲۲۳)

بعضے در مساکن و منازل خود بر سر جبل نہادہ ترصد ہلاک می بردند و جمعے شمشیرہائے برہنہ علم کردہ و نیزہائے کوتاہ گرفتہ بہ غازیان نصرت پیوندی می آوردند و این بہادران غزا پیشہ بناوک دلدوز و تیغ معرکہ سوز و سنان صف شگاف کار آں سیہ بختان را تمام می ساختند و جمعے کہ بتکدہا و خانہا قدم جہل را پائے ثبات دادہ بودند غازیان اقبال مند را دیدہ بہ پائے تہور بیرون می دویدند و بہ بہادران نامسیدہ بہ صدمات قہر

بخاک وخون برابر می شدند

چنیں رزمہا در جہاں کس ندید ۔۔۔ نہ از کاردانانِ گیتی شنید
چہ گویم ازاں جنگ آں کارزار ۔۔۔ کہ یک شمہ نتوانم از صد ہزار

ایک اور لڑائی کا ذکر کرتا ہے :

بہادران عساکر اقبال راہ کارزار کشادہ یافتہ پیش دویدند، دراجپوتان ستیزہ خوی دست از جان شستہ گرم قتال گشتند، مصادمۂ عظیم ومقاتلۂ قوی افتاد وتمام آں روز بازار جنگ گرم بود واز دو جانب دلاوران داد شجاعت می دادند، مجاہدانِ غازی جرعۂ شہادت کشیدہ حیات ابدیافتند وجمعے کثیر از ارباب خلاف خونابہ حماچشیدہ مست جام فنا گشتند (ج ۲ ص ۱۶۱)

جب لڑائی کا ہنگامہ شروع ہوتا اور لشکری کٹ مرتے تو اس کو وہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے : (ص ۴۲۵ ج ۳)

چند جا ہنگامۂ آویزش گرمی گرفت سرافشانی وجاں ستائی آرایش یافت

بسر آمد زقلب دو لشکر خروش ۔۔۔ رسید آسماں را قیامت بگوش
زمیں گفتی از یکدیگر بردرید ۔۔۔ سرافیل صور قیامت دمید

اور جب کوئی فوجی سردار ہلاک ہوجاتا تو اس کا ذکر اس طرح کرتا ہے :۔

سید ہاشم بارہہ حال بسبجی ہشہ جاوید نیک نامی اندوخت (ج ۳ ص ۲۵۴)

وہ جب بزم آرائی پر آتا ہے تو بہار کی تصویر کشی اس طرح کرتا ہے :۔ (ج ۳ ص ۳۲)

دریں ہنگام سعادت پیرائے اشعۂ رایات سلطان بہار منتقل گرمرات طبائع شدہ چمن را بر مسند سوری دیرنیاں بمن آئین بستند شمال وصباخس وخاشاک از گلستان

روزگار دُرفشند، اعتدال ہوا چون عدالت شہنشاہی نیرنگ ساز بدائع نگار آمد و تازگیہائے و نادرہ کاریہا سے نو شگفت افزائے جہانیان شد۔

خواست بہ یدن چمن از جا بکی	خواست چکیدن سمن از نازکی
باد نویسندہ بدست امید	قصۂ گل بر ورق مشک بید
قافلہ یاسمن و گل بہم	قافیہ گو قمری و بلبل بہم
گہ بسلام چمن آمد بہار	گہ بستا بش بہ گل رفت خار
محضر منشور نو بیان باغ	فتویٰ بلبل شدہ بر خون زاغ

ابوالفضل کو اسماء کے ساتھ صفات اور اسماے فاعل لکھنے کا خاص ملکہ تھا، اسکی پوری کتاب میں ایسی مثالیں بھری ہوئی ہیں، مثلاً اورنگ نشینان فرہنگ آرا، بدگوہران ناہنجار، کاخہاے دلنشیں، بستان سراہاے نظر فریب، آبشارہاے سامعہ افروز، پرستش کدہاے شگرف، تیرہ دلان کج گرا، فرزندعفت گزیں، خامۂ عنبریں، کلک گوہریں فیروزی شگرف نشاط افزا، دیدہ وران ژرف نگاہ، جویندگان گم کردہ راہ وغیرہ۔

بعض اوقات قافیہ پیمائی سے عبارت کو رنگین بنا دیتا ہے، مثلاً استشمام گلدستہ بہارستان یکدلی ویگانگی، استطلاع نگارستان دوربینی و فرزانگی، خدیو بزرگ کشور داد گستری، فروزندہ چراغ خانی، فرازندہ چتر کیانی، نفائس حقائق الہٰی و شرائف دقائق آگاہی، خلاصۂ زندگانی و زبدۂ کامرانی صحبت اشباح انسانی و موانست اجسام روحانی وغیرہ،

آئین اکبری میں امور انتظام سلطنت کی ساری تفصیلات موجود ہیں، اس میں شاہی حرم، شکوہ سلطنت، نگیں شاہنشاہی، فراش خانہ، آبدار خانہ، باورچی خانہ، دارالضرب، لشکر، لشکرگاہ، قورخانہ، توپ، بندوق، ہاتھی، گھوڑے، خچر، اونٹ، اصطبل، منصبداری نظام،

کشک، صوبے، حدودِ صوبے، ان کی تاریخ، وہاں کی آمدنی، پیداوار، میوے، نشیب و جنگل، دریا، ندی، نہر، آراضی وغیرہ کے ساتھ معاصر علما، شعرا، ہندوستان کے صوفیائے کرام، اور ہندوؤں کے مذاہب اور عقائد وغیرہ سے متعلق بیش بہا معلومات ہیں، ان تمام خشک چیزوں کے لکھنے میں ابوالفضل کے قلم کی رعنائی اور توانائی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ہے، بلکہ اکبر نامہ اس کے اطناب کا شاہکار ہے، تو یہ کتاب اس کے ایجاز کا اعجاز ہے، وہ ایوان سلطنت کی رونق کو نورِ الٰہی قرار دیتا ہے، جو خداوند تعالیٰ کی طرف سے اس کی رائے کے مطابق بادشاہوں کو عطا ہوتی ہے، اسی لیے بادشاہ شان و شوکت کو تنویرِ الٰہی کا مظاہرہ سمجھ کر انکے دلدادہ ہوتے ہیں، وہ گویا بادشاہ کو ظلِ الٰہی قرار دیتا ہے، اس نازک بحث کو اس اختصار کے ساتھ اس طرح قلم بند کرجاتا ہے،

شمۂ چہار طاق فرمانروائی فرۂ ایزدیست کہ بے میانجی کوششہاے امکانی دست نہادِ ایزدی قدرتست اورنگ نشینان فرہنگ افزا بصورت آرائی دل بر بند و آں را چہرہ کشاے ایزدی فروغ پندارند (آئین اکبری ج ۱ ص ۲۹)

اکبر دینِ الٰہی قائم کرنے کے بعد چراغ کی بھی پرستش کرنے لگا تھا، ابوالفضل نے اس کی انشاپردازانہ توجیہ اس طرح کی ہے کہ جہاں پناہ اپنی روشن ضمیری سے روشنی کو بیحد عزیز رکھتے ہیں، اس کی تنظیم کو خدا پرستی اور ستایش سمجھتے ہیں لیکن نادان اس کو آذر پرستی سمجھتے ہیں۔

گیہان افروز روشن دل نور دوستی را ایزدپرستی شمارد و ستایش الٰہی اندیشد نادان تیرہ خاطر دادار فراستی و آذرپرستی خیال کند۔ (ج اول ص ۴۸)

روزانہ آفتاب غروب ہونے کے بعد چراغ روشن کیا جاتا تو اکبر کی موجودگی میں

بھی بجایا جاتا۔ اس طرح اس کی پرستش کرکے اکبر کی دولت اور نور معرفت کے لیے دعائیں مانگی جاتیں۔ ابوالفضل اس عبادت کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

در دوازدہ لگن ہاے زرین وسیمین کافوری شمعہا افروختہ در پیشگاہ حضور آورند ویکے از سرایندگان شیوا زبان شمع در دست ایزدی سپاس می گزارد وگوناگوں نمط سرایدو سپس دعاے دولت روز افزوں برخواند واتمام سخن بدان کند گیتی خدیو نیایش ونیاز را پایہ برتر نہد وتازہ فروغے دریوزہ کند۔ (آئین اکبری ج ۱ ص ۲۹)

ہندوؤں کے تسخیر قلوب کی خاطر اکبر گائے کی طرف بھی مائل ہوگیا تھا۔ ابوالفضل بھی گائے کو دایۂ روزگار قرار دیتا ہے۔ اور جب اکبر کے حکم سے دیوالی کے روز گائیں آراستہ پیراستہ ہوکر اس کے سامنے پیش کیجاتیں تو ابوالفضل اس کو اس طرح بیان کرتا ہے:

بفرمایش شہنشاہی لختے آراستہ بنظر ہمایوں درآورند وعید دلہا شود (آئین اکبری ج ۱ ص ۱۱۲)

اسی ایجاز کے ساتھ وہ اکبر کے عقیدۂ تناسخ اور آفتاب کی پرستش وغیرہ کا بھی ذکر کر جاتا ہے جس میں اس کی شاہانہ سطوت وعظمت کو برابر قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

وہ آئین اکبری میں اسی اختصار کے ساتھ ہر چیز کو بیان کرتا ہے، پھولوں کی خصوصیات بھی چند سطروں میں ذکر کرکے ماہر نباتات کے لیے قیمتی معلومات فراہم کر دیتا ہے، مثلاً کیسو کے متعلق یہ کہنا چاہتا ہے کہ اس میں پانچ پنکھڑیاں ہوتی ہیں، ہر پنکھڑی شیر کے ناخن کے مانند ہوتی ہے، اس کے بیچ میں زرد ریشہ دار تولیدی شاخچہ ہوتا ہے، جس کی شکل زبان کی سی ہوتی ہے، اس کا درخت بہت بڑا ہوتا ہے، اور اس قدر پھولتا ہے کہ تمام عالم کو آتشیں روشنی سے روشن کر دیتا ہے۔ تو اس کو چند فقروں میں ادا کر جاتا ہے

کیسو پنج برگے ہر یک بناخن شیر ماند، زبانۂ زردی درمیان، درخت او بس بزرگ باشد

وصحرا صحرا بشگفد وجہاں را جامۂ آتش درگیرد (ج اول ص ۴۴)

اسی ایجاز کے ساتھ وہ ہندوؤں کے مذہبی فلسفیانہ خیالات مثلاً پیشلیک، میانسا، بیدانت، سانکھ، پاتنجل، کرم بپاک وغیرہ کو بیان کرگیا ہے جس کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ البیرونی کے بعد اسی نے مسلمانوں کو ہندوؤں کے مذہبی عقائد، مراسم اور تہواروں کو زیادہ سے زیادہ روشناس کیا، اور ہندوستانی موسیقی کو جس طرح اس نے اپنی اس کتاب میں پیش کیا ہے، وہ بھی اس کی انشاپردازی کی ایک اعلیٰ مثال ہے،

اس کو نئی نئی اصطلاحات بنانے میں خاص ملکہ تھا، مثلاً تفریحی کھیلوں کو وہ نشاط بازی، کبوتر بازی کو عشق بازی کہتا ہے، حکومت کے امراء کے لیے بزرگان جاوید دولت، دربار کے علماء و فضلاء کے لیے دانش اندوزان جاوید دولت، شاہی اطبا کے لیے پزشکان، شعراء کے لیے قافیہ سنجان، ارباب نغمہ کے لیے خنیا گران کی اصطلاحات استعمال کرتا ہے،

ابوالفضل کے انشاء میں سبک ہندی کو نیچی نظر سے دیکھنے والے بہت سے نقائص نکال سکتے ہیں، لیکن یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ اس کی انشاءپردازی کی چڑھی ہوئی کمان کو زہ کرنے والا شاید ہی کوئی پیدا ہوسکا، اور اسی انشاءپردازی کی بدولت اس نے اکبر کو وہ مقام عطا کردیا، جو اس کے معاصر حکمرانوں میں کسی کو حاصل نہ ہوسکا، اس کی مغلق، مکلف اور مزین عبارت آرائی کو بعض لوگ پسند نہ کریں گے، لیکن اس کے بعد بہت سے انشاپردازوں اور مورخوں نے اسکی نقل کرنے کی کوشش کی، مگر کوئی اس کی اصل کو نہ پہنچ سکا، اور اس کے طرز بیان کو بھاری پتھر سمجھ کر، صرف چوم کر چھوڑ دیا، وہ خود لکھتا ہے کہ اس کی زندگی ہی میں اس کی کتاب کی ستائش بھی ہوئی، نکوہش بھی،

اس پر آفریں بھی ہوئی اور نفریں بھی، جو تقلید کے پرستار تھے، بلکہ چشم بینا رکھتے تھے،
جو سخن دلپذیر کو پسند کرتے اور دل سخن پذیر رکھتے، انھوں نے تو اس کی تعریف کی،
جس سے وہ خوشی میں سرشار رہا، مگر شورش پسندوں اور حاسدوں نے طنز بھی کیا،

من خاک رہ گہر شناساں کامروز بر غم ناسپاساں
ایں گنج گہر چو برکشا دند انصاف گزیں نظر کشا دند

اس کے بعد ایک دیدہ ور خیر اندیش دوست نے اس سے کہا کہ اس کتاب کے
لکھنے میں اتنی زحمت کیوں کی، اور ایسا طرز انشا کیوں اختیار کیا جس کو ہزاروں
میں سے صرف ایک ہی صحیح طور سے پڑھ سکے گا، کون اس کتاب کی حقیقت شناسی کرسکے گا
کون اس کی بلند پائگی کی داد دے سکے گا، اس لیے بہتر ہے کہ اس نئے طرز کی بساط کو الٹ کر
زمانہ کی زبان میں لکھو تاکہ عوام بھی اس سے فائدہ اٹھائیں، ابوالفضل نے اس کا جو جواب
دیا اس کا خلاصہ یہ تھا، کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے، وہ عوام کے لیے نہیں ہے، اس کی تحریر
ایک آسمانی ارمغان ہے جو صرف خواص کے لیے ہے،

غلیو از مرا باکبوتر چہ کار
بہ باز ملک درخوراست ایں شکار

ہندستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں

یعنی

ہندستان کے مسلمان حکمرانوں کے دور کے مدارس ومکاتب ونظام تعلیم ونصاب درس کی تاریخ،

مؤلفہ

مولانا ابوالحسنات ندوی، سابق رفیق دارالمصنفین۔ جدید اڈیشن، قیمت بہ عہ ۸ پیسے

منیجر

گلزارِ وحدت

از

شاہ تراب چشتی

از جناب ڈاکٹر نور السعید اختر صاحب. ایم اے، پی، ایچ. ڈی بمبئی

قدیم اردو کی ابتدا، صوفیائے کرام اور مشائخِ عظام کے ہاتھوں ہوئی، اسی لیے اردو کا ابتدائی ادب تصوف کی گلکاریوں سے مزین ہے، دکن میں ان بزرگوں نے نہ صرف اسلام کی توسیع و تبلیغ کے لیے ایک عام فہم زبان کی داغ بیل ڈالی بلکہ غیر مذاہب کی معتبر کتابوں کا بھی بغور مطالعہ کیا اور ان کی اچھی باتوں اور ان کے فلسفہ و عقائد کو نظم و نثر کے سانچوں میں ڈھال کر ایک نئے انداز فکر کی بنیاد ڈالی ،

اس تحریک کے اولین بانیوں میں شاہ علی جیو گام دھنی (متوفی ۹۷۳ھ/۱۵۶۵ء) قرار دیے جاسکتے ہیں ، انھوں نے ہندی اور اسلامی مصطلحات کو پہلی بار اپنے دیوان "جواہر اسرار اللہ" میں جگہ دی اور "رام و رحیم" کے تصور کو یگانگت کا جامہ پہنایا ، ان کے بعد "سکھ انجن" کے شاعر سید میران شاہ ابوالحسن قادری اور مثنوی "من لگن" کے مصنف بحری کے یہاں ان ہی خیالات کی بازگشت سنائی دیتی ہے ، ان بزرگوں نے قدیم اردو کے ادبی اور مذہبی ورثے کو ایک نئی آب و تاب بخشی ۔

شاہ تراب چشتی بھی اٹھارہویں صدی عیسوی کے اسی دائرۂ فکر کے بزرگوں میں سے ہیں، جنھوں نے ہندی اور اسلامی تصوف کو زیادہ واضح شکل میں پیش کیا ہے۔ اسلامی تصوف کے انوار جو نویں صدی ہجری سے قبل ہی دکن کو اجالوں کا دیس بنائے ہوئے تھے، شاہ تراب اور ان کے پیش رووں کی کوششوں سے اور بھی منور ہو گئے۔

حالات | شاہ تراب کے ذکر سے تمام تذکرے خالی ہیں، البتہ ان کی تصانیف کی داخلی شہادتوں کی مدد سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام تراب علی اور تخلص "تراب" "ترابا"، ترابی، اور بوتراب تھا، وہ ترنامل (مدراس) کے رہنے والے تھے، اپنے صوفیانہ مقام کے باعث شاہ تراب کے نام سے زیادہ مشہور ہوئے، ان کے والد ماجد عبداللطیف خاں بھی نیک دل اور صوفی منش تھے، شاہ تراب نے اپنے والد کے متعلق مثنوی "آئینۂ کثرت" میں مندرجۂ ذیل رائے کا اظہار کیا ہے:

نصیری دیکھ سبزواری تھے او　　بہ دردِ حسین اشک جاری تھے او
نہ مذہب و ملت سے رکھتا تھا کام　　تھا مشغول در یادِ حق صبح و شام[1]

شاہ تراب کی صحیح تاریخ پیدائش کا علم نہ ہو سکا، البتہ اتنا وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے پیر و مرشد پیر پادشاہ حسینی نے ۱۱۱۵ھ ہجری میں انھیں خرقۂ خلافت عطا کیا تھا، اس واقعہ کا ذکر شاہ تراب نے "مثنوی ظہور کلی" کے انیسویں باب میں اس طرح کیا ہے:

او ولیِ عصر مرشد نامدار　　در سنِ پنجدہ[2] و یک صد و یک ہزار
روز جمعہ ماہِ رجب وقتِ شام　　دی خلافت گنج الاسرار بخشے نام

---

[1] آئینۂ کثرت: من سمجھاون، ص: ۹ [2] محترمہ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے پنجدہ سے پچاس مراد لیے ہیں، در اصل پنجدہ پنج اور دہ کا مرکب ہے، جس سے پندرہ برآمد ہوتے ہیں، دیکھئے من سمجھاون مرتبہ سیدہ جعفر ص ۱۷

شاہ تراب کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ ۱۱۶۵ھ تک جاری رہا۔ اسی سنہ میں انھوں نے مثنوی آئینہ کثرت مکمل کی تھی۔

اس اعتبار سے شاہ تراب یقینی طور پر ۲۰ سال تک بقید حیات رہے، افسوس ہے کہ ان کی تاریخ وفات کے متعلق کوئی اشارہ نہیں ملتا۔

تعلیم و تربیت | شاہ تراب کی ابتدائی تعلیم و تربیت ان کے والدین کے دامن میں ہوئی، اس کے بعد انھوں نے علم و ادب کا اکتساب کیا اور عربی و فارسی میں کمال حاصل کیا، انھیں علم رمل اور نجوم پر بھی قدرت حاصل تھی، ہندو مذہب اور اس کے فلسفے کی کتابیں بھی ان کے زیر مطالعہ رہیں، جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے

مجھے آکر پڑی یو فکر ایک بار　　کر دیکھوں اہلِ ہند میں کیا ہے تکرار
چلن میں تو بظاہر سب ہیں بے ڈھنگ　　سمجھتے ہیں خدا اپنا بت سنگ
مگر ان کی کتابوں دیکھنا سب　　تو ظاہر سب ہویگا ان کا مطلب
پڑا تب سوں ان کی کتاباں　　دسیا ہر جا پو او ہی شمع تاباں[1]

چند اشعار اور ملاحظہ ہوں :

غرض کچھ نین تھا ہندی فارسی سوں　　اتھا درکار یاراں خند رسی سوں
سگل بید (وید) و پُران کا سبھر گیتا　　چہ راماین چہ بھگونتہ گیتا
ہوا جب ہندوی میں اُس، خبردار　　تو پایا اصطلاح کا پھیر بسیار[2]

دیگر مذاہب کی کتابوں کے مطالعہ نے شاہ تراب کے فکر و فن میں بڑا انقلاب پیدا کیا، انھوں نے ہندی اور اسلامی عقائد و فلسفیانہ مسائل کا تقابلی مطالعہ کیا اور

---

[1] گلزار وحدت ص ۳۳۰ تا ۳۴۱ [2] ایضاً ۳۴۲ تا ۳۴۳

اور اس نتیجے پر پہنچے کہ "رام اور رحیم" میں صرف لفظی پھیر ہے، ان کا مفہوم ایک ہی ہے مثلاً

اوہی اللہ اوہی شیو ہری نام ہے یک محبوب ہیں جس کے اتنے نام

(گلزار وحدت: ۳۴۴)

شاہ تراب کے پیر و مرشد پیر پادشاہ حسینی کے فیض تربیت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا، پیر پادشاہ حسینی کا روحانی سلسلہ شاہ میراں جی شمس العشاق سے ملتا ہے، میراں جی شمس العشاق دکن کے بزرگ ترین صوفیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ میراں جی شمس العشاق سے لیکر پیر پادشاہ حسینی تک خرقۂ خلافت اسی خاندان کے لوگوں تک محدود رہا، پیر پادشاہ حسینی نے اسے پہلی بار ۱۱۵۵ھ میں شاہ تراب چشتی کے سپرد کیا، جو اس خاندان کے فرد نہیں تھے۔ اس سے شاہ تراب کے صوفیانہ مرتبے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ؎

نہ کوئی اہل دول مجھ پاس آتا نہ میں کس پاس جا شیخی جگاتا
نہ قدر و منزلت کس پاس چنداں نہ ہے داد و دہش کی آس چنداں
بہر صورت گذر جائے اوقات اپس قسمت او پر شاکر ہوں دن رات
نہ میرے علم کا کوئی قدرداں نہ میں پھرتا ہوں سرگرداں و حیراں
اگر جو اہل دنیا خر صفت ہے اُس عارف سے کیا معرفت ہے
پچھائے اہل باطن کوں اگر او کلاتا کیوں بچارا کور کمراو (؟)
نہیں طعنہ کیا کس پر حسد سوں مجھے کیا کام کس کے نیک بد سوں[۱]

یوں تو شاہ تراب چشتی نے ہر صنف نظم میں طبع آزمائی کی ہے، وہ اپنی ہر نظم میں تصوف کے اسرار و رموز کو سلیس اور عام فہم پیرائے میں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

---

[۱] گلزار وحدت ص ۲۲۹ تا ۲۳۵

انھیں چونکہ علم رمل اور نجوم پر پوری قدرت حاصل تھی۔ اسی لیے انھوں نے علم رمل سے متعلق ایک طویل نظم لکھی ہے جس میں علم رمل کی تمام اصطلاحوں کا استعمال بڑی صفائی اور چابکدستی سے کیا ہے۔ ان کی غزلیں، قصائد اور متعدد چھوٹی چھوٹی نظمیں بھی اسکی غمازی کرتی ہیں کہ شاہ تراب چشتی کو پیچیدہ صوفیانہ اور فلسفیانہ مسائل کو صاف اور شستہ انداز میں بیان کرنے کا خاص ملکہ حاصل تھا۔ آج تک شاہ تراب کی اردو کے نثری نمونے دستیاب نہ ہو سکے۔ البتہ راقم کو انکی فارسی نثر کا ایک اقتباس ملا ہے، جو اس کی دلیل ہے کہ شاہ تراب کو نظم کے ساتھ نثر لکھنے کا بھی شوق تھا۔ ان کی نثر تکلفات سے عاری ہوتی تھی۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

"روزے مرشدِ حقیقی کعبۂ تحقیق حضرت پیر پادشاہ حسینی قدس اللہ سرہ العزیز در باغِ آشتی جلوس رقص فرمودند و ہمہ خلفاء و مریدان در مجلس حاضر بودند، دریں حالت میاں صاحب پسر منعرت گنج بخش سوال نمودہ کہ یا مرشدنا اصل حضرتِ خمس چہ چیز است، آں قبلہ برحق کعبۂ مطلق ایں غلام می فرمودند کہ اے گنج الاسرار جواب پسر منعرت گنج بخش درباب دحضرت خمس بگو۔ غلام بموجب حکم سجدہ ہا بجا آوردہ وگفت میاں صاحب اگر عالم غیب کرمی پرسی ایں بیت کافی است :

در گوشِ تو حلہ است اذاں دانستم   کر بنا گوشِ تر بوسہ زدو آب نشد

[مجموعہ نظم، نمبر ۲۹۹/۴۷ انجمن ترقی اردو علی گڑھ ص]

تصانیف | (۱) **ظہور کلی** :۔ یہ ایک طویل نظم ہے جس میں بقول شاہ تراب تمام ہندی اصطلاحوں کی وضاحت موجود ہے ؎

ظہور کلی میں اکثر بیاں ہے   تمام اصطلاح ہندی عیاں ہو

[گلزار وحدت : شعر نمبر ۱۳۳]

اس نظم کا سنہ تصنیف ۱۱۰۷ھ ہے، جیسا کہ شاہ تراب نے خود کہا ہے:

سالِ تاریخ کتاب منجلی　　گفت ظہورِ کلی مولا علی

اور مقرر پھر کیا نام کتاب　　جب ہوا میرے پو فضلِ تراب

(۲) من سمجھاون :- یہ نظم ترکیب بند کے طور پر لکھی گئی ہے، اس کے ہر حصے میں ایک علٰحدہ موضوع کو نظم کیا گیا ہے۔ شاہ تراب نے یہ نظم مراٹھی ادب کے مشہور فلسفی اور شاعر رام داس کی مشہور و معروف نظم "مناچے شلوک" کے جواب میں لکھی ہے۔ اس نظم کا سنہ تصنیف صحیح طور پر معلوم نہیں۔ داخلی شہادتوں کی بنا پر یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ ۱۱۶۷ھ کے آس پاس لکھی گئی ہوگی۔

(۳) گیان سروپ[1] :- یہ نظم شاہ تراب نے ترجیع بند کے طور پر لکھی ہے، اس میں ۵۹ بند ہیں۔ اس نظم میں مختلف موضوعات پر روشنی ڈالی ہے اور خاص طور پر اپنے پیرو مرشد کی تعریف و توصیف کی ہے۔ اس نظم کا سنہ تصنیف بھی نامعلوم ہے۔ البتہ اتنا یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ نظم ۱۱۱۵ھ کے بعد تصنیف ہوئی۔ اس نظم میں شاہ تراب نے کئی سنسکرت الفاظ استعمال کیے ہیں، آخری بند میں اس نظم کے نام کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

اے گیان سروپ سب ہوا تمام　　جل گیان سروپ اُس رکھا نام

ستگر وسوں دیکھوا سے رام　　ترلوک کا سارا کہا مقام

میں عین علی کا صحیح غلام　　منج رات ہور دن سب ایہی کام

جو پیر حسینی پیارا ہے

اے تراب اوس بلہارا ہے

(۴) گلزارِ وحدت :- اس نظم کا موضوع تصوف کے اسرار و رموز کی

---

[1] گیان سروپ از شاہ تراب چشتی مرتبہ ڈاکٹر نور السعید اختر، نوائے ادب بمبئی: جنوری ۱۹۷۰ء

عقدہ کشائی ہے، اس کے چودہ ابواب ہیں، ہر باب کو گل کا نام دیا ہے، اس نظم کا سنہ تصنیف ۱۱۶۲ھ ہے، اور اس کے اشعار کی تعداد ۵۹۰ ہے۔

(۵) گنج الاسرار :- یہ ایک طویل نظم ہے، اس میں علم رمل کی باریکیوں کو واضح کیا گیا ہے، مصنف نے اپنے خلیفہ کے حکم سے اس رسالے کا نام گنج الاسرار رکھا، اس کی توضیح انھوں نے یوں کی ہے ؎

بھی اس کا نام رکھ تو گنج الاسرار گویا سچ نام سوں ہوئے گا اظہار

بحسب حکم آں شاہ نکوکار رکھیا نام اس رسالے کا گنج الاسرار

یہ نظم ۱۱۶۷ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی، شاہ تراب نے اس نظم کی تاریخ تصنیف بھی لکھی ہے۔

خرد تاریخ نظم انتخابی بگفتا گنج الاسرار ترابی

(۶) آئینہ کثرت :- اس مثنوی میں ۱۹۶۰ اشعار ہیں، اور اس کا سنہ تصنیف ۱۱۸۱ھ ہے، اس نظم کا موضوع بھی فلسفہ اور تصوف ہے لیکن بعض جگہ مصنف نے اپنی نجی زندگی سے متعلق بھی اشارے کیے ہیں، خصوصاً اپنے والد کا ذکر اور اپنے خاندان کے دیگر افراد کے بارے میں بھی چند باتیں لکھی ہیں۔

(۷) مثنوی مہ جبیں و ملا :- اس مثنوی کے سنہ تصنیف کا صحیح اندازہ نہیں ہے، اس کے نام کے بارہ میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے، اس مثنوی کی ہیروئن کا نام جبیں ہے اور ہیرو ایک ملا ہے، اس لیے اس کا یہی نام زیادہ درست معلوم ہوتا ہے، ڈاکٹر سیدہ جعفر صاحبہ نے اس مثنوی کے اشعار کی تعداد ۲۲۸[1] بتائی ہے، جو صحیح نہیں ہے، راقم اس مثنوی کا مرتبہ متن تیار کر رہا ہے، اس میں اشعار کی تعداد سات سو کے قریب

---

[1] من سمجھاون، مرتبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر ص ۶۸

پہنچ گئی ہے، جو چند رحصوں پر مشتمل ہے، اور ہر حصے کا ایک علیحدہ عنوان ہے، شاہ تراب نے اس میں ایک عشقیہ داستان نہایت دلکش پیرایہ میں بیان کی ہے،

(۸) **ایدیش حسینی** :- شاہ تراب کی بعض نظموں کا ایک مجموعہ انجمن ترقی اردو علی گڈھ میں موجود ہے، اسی میں یہ نظم بھی ہے، اس مجموعے کا نمبر ۔۔ ہے، اس میں کل ۴۸ اشعار ہیں، اس میں شاہ تراب نے حروف تہجی کی خصوصیات بیان کی ہیں، کہتے ہیں ؎

تراب بست و ہشت حروف کا بیاں کیا ہو سارا ہر یک بیت میں ہر ایک بیت کا مطلب ہیگا نیا!

اس نظم کے مقطع میں شاہ تراب نے نظم کے عنوان اور وجہ تصنیف کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے ؎

سنگر و میرے پیر حسینی جن کا سب ایدیش جس گر و کارن ہو بیراگی تراب پھرے پردیس

(۹) **نظم خاندانِ چشتیہ** :- یہ نظم دو حصوں میں منقسم ہے، پہلا حصہ "نظم خاندان چشتیہ" پر اور دوسرا "چہار پیر اور چودہ خانوادہ" پر مشتمل ہو، پہلے حصے میں شاہ تراب نے حمد و نعت کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تعریف و توصیف میں چند اشعار ہیں، پھر اپنے خاندان چشتیہ کے تمام بزرگوں کا یکے بعد دیگرے ذکر کیا ہے، اس نظم کے پہلے حصہ کو شاہ تراب نے اس شعر پر ختم کیا ہے ؎

اے تراب وصف میں زباں کھول چار پیر خاندادی کا بول

اس نظم کے ابتدائی حصے میں چار پیروں اور اس کے بعد میں خانوادوں کا ذکر ہے، اس میں اشعار کی تعداد ۸۸ ہے،

(۱۰) **دو چھوٹی نظمیں** :- (۱) اس نظم کو راقم نے "سوالات شاہ تراب" کا عنوان دیا ہے، اس نظم کے اشعار کی تعداد ستر ہ ہے، اس میں شاہ تراب نے پیرو فقیر سے سوالات

کیے ہیں، جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں:

مطلع: سب پیر ہور فقیر پو میرا سوال ہے | کل شے اوپر محیط سو کیوں ذوالجلال ہے

مقطع: او ہی میرے سوال کا دیوےگا خوش جواب | جس کوں تراب ہوا کا میرے وصال ہے

(۲) شاہ تراب کو علم نجوم پر پوری قدرت حاصل تھی، ان میں علم نجوم کی اصطلاحات کو نظم کرنے کا خاص ملکہ تھا، اس مختصر سی نظم میں جس کے اشعار کی تعداد کل ستّرہ ہے، ہر شعر میں ایک دقیق بات بیان کی گئی ہے، مقطع میں شاہ تراب نے خود ہی اقرار کیا ہے کہ انھوں نے عاشقِ صادق کے لیے یہ باتیں نہایت اختصار کے ساتھ کہی ہیں۔

طالب صادق کی خاطر اے تراب | چند ابیات یو کہا ہوں مختصر

غزلیں اور قصائد | شاہ تراب کی تیس کے قریب غزلیں اور چند قصائد بھی ملتے ہیں، غزلوں پر بھی مذہبی اثر موجود ہے، اکثر غزلیں چھوٹی اور مترنم بحروں میں ہیں، شاہ تراب نے غزل میں اپنے پیر و مرشد کا تتبع کیا ہے، اس لیے غزلوں کے رنگ و آہنگ پر تصوف و معرفت کا اثر غالب ہے، راقم کو شاہ تراب کی ایک ایسی بھی غزل دستیاب ہوئی ہے جس میں "کرشن جی" کی تعریف موجود ہے، اس غزل کے چند اشعار یہ ہیں ؎

لگا ہے دل مرا اُس سوں کہ جو مرلی مراری ہے | سلونا سانولا دلبر گردھر جس کی سواری ہے

چرانا بن میں گؤ سالے او نندلا لنکر کمل پوش | اوسی گوپال مرلی دھر سوں دھن مرلی کی پیاری ہے

نا ہند و دو مسلمان کے او سنیجر اقید میں ہرگز | تراب مبتلا کے تئیں دیا جو بے قراری ہے

ایک اور خوبصورت غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رہتا ہوں صبح و شام گرفتہ رکیف میں | حیرت زدہ ہوں صورتِ دیدار کیف میں

اے زاہد نہ پوچھ مجھے صوم و صلوٰۃ | کیا صوم ہور صلوٰت دھکار کیف میں

جب جائیں گے تمام نازی بروز حشر — میں جاؤں گا بحالتِ سرشار کیف میں

دی نقد جاں ہوا ہوں خریدار جام مے — پاتا ہوں آج گرمیِ بازار کیف میں

تب سوں خیال کیف میں رہتا ہوں اے تراب — پایا ہوں جب سے لذتِ دیدار کیف میں

شاہ تراب نے کسی بادشاہ یا امیر کی مدح سرائی نہیں کی، ان کے تمام قصائد حضرت علیؓ کی تعریف و توصیف سے مالا مال ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

در پردہ کن گنجِ نہاں تھا سو علی تھا — پرکار خط مرکزِ جاں تھا سو علی تھا

جب وحی محمد پہ ہوئی حق سے نازل — جبریل کوں امدادِ لساں تھا سو علی تھا

باللہ کہ تراب نجف ہے زینتِ تبریز — از بس کہ اُسے امن و اماں تھا سو علی تھا

گلزار وحدت بحیثیت نظم | گلزار وحدت سیدھی سادی مگر دلکش متصوفانہ مثنوی ہے، اس کا اسلوب شستہ، شگفتہ اور رواں ہے، خوبصورت استعارے اور نادر تشبیہیں استعمال کی گئی ہیں کہیں کہیں سنسکرت الفاظ اور ویدانتی فقرے بھی ہیں، کچھ اشعار بحر سے خارج ہیں، اس میں شاہ تراب نے صوفیانہ مسائل کو سلیس پیرائے میں سمجھانے کی کوشش کی ہے، انھوں نے شیخ محمد شبستری (۷۱۸ھ مطابق ۱۳۱۸-۱۳۱۷ء) مشہور عالم صوفی کے کلام کے حوالے بھی دیے ہیں،

نمبر شعر

بیاں بولے ہیں صاحبِ گلشنِ راز — ہوئے جو معرفت کے فن میں ممتاز [۹۴]

رسد چوں نقطہ آخر باوّل — در انجا نی ملک گنجد : مرسل [۹۵]

تراب بلبلِ باغ الٰہی — کلام گلشنِ راز ہے گواہی [۱۳۹]

جہاں انساں شد و انساں جہانے — ازاین پاکیزہ تر نبود بیانے [۱۴۰]

کہے ہیں خوب صاحب گلشنِ راز — ایس تصنیف میں یو بیت ممتاز [۱۹۱]

سیاہی گر بدانی نورِ ذات است بتاریکی در آبِ حیات است [۱۹۲]

یہ اشعار اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ شاہ تراب نے "گلشن راز" کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا، یہ بھی ممکن ہے کہ انھوں نے "گلزار وحدت" اسی سے متاثر ہو کر لکھی ہو، دونوں تصانیف کے ناموں کے پہلے جز میں ایک گونہ مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ اس مثنوی میں ایک اور بزرگ 'میر قنبر شاہ دلدل' کا حوالہ بھی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ شاہ تراب کو میر قنبر شاہ دلدل سے روحانی لگاؤ تھا، چنانچہ لکھتے ہیں:

کریگا نالہ و فریاد ہر گل بیاد میر قنبر شاہ دلدل [۵۰۸]

"گلزار وحدت" کے چودھویں گل میں مصنف نے اپنی مثنوی سے متعلق کئی باتیں لکھی ہیں، اس کے نام اور سنہ تصنیف کے ذکر کے بعد کہتے ہیں کہ جو کوئی 'گلزار وحدت' کی سیر کرے گا، اس کو نہ صرف حق اور غیر حق کی تمیز آ جائے گی، بلکہ باغ کثرت میں پائے جانے والے نقشہائے رنگ رنگ کی پرکھ کا مادہ بھی پیدا ہو جائے گا ؎

جو ہئے بلبلِ باغِ کثرت سو پاوے رنگ و بوئے باغِ کثرت [۵۴۳]

جو لوگ راہِ خدا میں گرمِ سفر ہیں، ان کے لیے گلزار وحدت کا مطالعہ ضروری ہے، اس سے بہت سے اسرارِ حقیقت اور رموزِ حیات منکشف ہوتے ہیں، اس ضمن میں شاہ تراب نے شاعرانہ تعلّی سے بھی کام لیا ہے ؎

میرے گلزار وحدت میں او آوے جو کوئی عارف باللہ کلا دے [۵۵۱]

شاہ تراب کے نزدیک باخبر دل متاعِ حیات ہے، وہ اسکی تعریف میں کہتے ہیں:

ہے آدم او جسے دل کی خبر ہے خبر دل سوں رکھا سو او بشر ہے [۵۷۲]

نہیں او دل جو رکھتے سب بہائم اسے او دل کہ جس تے عرش قائم [۵۷۴]

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے عقیدت کا اظہار شاہ تراؔب کی ہر مثنوی اور نظم میں موجود ہے۔ گلزارِ وحدت میں بھی انھوں نے ان کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

الٰہی حب حیدر میں مجھے رکھ ہمیشہ یادِ صفدر میں مجھے رکھ [۵۸۵

اگر قالب سوں جی نکلے کا اک بار بیا درِ حیدرِ صفدر مجھے مار [۵۸۶

اس مثنوی کے بیشتر اشعار میں شاہ تراؔب نے پیرِ طریقت شاہ امین الدین اعلیٰ بیجاپوری اور اپنے پیر و مرشد پیر پادشاہ حسینی کا بار بار ذکر کیا ہے، اور اپنی عزلت گزینی اور ولیِ عصر ہونے کا دعویٰ بھی کیا ہے۔

کلاہ پایا جو امین الدین علی کا کیا شہرت جہاں میں کاملی کا [۵۹۰

ملا جب مرشدِ کامل زبردست بجا یا اب جہاں میں طبلِ شہرت [۵۹۱

علم دار امین الدین علی ہوں ملامت پیشہ پوشیدہ ولی ہوں [۵۹۲

ملامت پیشگی ہے عین راحت عجب دولت ہے باللہ کنجِ عزلت [۵۹۳

ہوا ہوں گنج الاسرار حسینی غلامِ کفشِ بردارِ حسینی [۵۹۴

شاہ تراب نے اپنی تمام مثنوی میں یہ اہتمام کیا ہے کہ ہر گل کے خاتمے پر اپنا تخلص لکھا ہے، اور اگلے گل کا تعارف بھی کر دیا ہے۔ قرآنی آیات اور اقوال کے جابجا حوالے بھی دیے ہیں جس سے ان کا اندازِ بیان پرزور اور نظریات واضح ہو گئے ہیں۔ گلزارِ وحدت میں مندرجۂ ذیل ضرب الامثال استعمال ہوئی ہیں:-

(۱) بلا کے پھول پان دائی کے سر پہ [۳۹۷]

(۲) باندر کی بلا طویلے کے سر [۴۲۳]

(۳) خرِ بے دم سراپا کو رِ دگر ہے [۵۵۳]

چند مشکل الفاظ اور تراکیب جن کی تشریح ضروری ہے

الفاظ	معنی	شعر نمبر	الفاظ	معنی	شعر نمبر
۱- استھول [سریر]	جسم عنصری	۶۹	۱۵- گند، رس، روپ، سپرش، شبد	حواس خمسہ	۳۲۷
۲- سجل	آئینہ	۹۶	۱۶- سبل	آسمان	۳۵۸
۳- کرتار	خدا	۱۸۰	۱۷- چندر	چاند	"
۴- پران	نفس امارہ	۳۲۲	۱۸ بھان	سورج	"
۵- اپان	نفس لوامہ	"	۱۹- اونکار	اوم۔ مبارک لفظ	۴۰۳
۶- ویان	ظاہر و باطن	۳۲۳	۲۰- جرامرن	جوانی اور بڑھاپا	۴۰۴
۷- سمان	نفس مطمئنہ	"	۲۱ ورن	رنگ	"
۸- اودان	نفس ملہمہ	"	۲۲ کرپا	مہربانی	۴۳۶
۹ کنٹھ	حلق	"	۲۳ بلہار	قربان	"
۱۰ اپدیش	پیغام	۳۲۵	۲۴ دیاونت	رحم دل	۴۳۸
۱۱- ستگر	مرشد کامل	"	۲۵- نت سنت	ہمیشہ اچھا رہنے والا	"
۱۲- دس اندریہ	پانچ کرم اندری، پانچ گیان اندری	۳۲۶	۲۶- تربھون	سورگ، پرتھوی اور پاتال	۴۱۴
۱۳- پنچ پران	پانچ حواس ظاہری	"	۲۷- جیوتی سروپ	ایک دیوی کا روپ	"
۱۴- من بدھی	عقل کل و نفس کل	"			

جدید لسانیات کے ماہرین نے اٹھارھویں صدی عیسوی کی قدیم اردو کا لسانیاتی تجزیہ کرکے جن اہم باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ سب کی سب گلزار وحدت میں موجود ہیں۔

گلزار وحدت کا خلاصہ | مثنوی گلزار وحدت کی ابتدا تصوف کی روایتی مثنویوں کی طرح حمد سے ہوئی ہے۔ اس میں رازِ کن' اور اسرار "وکان" کی تشریح کے ساتھ ساتھ وحدت، واحدیت اور احدیت کے مسائل کی توضیح بھی موجود ہے۔ نور احمد اور میم محمد کی افادیت اور وجود آدم کے ظہور کی اہمیت پر بھی بحث کی گئی ہے۔ وجود آدم سے متعلق شاہ تراب کا خیال ہے کہ ؎

وجود ہی ذاتِ واجب یعنی اصفات   وجود کا وصفِ خاص ہوا اعتبارات [۲۲]

وجود علم و نور و وہم شعور ہے   یہ وصف خاص اور واجب وجود ہے [۲۷]

دوسرا "گل" موم کی تمثیل اور وصف موم پر مبنی ہے۔ موم سے کئی چیزیں بنائی جاتی ہیں، اس کی ساخت اور شکل میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، لیکن اس کی صفات جوں کی توں رہتی ہیں،

یکے خشکی دویم لوں جان گرمی   سیوم سختی چہارم بوجہ نرمی [۳۷]

جس طرح موم کی مختلف شکلوں سے موم کے وجود میں کوئی فرق نہیں آنے پاتا، اسی طرح ذات حق کے جلوے ساری دنیا میں مختلف شکلوں اور صورتوں میں نمایاں ہیں، لیکن اسکا وجود اپنی جگہ قائم ہے، شاہ تراب نے اس "گل" میں وحدت کے تصور کو سیدھے سادے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اس کے بعد سونے کی مثال دی ہے کہ زرگر سونے کی الگ الگ چیزیں بناتا ہے جس سے اس کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں، لیکن سونے کی صفات جوں کے توں قائم رہتے ہیں۔

تیسرے "گل" میں "ہفت اصفاتِ قادر" کا تعارف کرایا ہے، اسے "سبعہ صفات" بھی کہتے ہیں، اس میں بتایا گیا ہے کہ حق شناس کے لیے عقل کی رہنمائی درست نہیں بلکہ اس

کے لیے جذبۂ عشق ضروری ہے، اسی کی مدد سے وہ حقیقت و معرفت تک پہنچ سکتا ہے،
البتہ ایک مرشد صادق کی دستگیری ضروری ہے۔ اس کے بعد روح ناطق کی باریکیوں
کو سمجھانے کی کوشش کی ہے، اور بتایا ہے کہ روح ناطق دراصل "تجلّی" کا دوسرا نام ہے
اور اسی سے عقل وجود میں آئی ہے ؎

تجلّی قدیر ام الدماغ ہے — کہ انساں میں دماغ عین فراغ ہے [۷۰]

اس کے بعد "تجلّیِ علیم"، "تجلّی کلیم"، "تجلّی مرید" کے نام سے علم ثلاثی بیان کیے ہیں،
وہ کہتے ہیں علم ثلاثی ہر جگہ موجود ہے ؎

ہر ایک شے میں ثلاثی علم جانو — بجز ان کے نہیں ہے کچھ پچھانو [۸۱]

علم ثلاثی کی توضیح ذیل میں کی گئی ہے ؎

سمجھ علم ثلاثی اسے برادر — خدا، اور نور قدرت بوجہ اکثر [۸۰]

موجوداتِ دنیوی نورِ احمد کی برکت سے وجود پذیر ہوئے ہیں، محمدؐ دراصل
نورِ حق ہیں، پھر اس کی تشریح کی گئی ہے کہ نورِ احمد نے کس طرح عناصر خمسہ کا قالب
اختیار کیا اور ان کا ایک دوسرے سے کس طرح تعلق پیدا ہوا،

گل چہارم "حق و حقیقت اور وحدت و کثرت" کی تفصیلات پر مشتمل ہے،
اس میں وحدت و کثرت کی حقیقت و ماہیت سمجھائی گئی ہے ؎

تجلّی اول کا نام ہے وحدت — تجلّی ثانی یعنی واحدیت [۱۳۳]
یہی انسان اول وحدت ہے نام — سمجھ انسان ثانی کثرت نام [۱۳۴]

گل پنجم میں بتایا گیا ہے کہ انسان جو ایک ادنیٰ سی مخلوق ہے، اس نے اطاعت
خداوندی کا بار اپنے سر لے لیا، جس کو اٹھانے کی عرش و فرش پر کسی نے بھی ہمت نہیں کی،

اس لیے انسان قابلِ ستایش ہے کہ اس نے جرأت سے کام لیکر فرشتوں کو بھی مات دی، لیکن اب وہ لذاتِ دنیوی میں مشغول ہو کر ناکارہ ہو گیا ہے ؎

ارے او بے خبر بے ہوش مجہول امانت داری کیوں اپنی گیا بھول [۱۵۲]

اسی گل میں آگے چل کر بتایا ہے کہ مکر و فریب نے مذہب کی حقیقی روح پر ریاکاری کے پردے ڈال دیے ہیں، اس لیے محاسبے اور مجاہدے کو فراموش کرنے والے حقیقت تک کس طرح پہنچ سکتے ہیں؟ ان کے نزدیک سب سے بڑا پردہ علم ہے، کیونکہ اہل علم صَرف و نحو، حکمت و نجوم اور رسمی علوم کی تحصیل میں حیران و سرگرداں رہتے ہیں، اس لیے حقیقت تک ان کی رسائی کس طرح ہو سکتی ہے۔

السّعی منّی کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ بشر کے لیے نورِ ایمان کی خبر ضروری ہے، اگر اس پر جسمانی کثافتیں غالب آگئیں تو اس کے نفس پر شیطان سوار ہو جاتا ہے، اہلِ یقین کے لیے مئے وحدت سے سرشاری ضروری ہے، اس سے قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے ؎

اگر او کیف ہوئے سب کے دل میں دِسے کیفِ الٰہی آب و گل میں [۱۷۸]

چھٹا گل "شیخ جاہل" سے متعلق ہے، اس میں نام نہاد پیروں اور مریدوں کی حقیقت ظاہر کی ہے۔ اور مرشدِ کامل اور اس کی خصوصیات کو پیش کر کے جاہل پیروں کی کوتاہیوں کو بیان کیا ہے، جو اس زمانہ میں عام تھیں، ان کے نزدیک پیرِ کامل کی تلاش آسان نہیں ہے، اس کے لیے مرید کو صحرا نوردی کرنی پڑتی ہے اور اصل و نقل کی پہچان کے لیے دیدہ وری سے کام لینا پڑتا ہے، ورنہ نقلی پیر شعبدہ بازی کے ذریعے کم عقل مریدوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں، شاہ تراب نے ایسے پیرانِ جاہل کو پنڈاریوں سے تشبیہ دی ہے جن کا پیشہ لوٹ مار ہے ؎

دھریں جرأت عجب اوصافِ ذات پنڈاری لشکر سا ہو گی ہے مات [۲۲۶]

ان کے نزدیک وہی شخص پیر کامل کہلائے جانے کا مستحق ہے جس کے آباء و اجداد بھی عارف باللہ رہ چکے ہوں، وہ کہتے ہیں ؎

سزاوار ہے اوسے پیر کا مسند کہ جس کا معتبر مشہور ہے جد [۲۴۲]
او البتہ اچھیگا پیر کامل ہوا ہے جد و آبا جس کا واصل [۲۴۳]

ساتواں گل وجود ذاتِ مطلق پر ہے، اس میں وجودِ انسانی اور ضرورت تن کی پیچیدگیوں پر روشنی ڈالی ہے، اس ضمن میں انھوں نے بزرگانِ طریقت اور صوفیائے کرام کی سندیں پیش کی ہیں، مثلاً میراں جی شمس العشاق کے حوالے سے کہتے ہیں:

دے واجب وجود کرلے عزیزاں کہے اس تن کوں حضرت شاہ میراں [۲۵۹]
یو تن واجب لکر بولے جو حضرت بیاں کرتے ہیں علما ساری حجت [۲۶۰]

اسی گل میں میراں جی شمس العشاق اور ان کے خلفا کا شجرہ بھی بیان کیا ہے، اس شجرے میں شاہ برہان الدین جانم، امین الدین اعلیٰ، باباشاہ حسینی، حضرت علی پیر اور پیر پادشاہ حسینی شامل ہیں، اس گل کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے ؎

تراب نقش پائے آں ولی ہے کہ جس کا جد امین الدین علی ہے [۲۸۲]

گل ہشتم ارواح اور اجسام کے ذکر پر مشتمل ہے، اس میں عالم کثیف اور ناپاک اجسام پر بحث کی ہے، عالم کے اقسام گنائے ہیں، اور اقسام ارواح کی تشریح کی ہے، مثلاً ؎

یکے نامیہ دویم متحرک جان سیوم ناطق چہارم قدیر پہچان [۲۹۸]

اسکے بعد خانۂ قلب میں رہنے والی چاروں روحوں کی تفصیل پیش کی ہے ؎

اسے بہ روحِ نباتی درجگر جان ہے درگردہ جمادی روح پہچان [۳۰۹]

سچ توں روح حیوانی کوں ہے دل داغ میں، روح انسانی ہے داخل [۳۱۰]
بدن میں روح انسانی ہے سب ولیکن ہے سراپا صنعتِ رب [۳۱۱]

گل نہم نظریۂ ہمہ اوست کی وضاحت پر ہے، اس میں روح جمادی اور روح نباتی کی تشریح کی گئی ہے، جگر میں رہنے والی روح کو 'نباتی' گردہ میں رہنے والی روح کو 'جمادی' داغ والی کو 'نفسانی' اور دل میں بسنے والی روح کو 'روح حیوانی' بتایا ہے، اس گل میں انھوں نے اہلِ ہنود کی کتابوں سے بھی استفادہ کا اعتراف کیا ہے، اور عناصرِ خمسہ اور حواسِ خمسہ کے سنسکرت مترادفات شامل کیے ہیں۔

غرض کچھ نیں تھا ہندی فارسی سوں اتھا درکار یاراں حبز رسی سوں [۳۳۲]
سگل بید و پران کا سیر کیتا چہ راماین و چہ بھگوت گیتا [۳۳۳]

دسویں گل میں "کلِ شئیٔ محیط" کی تشریح ہے۔ شاہ تراب کا نظریہ یہ ہے کہ خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے، وہ آفاقی ہے، ان کے نزدیک جلوۂ معبود دیر و کعبہ، زاہد و پجاری اور مفلس و غنی سب کے دل میں ضو فشاں ہے، اس سلسلہ میں ان کے یہ اشعار غور طلب ہیں ؎

کہیں بلبل کہیں گل ہو کہیں مل کہیں شیشہ کہیں آوازِ قلقل [۳۵۴]
کہیں ساقی کہیں ساغر کہیں دور کہیں عاشق کہیں معشوق پر جور [۳۵۵]

انھوں نے انسان کو "سرِّ حق" اور حق کو "سرِّ انسان" بتاتے ہوئے حقیقت، واحدیت، حق احد اور وحدت وغیرہ کی تشریح کی ہے، اور 'احد' کو "اصلِ اشیاء" بتایا ہے، چنانچہ کہتے ہیں ؎

احد ہے اصلِ اشیا اے برادر بھی واحد اصل تعداد منوّر [۳۰۸]

گیارہواں گل اسمائے محمدیؐ اور آدم حقیقی کے ذکر میں ہے، اس میں آدم کی ان خصوصیات کا بیان ہے جس کی وجہ سے اس کو فرشتوں پر فوقیت دی گئی ہے ۔

بارہویں گل میں ذکر "یگانگی اور عبد معبود" کا بیان ہے، اس بتایا گیا ہے کہ انسان خدا میں واصل بھی ہے اور اس سے جدا بھی، جیسے لفظ میں معنی پنہاں ہوتے ہیں لیکن دونوں جدا بھی ہیں

سچ تو بشر میں یوں خدا ہے	نہیں جوں حرف سوں معنی جدا ہے [۵۲۵]

پھر بتایا گیا ہے کہ انسان کمزور و ناتواں ہے، محض لطف الٰہی سے اشرف المخلوقات کے اعلیٰ و ارفع مقام پر فائز کیا گیا، اس کا سبب وہ جرأت بھی تھی جو فرشتوں کے مقابلہ میں دکھائی ،

فرشتوں میں نہیں تھا تاب طاقت	اٹھا لیوں جو او بار امانت [۵۲۴]

تیرہویں گل میں آیتہ النور کا بیان ہے، اس میں قلب انسانی کی اہمیت بتائی گئی ہے، عارف کامل کا دل درگاہ الٰہی سے کم نہیں لیکن دل کا سمجھنا بہت مشکل ہے ؎

ہے تیرے روبرو دل توں ہو بیدل	سمجھنا دل کے تئیں سب تے ہے مشکل [۵۲۶]

دل کے رازہائے مخفی کو سمجھنے کے لیے مرشد کامل کی دستگیری ضروری ہے ؎

سمجھنا دل کوں کار بوالہوس نیں	بجز مرشد تو عرفاں کچھ ہوس نیں [۵۲۸]

اول درکار ہے مرشد تو کامل	کرے ارشاد سوں جو واقف دل [۵۳۰]

مکاشف دل کوں پانا کچھ سہج نیں	بجز مرشد تو بھی دیگر سہج نیں [۵۳۱]

اگر مرشد ملا ہے تجھ کوں کامل	تو البتہ ہوا ہے صاحب دل [۵۳۲]

چودہواں گل خاتم افسانہ (در اختتام کلام) پر مشتمل ہے، اس میں مصنف

نے مثنوی کے نام اور سنہ تصنیف کی صراحت کی ہے، شاہ تراب عارف کامل تھے، اسلیے
اپنی مثنوی کا نام بھی اسی مناسبت سے منسوب کرنا چاہتے تھے ایک مرتبہ تمام رات اسی فکر میں غلطاں
رہے، بالآخر ہاتف صبح نے یہ صدا دی ؎

دیا آواز ہاتف صبح یک بار کہ ہے گلزار وحدت گنج الاسرار [۵۳۷]
کیا یک جو سنا ہاتف کا آواز رکھا "گلزار وحدت" اسم ممتاز [۵۳۸]
ہزار و یک صد و ہفتاد وسہ ماں ۱۱۷۳ھ مرتب جب ہوا گلزار روشن [۵۳۹]

مثنوی کا اختتام ان اشعار پر ہوتا ہے ؎

جو ہے بو طالبی سو یو ترابی ہوا شیرازۂ ختم کتابی ۵۹۷
تراب نقش نعلین حسینی کیا ختم سخن رسمی و عینی [۵۹۸]

سلسلۂ تجدید دین

مرتبہ مولانا عبد الباری صاحب ندوی

جامع المجددین:- اس میں ہر طرح کی دینی و دنیوی فلاح و صلاح کے لیے بہت آسان اور کارگر تدبیریں بتلائی گئی ہیں، جن پر عمل کرنے سے ایک انسان پورا مسلمان اور دیندار بن سکتا ہے، صر

تجدید تصوف و سلوک:- اس میں تصوف کے متعلق ہر قسم کی علمی و عملی غلطیاں اور غلط فہمیوں کو دور کر کے بتایا گیا ہو کہ حقیقی تصوف درحقیقت کمال اسلام اور کمال ایمان ہی، اور بغیر اہل دل صوفی بنے اسلام کی دنیوی و اخروی برکات و ثمرات کا حصول انسان کے لیے ناممکن ہے۔ صر

تجدید تعلیم و تبلیغ:- خالص اسلامی بنیاد پر خیر امتہ بنانے کا ایک نسخۂ کیمیا۔ سے

تجدید قومیات و سیاسیات، تجدید معاشیات، صر

یہ تمام کتابیں مہتمم تجدید دین، بہشتان قدم رسول، ہارڈنگ روڈ، لکھنؤ و مکتبہ دار المصنفین (شبلی اکیڈمی) شہر اعظم گڈھ سے مل سکتی ہیں۔

ادبیات

مثنوی

"کاروانِ حیات"

از جناب وحید الدین خاں ایم اے فتحپور

نظر دیکھتی ہے طلسمِ حیات — فریب نظر رونقِ کائنات
حقیقت میں ہے زندگی اک حباب — نمائش یہاں کی مکمل سراب
پلادے مجھے وہ مئے خانہ ساز — کہ ہو جائے دنیا سے دل بے نیاز
ان اشکوں کو چنگاریاں بخش دے — نفس کو شرر باریاں بخش دے
خرد نے حقیقت پہ ڈالا نقاب — جنوں سے ہے حسن ازل بے حجاب
رہیں دیدہ و دل حقیقت پسند — تجسس سے نظریں رہیں سربلند

رہے دل میں روشن تمنا کا داغ
رہِ عاشقی کا یہی ہے چراغ

رہِ عشق کا رہنما دل رہے — نگاہوں میں ہر وقت منزل رہے
رہے تیز رو کاروانِ حیات — اسی سے ہے پائندہ رنگِ ثبات
تگ و تاز سے زندگی تازہ دم — بڑھاتی ہے منزل کی جانب قدم
تجسس سے اسرار فطرت کھلے — بہت رازہائے حقیقت کھلے
نظر ہو نہ جائے مظاہر پرست — رکھو ذکرِ محبوب سے دل کو مست
دکھاتا ہے دل سرحدِ آرزو — اسی سے ہوئی کامراں جستجو

عطا ہو محبت کا ذوقِ بلند
ستاروں سے آگے جو پھینکے کمند

محبت سے کھلتا ہے رازِ حیات
محبت سے بیداری کائنات

محبت سے دامانِ گل چاک چاک
محبت سے ہے زندگی تابناک

محبت سے آنکھوں میں اشکِ رواں
محبت سے انساں میں تابِ تواں

محبت سے پیدا ہے سوزِ دروں
محبت سے بجتا ہے سازِ دروں

محبت سے سازوں میں آواز ہے
محبت سے ہی ذوقِ پرواز ہے

محبت سے ہے تیزِ فکرِ بلند
محبت سے یزداں اسیرِ کمند

محبت سے روحانیت کا فروغ
محبت سے انسانیت کا فروغ

محبت ہے سرمایہ دارِ جہاں
محبت ہے معمارِ کون و مکاں

محبت سے ہوتی ہے دل میں خلش
محبت سے ذروں میں پیدا کشش

محبت سے تحقیق کو ناز ہے
محبت ہی تخلیق کا راز ہے

محبت سے پائندہ ہستی کا جام
محبت سے ہے زندگی کو دوام

رہے گرم نالہ بہ رنگِ جرس
نہ لے دل نہ لے فرصتِ یک نفس

اسی درد سے ہو فروغِ نظر
اسی سے رہے دل میں ذوقِ سفر

تخیل دکھائے حسیں مرغزار
تصور میں کھلتے رہیں گل ہزار

گلوں سے ہیں گلشن کی آبادیاں
چمن سے رہیں دور بربادیاں

چمن میں رہے ہر طرف نو بہار
لبھائے دلوں کو گلوں کا نکھار

قریں گل کے بلبل چہکتا رہے
یونہی باغ سارا مہکتا رہے

امنگیں بڑھائے شعاعِ امید
امیدوں سے ہر روز ہو روزِ عید

بنا پھر اخوت کی ہوا استوار　　　شعارِ نبی ہو ہمارا شعار
کدورت سے ہر فرد کا دل ہو پاک　　　خلوص و محبت سے ہو تابناک
عمل سے ہمارے یہی ہو عیاں　　　کہ مسلم نہیں ہے اسیرِ زماں
یقیں سے ہو ایمان پائندہ تر　　　ہو امروز سے فردا تابندہ تر
خودی سے ہو پیدا دلوں میں شرر　　　رہیں ذوقِ تخریب سے دُور دور
دلوں میں رہے عزم تعمیر کا　　　جنوں ہو نہ پابند زنجیر کا

حدودِ مکان و زماں توڑ کر
نکل چل طلسمِ جہاں توڑ کر

غزل

از جناب زبیر احمد راہی صاحب، قاسمی فاضل دیوبند

لوگ دلدادۂ اندازِ بتاں ملتے ہیں!　　　اب حقیقت کے پرستار کہاں ملتے ہیں
وحشتِ عشق کے آثار جہاں ملتے ہیں!　　　بس وہیں منزلِ جاناں کے نشاں ملتے ہیں
شیخ رندوں کو جو کہتا ہے برا کہنے دو!　　　ایسے "ناعاقبت اندیش" کہاں ملتے ہیں!
"شعلۂ طور" بجھا "شورِ انا" "ختم ہوا"　　　اب کسے عشق کے اسرار نہاں ملتے ہیں؟
لوگ خنداں ہیں تو کیا، لوگ غزل خواں ہیں تو کیا؟　　　غم کے آثار تو چہروں پہ عیاں ملتے ہیں!!
اسقدر گردشِ دوراں سے نہ گھبرا اے دوست!　　　زیست ملتی ہے تو آزارِ جہاں ملتے ہیں
کیا غضب ہے کوئی بندہ نہیں ملتا یا رب!　　　جتنے ملتے ہیں "خداوندِ جہاں" ملتے ہیں

راہ میں نقشِ قدم ڈھونڈنے والے راہیؔ
نقشِ پا ان کے سرِ کاہکشاں ملتے ہیں!

مطبوعات جدیدہ

اسلامی ہند کی عظمت رفتہ :- مرتبہ مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری تقطیع کلاں کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۴۲، قیمت ۱۲؍ پتہ ندوۃ المصنفین اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶۔

یہ کتاب فاضل مصنف کے آٹھ علمی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ اور ہندوستان کی قدیم اسلامی تاریخ اور عرب ہند کے تعلقات کے بعض پہلوؤں سے متعلق ہے، سب مضامین معارف میں چھپ چکے ہیں، شروع کے تین مضامین میں اولین فاتحین ہند و سندھ عثمان، حکم، مغیرہ، محمد ابن قاسم اور ان کے بیٹے عمرو کے حالات، علمی و دینی کمالات، فوجی کارنامے اور ہندستانی فتوحات کی روداد تحریر کی گئی ہے، اس ضمن میں قبیلۂ بنو ثقیف اور طائف کی اسلامی اور جاہلی عہدوں کی مفصل تاریخ بھی آگئی ہے، دو مضامین میں ہندوستان آنے والے دو بصری علمائے تابعین کا مفصل تذکرہ ہے، ایک مضمون جو عرب و ہند کے قدیم دینی، علمی اور ثقافتی روابط پر مشتمل ہے، قاضی رشید بن زبیر کی کتاب الذخائر و التحف کی تلخیص ہے، عرب مورخین اور سیاحوں نے جن قدیم ہند و راجاؤں کا ذکر کیا ہے آخری مضمون ان کی وضاحت و تحقیق پر مشتمل ہے، شروع میں قدیم اسلامی ہند پر لکھی جانے والی کتابوں کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے، یہ کتاب بڑی محنت و تحقیق سے لکھی گئی ہے، لیکن بعض جگہ عربی عبارتوں کے ترجمے میں بے احتیاطی کی وجہ سے غلطیاں ہوگئی ہیں، جیسے صفحہ ۵۰ پر حضرت عمرؓ کے قول ان لو اصیبوا الخ کا یہ ترجمہ اگر مسلمان

کا نقصان ہوا تو میں تمہاری قوم سے ایک ایک کا بدلہ لوں گا" صحیح نہیں ہے، کیونکہ حضرت عمرؓ نے یہ بات اسلامی فوج کے کامیاب واپس آنے کے بعد کہی تھی، اس لیے صحیح ترجمہ یوں ہوگا کہ اگر مسلمانوں کا نقصان ہوا ہوتا تو میں تمہاری قوم سے اس کا بدلہ لیتا۔" ص ۱۱۹ پر اشعار کا ترجمہ صحیح نہیں کیا گیا ہے" لو طشت ۔ اناث اعدت للوغی وذکور" کا یہ ترجمہ کہ" میں میدان جنگ کو شب عروسی بنا دیتا" غلط ہے، صحیح یہ ہوگا کہ" جو مرد اور عورتیں جنگ کے لیے مہیا کی گئی تھیں وہ پامال کردی گئی ہوتیں"۔ اسی طرح بعد کے تین مصرعوں کے ترجمے میں اس لیے غلطی ہوگئی ہے کہ ان کو پہلے مصرعہ کے" لو" کا جواب نہیں مانا گیا ہے، ص ۱۴۴ پر لکھا گیا ہے کہ" معلوم نہیں کس تصریح یا قول کی بنا پر صاحب تحفۃ الاحوذی نے ان (ربیع بن صبیح) کو سوء حفظ یعنی حافظ کی خرابی سے منسوب کیا ہے، حالانکہ اس کی تائید کسی امام جرح و تعدیل کے قول سے نہیں ہوتی"۔ مگر تحفۃ الاحوذی کی جو عبارت ص ۱۴۳ پر نقل کرکے یہ تنقید کی گئی ہے وہ بعینہٖ تقریب التہذیب لابن حجرؒ میں بھی موجود ہے۔ راجہ رسمی کے متعلق قاضی صاحب کی تحقیقات گنجلک ہوگئی ہیں، ص ۱۷۰ پر" دستاویز" کو مذکر استعمال کیا گیا ہے، حالانکہ یہ مونث ہے، مصنفین اور کتابوں کے ناموں کے سلسلے میں کئی جگہ کتابت و طباعت کی غلطیاں نظر آئیں مگر ان فروگذاشتوں سے قطع نظر یہ کتاب مستند اور اصحاب علم کے مطالعہ کے لائق ہے۔ البتہ محمد بن قاسم پر ابھی تک اس قدر مفصل کوئی تحریر نہیں لکھی گئی تھی۔

تین تذکرے :۔ مرتبہ جناب نثار احمد فاروقی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۳۴۷، مجلد قیمت عصہ ۔ پتہ مکتبۂ برہان، اردو بازار، دہلی ۶

زیر نظر کتاب میں تین قدیم اور اہم تذکروں مجمع الانتخاب (شاہ محمد کمال الہ آبادی) طبقات الشعراء (قدرت اللہ شوق بریلوی) اور گل رعنا (لچھمی نراین شفیق اورنگ آبادی)

کی بالترتیب تلخیص شائع کی گئی ہے، ان کی زبان اگرچہ فارسی ہے لیکن آخرالذکر کے سوا سب اردو شعراء کے تذکرے ہیں، فاضل مرتب نے جو مخطوطات کی ترتیب و تحشیہ کا خصوصیت کے ساتھ تجربہ رکھتے ہیں، بڑی خوش سلیقگی اور محنت سے یہ تلخیص کی ہے اور وہی مواد درج کیا ہے، جو مطبوعہ تذکروں میں مذکور نہیں ملتا یا اختلاف کے ساتھ ملتا ہے، اس لیے اس تلخیص میں ان تذکروں کا مغز اور جوہر آگیا ہے، انھوں نے اس تلخیص میں ان نسخوں کو بنیاد بنایا ہے جو انکے مولفین کی نظر سے گذر چکے تھے، اور دوسرے نسخوں سے مقابلہ و تصحیح بھی کی ہے، شروع میں ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں تینوں تذکروں اور ان کے مولفین کے متعلق ضروری معلومات جمع کیے گئے ہیں، حواشی بھی مفید ہیں یہ تذکرے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں بڑے اہم اور بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ابھی تک کمیاب اور غیر مطبوعہ تھے، ان میں مجمع الانتخاب اور گل رعنا بہت ضخیم ہیں لیکن طبقات الشعراء کی ضخامت زیادہ نہیں ہے، غالباً اسی لیے کچھ عرصہ پہلے خود لائق مرتب نے اس کا مکمل متن اڈیٹ کرکے شائع کیا تھا، اس لیے اس کی تلخیص کی چنداں ضرورت نہ تھی، بہرحال اس مفید ادبی و تحقیقی خدمت کے لیے وہ اردو زبان و ادب کے طلبہ کے شکریے کے مستحق ہیں،

النبی الامیؐ: ترجمہ جناب مولوی مختار احمد صاحب سلفی ندوی خطیب جامع مسجد اہلحدیث مومن پورہ بمبئی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۲، قیمت تحریر نہیں پتے: (۱) مکتبہ دینیہ مومن پورہ بمبئی ۱۱ (۲) مرکزی دارالعلوم پوسٹ بکس ۱۹ وارانسی۔

یہ شیخ احمد بن حجر قاضی محکمہ شرعیہ قطر کی تصنیف "الرد الشافی الوافر علی من نفی امیۃ سید الاوائل والاواخر" کا سلیس اردو ترجمہ ہے، اس میں پہلے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مختصر سوانح عمری بیان کی گئی ہے، پھر تفصیل سے آپ کا امی (ناخواندہ) ہونا ثابت کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں اہل لغت

اور علمائے تفسیر کے اقوال نقل کرکے آپ کو خواندہ قرار دینے والوں کی تردید کی گئی ہے، یہ کتاب ایک مشہور حیدرآبادی فاضل کے ایک مقالہ کے جواب میں لکھی گئی ہے، اس لیے کہیں کہیں مناظرانہ رنگ آگیا ہے، جب قرآن مجید نے رسول اللہ صلعم کو امی اور آپ کی قوم کو امیین کہا ہے، تو کوئی مسلمان بھی اس کا منکر نہیں ہو سکتا، البتہ اس کے معنی میں اختلاف کی گنجائش ہے، گو عام طور سے اس کے وہی معنی لیے گئے ہیں، جو مصنف نے بیان کیا ہے، لیکن دوسرے معنی یہ ہیں کہ آپ کی قوم کو اہل کتاب کے مقابلہ میں امیین کہا گیا ہے، کیونکہ حضرت اسماعیل ؑ کے بعد ان کے اندر کوئی نبی نہیں آیا اور نہ کتاب اتاری گئی، ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس ؓ اور بعض دوسرے اہل علم نے اس کے یہی معنی لیے ہیں، اور یہی بوجوہ صحیح ہے، اس لیے رسول اللہ صلعم چاہے پڑھے لکھے نہ رہے ہوں لیکن امی کے لفظ سے اس پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے، مصنف نے لغویین کے حوالہ سے اس کے جو معنی لکھے ہیں وہ لفظی نہیں بلکہ تشریحی معنی ہیں،

جامعہ جشن زریں نمبر: - مرتبہ جناب ضیاء الحسن صاحب فاروقی، متوسط تقطیع کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۰۰۲ قیمت عہ پتہ رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

اکتوبر ۱۹۷۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جشن زریں کے موقع پر اس کے ترجمان ماہنامہ جامعہ نے یہ خاص نمبر شائع کیا تھا، جو اس کی گذشتہ خدمات، موجودہ کوائف اور آیندہ کے بعض پروگرام اور منصوبوں کا مرقع ہے، اس کا پہلا حصہ خصوصیت سے لائق مطالعہ ہے، اس میں جامعہ کے قیام کا پس منظر، اس کے مقاصد، گذشتہ نصف صدی میں اس پر بیتنے والے نرم و گرم واقعات بیان کیے گئے ہیں، اور جشن سیمیں کے موقع پر اس وقت کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم اور موجودہ جشن زریں کے موقع پر اس وقت کے شیخ الجامعہ پروفیسر مجیب صاحب کے خطبے اور ایک قدیم جامعی رانا جنگ بہادر سنگھ کا دلچسپ مضمون

شامل ہے، باقی حصوں میں جامعہ سے متعلقہ موجودہ اداروں اور مختلف شعبوں کا جائزہ اور اس کے مرحوم امراء و شیوخ اور بعض مشہور اساتذہ کا مختصر تذکرہ کیا گیا ہے، یہ نمبر بڑی خوش مذاقی سے مرتب کیا گیا ہے، جو جامعہ سے متعلق جامع اور معلومات افزا ہے، لیکن شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ پر مضمون نہ ہونے کی کمی محسوس ہوتی ہے، نمبر کے خاتمہ پر روش صدیقی مرحوم کی جو اس تقریب کے وقت زندہ تھے، ایک موثر نظم درج ہے، اس کے آخری مصرعہ پر یہ تعارف ختم کیا جاتا ہے، ع

کاش اس آگ سے ہو شعلۂ ایماں پیدا

دیوان شاکر:۔ مرتبہ جناب نذر صابری و رفیق بخاری صاحبان تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۱۳۶، قیمت ے، پتہ مجلس نوادرات علمیہ، اٹک، کیمبلپور

یہ اٹک (ضلع کیمبلپور، پاکستان) کے بارھویں صدی ہجری کے ایک شاعر شاکر کے کلام کا مجموعہ ہے، انھوں نے اس زمانہ کے دستور کے مطابق فارسی زبان کو اظہار خیالات کا وسیلہ بنایا ہے، اور عربی اور اردو میں بھی داد سخن دی ہے، اس میں اردو کی دو غزلیں شامل ہیں، شاکر نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، غزلوں کا حصہ زیادہ ہے، شروع میں حمد، مناجات و منقبت اور آخر میں قطعات و رباعیات، مرثیے، مثنوی اور قصائد بھی ہیں، شاکر صاحب دل شاعر تھے، اسلیے کلام میں عشق مجازی سے زیادہ عشق حقیقی کی گرمی اور مذہبی رنگ پایا جاتا ہے، اس مجموعہ سے ان کی قدرت کلام اور جوش بیان کا اندازہ ہوتا ہے، مگر احتیاط و عقیدت کی بنا پر پورا کلام بلا انتخاب شائع کیا گیا ہے جس میں پست و بلند ہر قسم کے شعر آگئے ہیں، ابتدا میں شاکر کے مختصر حالات اور خصوصیات کلام بھی تحریر کیے گئے ہیں، ایک گمنام شاعر کے کلام کی تلاش و جستجو اور اس کی اشاعت ایک ادبی خدمت ہے۔

"ض"

مصنفات سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے

۱- بزم تیموریہ : تیموری بادشاہوں شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے شعراء و فضلاء کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل ۴۰۴ صفحے قیمت

۲- بزم مملوکیہ : ہندوستان کے غلام سلاطین کی علم نوازی، علم پروری، اور اس دور کے علماء و فضلاء و ادباء کے علمی کمالات و ادبی و شعری کارنامے۔ ۲۵۰ صفحے قیمت

۳- بزم صوفیہ : عہد تیموریہ سے پہلے کے اہل قلم و صاحب ملفوظات صوفیائے کرام کے حالات و تعلیمات و ارشادات بکثرت اضافوں کے ساتھ نیا ایڈیشن قیمت

۴- ہندوستان عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک

تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی سیاسی تمدنی و معاشرتی تاریخ، ہندو مسلمان مورخوں کے قلم سے۔ ۵۰۶ صفحے، قیمت: ۲۵/

۵- ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے فوجی اور حربی نظام کی تفصیل ملیگی۔ ۵۰۰ صفحے قیمت: [illegible]

۶- ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے مختلف تمدنی جلوے پیش کئے گئے ہیں، ۵۰۰ صفحے، قیمت: [illegible]

۷- ہندوستان کے سلاطین علماء و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

ضخامت :- ۲۲۸ صفحے، قیمت :- [illegible]

۸- ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں

ہندوستان سے متعلق امیر خسرو کے جذبات و تاثرات قیمت: [illegible]

۹- ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں

(جلد اول) ۲۴۲ صفحے، قیمت: [illegible]

۱۰- عہد مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں

مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارنامے مغلیہ عہد کے جدید عہد کے مسلمان اور ہندو مورخین کی اصلی تحریروں اور کتابوں کی روشنی میں، ۲۰۶ صفحے، قیمت: [illegible]

منیجر دار المصنفین اعظم گڑھ

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰)

اگست ۱۹۷۱ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

....‹›‹›‹›....

قیمت دس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

(کتبہ سید اقبال احمد)

مجلسِ ادارت

۱۔ جناب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی،

۲۔ جناب ڈاکٹر عبد الستار صاحب صدیقی الٰہ آبادی،

۳۔ شاہ معین الدین احمد ندوی،

۴۔ سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات و احکام و قوانین کے لحاظ سے بلا تفریق مذہب و ملت نسل و رنگ زاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے، اور اسی کو اختیار کرنے اور اسی کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے یہاں سے اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے حقوق جن میں اہل کتاب اور مشرکین عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب داخل ہیں، اور حیوانات کے حقوق، اور ان سب کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات ان کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں ان کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا ہے۔

((مرتبہ))

شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت: ۳۲۰ صفحے قیمت: ۳؎

جلد ۱۰۸۔ ماہ جمادی الاخری ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۷۱ء۔ عدد ۲

مضامین

مقالات

تلخیص وتبصرہ

ادبیات

شذرات

افسوس ہے کہ گذشتہ دو مہینوں کے اندر، اردو کے پرانے خدمت گذار خیر بہوروی اور نامور شاعر تسکین قریشی مرحوم نے انتقال کیا، خیر صاحب کی زندگی کا بڑا حصہ اردو کی خدمت میں گذرا، وہ برسوں انجمن ترقی اردو ہند سے وابستہ رہے، مولوی عبد الحق صاحب اور قاضی عبد الغفار صاحب مرحوم کے زمانہ میں انکی حیثیت اسسٹنٹ سکریٹری کی تھی، وہ محض انجمن کے تنخواہ دار ملازم نہ تھے، بلکہ ان میں اردو کی خدمت کی لگن تھی جس سے انجمن کے کاموں کو بڑا فائدہ پہنچا، انکی کوشش سے بعض مقامات پر اردو کانفرنسیں بھی ہوئیں، صاحب قلم بھی تھے، اور کبھی کبھی ادبی مضامین بھی لکھتے تھے، انجمن سے الگ ہونے کے بعد لکھنؤ میں میر اکیڈمی اور غالب اکیڈمی قائم کیں، جن سے حدیث میر اور مرقع غالب شائع کیں، باہر کے جو ادیب لکھنؤ آتے تھے، ان کو اکیڈمی میں مدعو کرتے تھے، اور بڑے شوق سے اس کے کاموں کو دکھلاتے تھے، ان کو جس پہلو سے بھی اردو کی خدمت کا موقع ملتا تھا، اس سے فائدہ اٹھاتے، اور انھوں نے اپنی بساط سے زیادہ اردو کی خدمت انجام دی، طبعاً بھی خلیق و شریف تھے، اللہ تعالیٰ اس شیدائے اردو کی مغفرت فرمائے۔

تسکین قریشی غزل گو شعرا میں نہایت ممتاز اور تغزل میں جگر کے صحیح جانشین تھے، وہ ملازم پیشہ تھے، اس لیے پیشہ ور شعرا کی کمزوریوں سے ان کا دامن پاک تھا، اور اپنی اخلاقی بلندی کے اعتبار سے شعرا کی آبرو تھے، طبعاً خاموش، عزلت پسند اور شہرت طلبی سے دور تھے، مشاعروں میں بھی بہت کم شریک ہوتے تھے، اور اخبارات و رسالوں میں بھی اپنا کلام اشاعت کے لیے کم بھیجتے تھے، اس لیے ایک عرصہ تک ان کو وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے، لیکن آخر میں ان کے کلام کی نکہت صاحب ذوق طبقہ میں پوری طرح پھیل گئی تھی، راقم کو ان کے کلام کا اندازہ ان کے دوسرے مجموعۂ کلام "گلگونہ" کی اشاعت کے بعد ہوا، ان کی شاعری خیالات کی لطافت و پاکیزگی اور زبان کی نفاست و سلاست کا نمونہ ہے، نعتیں بھی بڑی پرکیف کہتے تھے، ان سے ملاقات کی نوبت کبھی نہیں آئی، مگر کبھی کبھی وہ اپنا کلام معارف میں اشاعت کے لیے بھیجتے تھے، اس سلسلہ میں ان سے خط و کتابت رہتی تھی،

اور ان سے ایسے تعلقات ہو گئے تھے کہ انھوں نے اپنے آخری مجموعۂ کلام سرمایۂ تسکین کا مقدمہ راقم سے باصرار لکھوایا، وہ راسخ العقیدہ اور پابند مذہب مرد مومن تھے، انکی موت سے ایک نامور اور شائستہ غزلگو شاعر اٹھ گیا، اللہ تعالیٰ اس صاحب دل شاعر کی مغفرت فرمائے۔

مسز اندرا گاندھی نے الیکشن کے زمانہ میں اردو زبان اور تعلیمی اداروں کے بارہ میں جو وعدے کیے تھے، اس کے نتیجہ میں اردو کے لیے فضا سازگار ہونے کے کچھ آثار ہیں، چنانچہ اتر پردیش کی حکومت نے مختلف شعبوں میں اردو کو جو سہولتیں دی ہیں یا دینے والی ہے، اس کی تفصیل شائع کی ہے، لیکن اصل سوال ان پر عمل کا ہے، اس سے پہلے کی حکومتیں بھی اس قسم کی سہولتوں کا اعلان کر چکی ہیں، مگر عملاً اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا، اس میں حکومت کا قصور رہا یا ماتحت عملہ کا، مگر اس کی اصل ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے، اگر وہ سنجیدگی سے کوئی حکم نافذ کرنا چاہے تو ماتحت عمال اس کو نظر انداز کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے، آخر اردو ہی کے معاملہ میں ان کی یہ آزادی کیوں ہے، بہرحال اس قسم کے وعدے تو بہت سننے میں آچکے ہیں، اس نئے وعدہ کا بھی تجربہ کرنا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک پہلو قابل غور ہے، اردو کے حقوق میں اصل اور بنیادی مسئلہ اس کی تعلیم کا ہے، جب تک یہ خاطر خواہ طریقہ سے حل نہیں ہوتا، اردو کو جو حقوق بھی ملیں گے ان سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب بقدر ضرورت اردو کی تعلیم لازمی کر دی جائے، طلبہ کی تعداد کی شرط سے اسکولوں کے منتظمین کو اس کی تعلیم میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرنے کا موقع ملتا ہے جس سے مطلوبہ تعداد پوری نہیں ہونے پاتی، اردو کے اساتذہ اور اور نصاب کی کتابیں بھی نہیں ملتیں، اگر کسی طرح ان دشواریوں پر قابو بھی پا لیا جائے تو

یہ واقعہ ہے کہ اردو پڑھنے والے طلبہ صرف مسلمان ہوتے ہیں، جن کا ملازمتوں میں بہت کم گذر ہے اور اعلیٰ عہدوں پر تو خال خال ہی نظر آتے ہیں، اور ان کی تعداد روز بروز گھٹتی جاتی ہے، ہندو طلبہ میں ہزاروں میں مشکل سے دو چار اردو پڑھنے والے نکلیں گے، اور یہی ملازمتوں میں جاتے ہیں، جو اردو سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں، اس لیے عدالتوں اور دوسرے شعبوں میں اردو کو جو حقوق ملیں گے اسکے سمجھنے والے کہاں ہونگے، اردو کے ٹرینڈ اساتذہ تک مشکل سے میسر آئیں گے، اسی لیے اردو کے بارہ میں حکومت جو ہدایتیں جاری کرتی ہے ان پر عمل نہیں ہو پاتا، اس کا حل صرف یہ ہے کہ آٹھویں جماعت تک اردو کی تعلیم لازمی کر دیجائے، اسکے بغیر اردو کو دی ہوئی سہولتوں سے بہت کم فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، اس سے ہندی کی برتری میں کوئی فرق نہیں آتا، وہ تو حکومت کی مسلمہ زبان ہے اور شروع سے آخر تک لازمی ہے، قومی یکجہتی کے نقطۂ نظر سے بھی ضروری ہے کہ ہندی اور اردو والوں میں جو دوری اور بیگانگی ہے وہ دور کیجائے، اسکا ایک بڑا ذریعہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی زبان سے واقف ہوں۔

اقلیتی اداروں میں سب سے بڑا مسئلہ مسلم یونیورسٹی کے کردار کے تحفظ کا ہے، اس کا بل غالباً جلد ہی پیش ہو، اسکے متعلق اتنا لکھا جا چکا ہے کہ مزید تفصیل کی ضرورت نہیں، حکومت بھی پوری طرح سمجھتی ہے کہ کردار کا مقصد کیا ہے، اور وہ کس طرح محفوظ رہ سکتا ہے، سپریم کورٹ کے فیصلہ کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا، وہ بھی اپنی جگہ قانونی حیثیت سے صحیح ہے، اور یہ بھی واقعہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں نے قائم کی ہے، اور اس کے دروازے اگرچہ غیر مسلموں کے لیے کبھی بند نہیں رہے لیکن اس کا خاص مقصد مسلمانوں کی ایسی تعلیم ہے جس سے جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ انکی ملی خصوصیات بھی قائم رہیں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب یونیورسٹی کا نظم و نسق مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہے، حکومت کی کم سے کم مداخلت ہو، محض مسلم کے لفظ سے کوئی فائدہ نہیں ہے، یوں تو مسلمانوں کی بہت سی شکایتیں اور مطالبات ہیں، ان میں دو زیادہ اہم ہیں، اردو کا حق اور مسلم یونیورسٹی کے کردار کا تحفظ اگر یہ دونوں مطالبے پورے ہو جائیں تو مسلمان بڑی حد تک مطمئن ہو جائیں، گذشتہ الیکشن میں محض مسز اندرا گاندھی کی شخصیت کی بنا پر کانگریس کو مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہوا تھا جس سے اس کو بڑا فائدہ پہنچا، اس لیے اس اعتماد کو قائم رکھنے کی سب سے زیادہ ذمہ داری ان ہی پر عائد ہوتی ہے، اور وہ ان دونوں مطالبوں کو پورا کر کے اس اعتماد کو قائم رکھ سکتی ہیں۔

مقالات

ملا عبد القادر بدایونی

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

ملا عبد القادر کی ولادت ۹۴۷ھ (۱۵۴۰ء) میں ٹونڈہ، بساور ضلع بدایوں میں ہوئی، ان کے والد کا نام ملوک شاہ تھا، خود ملا صاحب ان کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ وہ "بحرِ علم" "معدن احسان" اور "کان فضل" تھے (منتخب التواریخ ج ۱ ص ۵۳) ملا صاحب کا بیان ہے کہ جب ان کی عمر بارہ[12] سال کی تھی تو وہ اپنے والد ماجد کے ساتھ سنبھل گئے، اور میاں حاتم سنبھلی کی خدمت میں حاضر ہوئے، جو بہت بڑے عالم اور صوری اور معنوی کمالات کے حامل تھے، شیخ عزیز اللہ طلبنی سے بیعت تھے، ان کی خانقاہ میں رہ کر ملا صاحب نے قصیدہ بردہ کا درس لیا، ان سے تبرکاً حنفی فقہ کی کتاب کنز کے چند سبق بھی پڑھے، جب وہاں سے رخصت ہونے لگے تو میاں حاتم سنبھلی نے ان کو اپنے مریدوں میں داخل کر لیا، اور شیخ عزیز اللہ کی طرف سے کلاہ اور شجرہ بھی عطا کیا، تاکہ ان کو علوم ظاہری کا بھی فائدہ ہو (منتخب التواریخ ج ۳ ص ۳) ملا صاحب نے سنبھل ہی میں قرآن پاک کی قرأت میر سید محمد مکی سے سیکھی، جو سات قرأتوں کے قاری تھے (ج ۲ ص ۲۱)۔ انھوں نے عربی علوم کی تحصیل اپنے نانا مخدوم اشرف سے بھی کی، (ج ۲ ص ۲۲)، کافیہ بیانہ کے ایک عالم شیخ سعد اللہ نحوی سے پڑھی، شرح شمسیہ مرزا سمرقندی سے اور وقایہ ابو المعالی سے پڑھی،

چندے شیخ ابوالفتح تھانیسری کے حلقۂ درس میں بھی رہے، شیخ عبداللہ بدایونی سے کلام، تحقیق اور اصول فقہ کی شرحیں پڑھیں (ج ۳ ص ۱۲۹، ۱۵۱، ۱۴۹) اپنی فطری ذہانت اور صلاحیت سے فارسی، عربی، سنسکرت، تفسیر، تاریخ، شعر، ادب، حساب، موسیقی اور تاریخ گوئی میں بڑی مہارت پیدا کی، اور اپنے زمانہ کے جلیل القدر اہل علم ہوئے، جس کے معترف اس زمانہ کے اربابِ کمال بھی ہیں، فیضی ان کے فضل وکمال کا بڑا قدردان تھا، اپنے ایک خط میں لکھتا ہے:-

"با فضیلت علمی طبع نظم وسلیقۂ انشای عربی وفارسی وچیزے از نجوم ہندی وحساب یادداشت
در ہمہ وادی دو قوت در نغمہ ولایت وہندی وچیزے از شطرنج صغیر وکبیر دارد (ج ۲ ص ۲۰۲)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ان کو بہت عزیز رکھتے، وہ جب ان سے ملتے تو ان کے شوق واشتیاق کی پیاس نہ بجھتی بلکہ اور بڑھ جاتی، ان کی ملاقات میں روحانی اور ربانی لذت محسوس کرتے، اپنے ایک مکتوب میں ان کو لکھتے ہیں کہ خدا کے لیے مجھ پر اپنے اسرار کے قافلہ کی راہ بند نہ کیجئے، اور اگر یہ راستہ ان کی طرف بند ہوگا، تو پھر ادھر سے بند نہیں کیا جائے گا۔

از برائے خدا بر من قافلۂ اسرار خود راہ نہ بندند، واگر از آں طرف بندند، ازیں طرف بستہ نخواہد شد (ج ۳ ص ۱۱۷)

ملا صاحب کے ایک اور معاصر بزرگ شیخ یعقوب کشمیری تھے، اکبر ان کے علمی فضائل اور روحانی کمالات کا بڑا قدردان تھا، وہ ملا صاحب کو دوانی سے افضل تر سمجھتے تھے، لکھتے ہیں

از دوانی بداؤنی بے شک در فنون فضیلت است فزوں (ج ۳ ص ۱۴۴)

بختاور خاں عالمگیری مراۃ العالم میں لکھتا ہے:-

"ملا عبدالقادر بدایونی جامع معقول ومنقول وبا فضیلت علمی طبع نظم وسلیقہ انشائے عربی

وفارسی ونجوم وحساب وو قوف در نغمۂ ولایتی وہندی بمرتبۂ کمال داشت قادری تخلص بود"

جس علمی و ادبی مجلس میں پہنچ جاتے، اپنی لیاقت اور فضیلت کا سکہ جما دیتے، ان کے زمانے میں شیخ احمدی فیاض امیٹھی وال بڑے متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے، اکثر درسی کتابیں پڑھایا کرتے، ایک بار ملا صاحب ان سے ملنے گئے تو وہ شرح وقایہ کا درس دے رہے تھے، ان کا ایک شاگرد ذیل کا ایک ہزلیہ قطعہ پڑھ رہا تھا:

ابو بکر الولد المنتجب	اراد الخروج لامر عجب
فقد قال انی عزمت الخروج	لکفارۃ ہی لی ام اب
فقلت الم تسمعن یا بنی	بنہی اتی عن تلقی الجلب

اس قطعہ میں یہ شک پیدا ہو گیا تھا کہ لفظ کفتارہ ہے یا کفارہ جو کا فر کی تانیث میں مبالغہ کا صیغہ ہے، شیخ احمدی فیاض نے فرمایا معنی کے لحاظ سے کفارہ ہوگا، کفتارہ کا لفظ تو فارسی ہے۔ ملا صاحب بیچ میں بول اٹھے کفتارہ کو کفارہ سے کہیں زیادہ ترجیح ہے (ج ۳ ص ۸۴)

اکبری دربار میں شمس الدین حکیم الملک حکمت و طب میں جالینوس زمان اور مسیح دوران سمجھے جاتے تھے، طب کے علاوہ علوم نقلی کے بھی عالم تھے، اپنے مذہبی عقیدہ میں بڑے راسخ رہے ہمیشہ طالب علموں کو سبق پڑھاتے رہتے، ان کے اخراجات خود برداشت کرتے، ایک دن وہ شیخ سلیم چشتی کی محفل میں بیٹھے علمی گفتگو کر رہے تھے۔ اثنائے گفتگو میں بو علی سینا کی خوبیاں بیان کرنے لگے، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ علماء اور حکماء ایک دوسرے سے الجھ کر اپنے اپنے مسلک کی خاطر مجادلہ و مناقشہ کیا کرتے تھے،

ملا صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ کسی کو پہچانتے نہ تھے، بحث کے موضوع سے واقف ہوئے بغیر اس وقت انھوں نے شیخ شہاب الدین سہروردی کے یہ اشعار پڑھ دیے:۔

وکم قلت للقوم انتم علی شفا حفرۃ من کتاب الشفا
فلما استہانوا بتوبیخنا فرغنا الی اللہ حسبی کفا
فماتوا علی دین ارسطالیس وعشنا علی ملۃ المصطفیٰ

(ہم نے کتنا کہا کہ تم لوگ کتاب الشفا کی وجہ سے ہلاکت کے گڑھے کے کنارے ہو، لیکن جب وہ لوگ ہماری سرزنش کو حقیر سمجھے تو ہم نے یہ کہا کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے۔ یہ لوگ تو ارسطو کے دین کی طرف مائل ہو گئے اور ہم لوگوں نے ملت مصطفوی کی زندگی بسر کی)

مزید تائید کے لیے مولانا جامی کا یہ شعر پڑھ کر سنایا:

نور دل از سینۂ سینا مجوی روشنی از چشم نابینا مجوی

یہ تمام اشعار سن کر حکیم الملک گیلانی بہت برہم ہوئے، شیخ سلیمؒ نے ملا صاحب سے فرمایا "ان لوگوں میں پہلے ہی آگ لگی ہوئی تھی، تو نے آکر اور بھی بھڑکا دیا" (ج ۳ ص ۱۷۲۔۱۷۱)

تعلیم کی فراغت کے بعد ملا صاحب نے کچھ دنوں اکبر کے ایک امیر محمد حسین خاں کے یہاں ملازمت کی جس کو کانت وگولہ (ضلع سہارنپور) کی جاگیر دی گئی تھی، یہاں انکے سپرد صدارت اور فقرا کی خدمت کی گئی، ایک روز وہ قنوج کے مضافات میں مکن پور حضرت شاہ مدار کی زیارت کے لیے گئے، وہاں کسی معشوق کے دام میں پھنس گئے اور بقول ان کے اس شہوت و آز کو عشق سمجھ بیٹھے، اس واقعہ کو یاد کر کے لکھتے ہیں کہ وہ بھی انسان تھے، انسان ہی کا کچا دودھ پیا تھا، غفلت جبلی سے بالاتر نہیں ہوسکے۔

ان پر جہالت کا پردہ پڑ گیا، درگاہ میں جو بے ادبی ہوئی اس کا بدلہ دنیا ہی میں مل گیا، اور خداوند تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ بھی، ان کے معشوق کی قوم کے چند افراد نے ان پر حملہ کیا، اور تلوار سے ان کے سر، ہاتھ اور کندھے پر نو زخم لگائے، جان جانے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی، لیکن خدا کا شکر ہے کہ جان بچ گئی، اس شکرانہ میں یہ اشعار لکھے ہیں:

القصہ ہرانچہ کرد گردون ازجفا — حق باید گفت بود دون حق ما

شکرانہ نعمتش نمی کرد ہیچ — تا لاجرم فگند در رنج وبلا

اس مصیبت میں منت مانی کہ اچھے ہو کر حج کریں گے، لیکن پوری نہ کر سکے جس کا افسوس ان کو زندگی بھر رہا، اس سلسلہ میں احسان شناسی کے جذبہ میں اپنے آقا حسین خاں کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس نے باپ اور بھائی کی طرح ان کی خدمت کی۔ اور اس کے لیے برابر دعا گو رہے، اس کی مذہبیت، شجاعت، سخاوت، سادگی، انکسار اور بے نیازی کی بڑی تعریف اپنی تاریخ میں کی ہے (ج ۲ ص ۲۲۴، ۲۴۴ و ۱۳۷-۱۳۶)

ملا صاحب نے اپنے عشق کو جو ان کے خیال میں محض شہوت وار تھا، جس بے تکلفی سے بیان کیا ہے، وہ ان کی صاف گوئی اور حق گوئی کی دلیل ہے، یہی انکی سیرت کا لازمی جزبنا رہا۔

ملا صاحب حسین خاں کے یہاں تقریباً نو سال ملازم رہے، ۹۸۱ھ (۱۵۷۳ء) میں اکبر کے دربار سے وابستہ ہوئے، اس وابستگی کا حال اس طرح لکھتے ہیں:۔

"ماہ ذی الحجہ کے آخر میں یہ فقیر اپنی تقدیر سے جو تدبیر کے پاؤں کی زنجیر ہے حسین خاں کی ملازمت سے علحدہ ہو کر بدایوں سے آگرہ آیا، جہاں خاں قورچی اور جالینوس مرحوم حکیم عین الملک کے وسیلہ سے شاہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا، ان دنوں علم کی بڑی قدردانی تھی، پہلی ہی دفعہ شہنشاہ سے تخاطب کا شرف حاصل ہوا، اور ہم نشینوں

یں داخل کر لیا گیا، علما اپنے تبحر کا ڈنکا بجاتے رہتے کسی دوسرے کو نظر میں نہ لاتے،
بحث و مباحثہ کر کے اپنے کو ممتاز دکھانے کی کوشش کرتے، خداوند تعالٰی کی عنایت
سے میں اپنی قوت طبع، ذکاوت فہم اور دلیری سے جو کہ جوانی کے زمانے کی لازمی چیزیں
ہیں، ان میں اکثر پر غالب آگیا۔ جب میں دربار میں حاضر ہوا تھا تو شہنشاہ نے میری تعریف
کی تھی کہ بدایوں کا یہ عالم حاجی ابراہیم سرہندی کی سرکوبی کرے گا، شہنشاہ کی خواہش
تھی کہ حاجی ابراہیم کو نیچا دکھایا جائے، اس لیے میں نے بھی ان پر طرح طرح کے الزامات
رکھے جن کو شہنشاہ نے پسند کیا۔ شیخ عبدالنبی صدر الصدور کے پاس میری رسائی نہ تھی،
اس لیے وہ مجھ سے ناخوش رہے۔ مناظرہ کے وقت میرے فریق کی طرفداری کرتے اور
یہ مثل صادق آئی کہ سانپ کا کاٹا افیون کھانے لگا، لیکن رفتہ رفتہ ان کی کلفت الفت
میں بدل گئی۔ ان ہی دنوں شیخ مبارک ناگوری کا لڑکا شیخ ابوالفضل بھی باریاب ہوا،
اس کی دانشوں اور ہوشمندی کا ستارہ خوب چمک رہا تھا، اس لیے گوناگوں نوازشوں
سے ممتاز ہوا۔" (منتخب التواریخ، جلد دوم، ص ۷۳ - ۱۷۲)

۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) کے جمادی الآخر میں اکبر جب قنوج میں مقیم تھا، تو اس نے ملا صاحب
سے سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ فارسی میں کرنے کی فرمائش کی، انھوں نے اس کا ترجمہ کیا تو اکبر کو
پسند آیا، اور اس کا نام خرد افزا رکھا گیا (ص ۱۸۳)۔ لکھتے ہیں کہ اکبر نے اس ترجمہ کو
اپنے شاہی طبیب حکیم الملک گیلانی کو پڑھنے کے لیے دیا، اور پھر پوچھا کہ اس کی تحریر و انشا
کیسی ہے، تو انھوں نے کہا کہ اس کی عبارت تو فصیح ہے، لیکن پڑھنے میں کچھ اچھی نہیں معلوم
ہوتی (ص ۱۹۱، ج ۲)، پرکھوتم نامی ایک برہمن نے اس کی ایک شرح بھی لکھی (ج ۲ ص ۲۰،۳۲۰)
۹۸۳ھ (۱۵۷۵ء) شاہی عبادت خانہ کی تعمیر ہوئی۔ ملا صاحب اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ

اس وقت تک اکبر کو بڑی بڑی فتوحات حاصل ہو چکی تھیں، اس کی سلطنت کے حدود میں اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا، اس کی حکومت کا نظم ونسق اس کی مرضی کے مطابق ہوتا گیا اور جب ملک میں اس کا کوئی دشمن نہ رہا تو اس کا رجحان عبادت وریاضت کی طرف ہوگیا، اس کی صحبتیں اجمیر کے مجاوروں اور درویشوں کے ساتھ رہنے لگیں، اس کا زیادہ تر وقت اللہ اور رسول کے تذکرہ میں گزرنے لگا، اس کی مجلسوں میں صوفیانہ یا فقہی اور علمی مباحث ہونے لگے، وہ رات کے وقت مراقبے میں بیٹھتا، "یا ہو" یا ہادی کا وظیفہ بھی پڑھتا، جب عبادت خانہ کی تعمیر ہوئی، تو علما، اور مشائخ اس میں آکر علمی اور مذہبی مذاکرے کرتے، لیکن ملا صاحب کا بیان ہے کہ اس عبادت خانہ میں سادات، مشائخ اور علما، آپس میں جھگڑنے لگے، نشست کی تقدیم وتاخیر پر بھی لڑائی ہوئی، بالآخر بادشاہ نے سب کی جگہیں متعین کردیں، پھر بھی ہنگامہ برپا رہتا ایک رات بڑا شور وغل ہوا تو اکبر نے ملا صاحب سے کہا جو شخص بھی نامعقول بات کہے اس کی اطلاع دو، اس کو اس مجلس سے اٹھا دیا جائے گا، یہ سن کر ملا صاحب نے کہا کہ اس طرح تو سب ہی کو اٹھوانا پڑے گا۔ (منتخب التواریخ جلد دوم ص ۲۰۲)

مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری کو ہمایوں نے شیخ الاسلام بنایا تھا، لیکن ملا صاحب کا بیان ہے کہ وہ کنجوسی، رذالت، خباثت، مکاری اور دنیاداری کی وجہ سے ذلیل سمجھے جاتے، شیخ عبدالنبی صدر الصدور تھے لیکن ان کے غرور وتکبر کی وجہ سے انکی کوئی عزت نہ تھی، ملا صاحب کا بیان ہے کہ ان ہی علما، کی حرکتوں کو دیکھ کر وہ اسلام سے برگشتہ ہوتا گیا۔

اکبر ملا صاحب کی فضیلت، مذہبیت اور خوش گلوئی سے متاثر ہوا تو اس نے امامت کی خدمت

ان کے سپرد کی اور اسی کے ساتھ بیستی کا عہدہ دینا چاہا، اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:۔

"بادشاہ نے مجھکو امام بنایا، اور حکم دیا کہ داغ کی خدمت بھی انجام دوں، اور کچھ خرچ دیکر فرمایا کہ بیستی عہدہ کے مطابق میں بھی گھوڑوں کا داغ کراؤں، اسی زمانہ میں شیخ ابوالفضل بھی دربار میں پہنچ گیا تھا، شبلیؒ نے جنیدؒ کے متعلق کہا تھا کہ ہم دونوں ایک ہی تنور سے نکلے ہیں، یہی حال میرا اور ابوالفضل کا تھا، لیکن وہ ہوشیار اور زمانہ ساز تھا، اس کو بھی جب بیستی کا عہدہ دیا گیا تو اس نے داغ اور محلہ کرا کے اپنی ملازمت مضبوط کرلی اور منصب دو ہزاری کے عہدہ اور وزارت تک پہنچ گیا، اس کے برعکس اس فقیر نے اپنی ناتجربہ کاری اور سادہ لوحی کی وجہ سے اس نوکری کو قبول نہ کیا۔۔۔۔۔

اور اس خام خیالی میں رہا کہ بجائے ملازمت کے مدد معاش کے لیے کوئی آراضی وغیرہ عنایت ہوجاتی تو گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر علمی خدمات میں مصروف رہے گا۔ (منتخب التواریخ ج ۲ ص ۲۰۹)

اکبر کے حکم سے ملا صاحب اتھربن کے ترجمے میں لگ گئے (ج ۲ ص ۲۱۲)۔ ۹۸۴ھ (۱۵۷۶ء) میں جہاد کے شوق میں رانا کیکا (رانا پرتاب) کے خلاف لڑنے کے لیے شاہی لشکر میں شریک ہوئے (ج ۲ ص ۲۳۳) اور وہاں سے واپس ہوئے تو مان سنگھ کی طرف سے رانا کا نامور ہاتھی "رام پرشاد" لاکر اکبر کی خدمت میں پیش کیا، جس سے خوش ہوکر اکبر نے ان کو مٹھی بھر اشرفیاں انعام میں دیں، جو تعداد میں ۹۶ نکلیں (ج ۲ ص ۲۴۳)، اسی سال انھوں نے دیالپور میں اکبر کو کلام پاک کا ایک چھوٹا سا نسخہ اور وعظ و خطبہ کی ایک بیاض پیش کی (ج ۲ ص ۲۴۹) ۹۸۵ھ (۱۵۷۷ء) میں ملا صاحب نے دربار سے پانچ مہینے رخصت لیکر اپنے وطن بساور گئے، وہاں ایک سال رہ گئے، جس سے اکبر ان سے ایسا بدظن ہوا کہ ان کی طرف سے بے توجہ ہوتا چلا گیا، جس کی کھٹک ملا صاحب زندگی بھر محسوس کرتے رہے۔ (ج ۲ ص ۲۵۴)

اسی اثنا میں ملا صاحب کا بیان ہے کہ عبادت خانہ میں علماء کی زبانوں کی چھریاں ایسی بے باکی سے چلنے لگیں کہ اکبر اسلام سے دور ہوتا چلا گیا، انھوں نے اکبر کے انحراف کا بڑا اچھا تجزیہ یہ لکھکر کیا ہے :-

> درباری علماء میں کچھ اس طرف اور کچھ اس طرف ہو گئے، ایک دوسرے کو گمراہ اور خبطی بنانے لگے، ان اختلافات کی وجہ سے اہل بدعت کو اپنے فاسد اور باطل خیالات کے ساتھ اپنے کمین گاہوں سے نکلنے کا موقع مل گیا، انھوں نے غلط باتوں کو سچ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ بادشاہ اخلاص کے ساتھ حق کا طالب تھا، لیکن ان پڑھ تھا، کافروں اور ادنی درجہ کے لوگوں سے محبت کرتا تھا، اس لیے ان مباحث کی وجہ سے شک میں پڑ گیا، اس کی حیرت بڑھتی گئی، اپنے اصلی مقصد سے پھر گیا، پھر تو اس کے سامنے سے شرع مبین اور دین متین کی مضبوط دیوار ٹوٹ گئی، پانچ چھ سال میں اسلام کا اثر باقی نہ رہا، سارا تضیہ الٹ کر رہ گیا۔ (ج ۲ ص ۲۵۵)

ملا صاحب نے اکبر کی بے دینی کا سارا الزام علماء کے باہمی اختلافات پر ڈال دیا ہے، وہ اقرار کرتے ہیں کہ اکبر شروع میں طلب حق کا سچا جذبہ رکھتا تھا، اس کی طبیعت میں تحقیق و تجسس تھا، ہر دین اور مذہب کے اعتقادات اور ان کی تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کیا کرتا تھا لیکن اس کے بدعقیدہ مصاحبوں اور جھگڑالو علماء نے اس کا رخ پھیر دیا، علماء کا یہ فرض تھا کہ اس کو صراط مستقیم پر لے جانے کے لیے حق پسندی کا رویہ اختیار کرتے۔ لیکن انھوں نے اپنے اعزاز و رتبہ کو بڑھانے کی خاطر ایک دوسرے کی تکفیر و تذلیل کرنا شروع کیا، ایک ہی مسئلہ کو علماء کا ایک گروہ حرام اور دوسرا حلال کہنے لگا، بادشاہ ان باتوں سے دل برداشتہ ہوتا چلا گیا، دربار میں مختلف مذاہب و مسالک کے گمراہ کن

عناصر موجود تھے، انھوں نے علماء کے ان اختلافات سے فائدہ اٹھایا، اور دین کے معتقدات کو خلافِ عقل ثابت کر کے اکبر کے ذہن کو انکار اور انحراف کی طرف مائل کر دیا۔ (ج ۲ ص ۲۵۵)

اکبر نے پھر جو مذہبی رویہ اختیار کیا، اس کو ملا صاحب نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے، اور یہ صرف ان ہی کی تاریخ منتخب التواریخ میں ملتی ہے، اس کو مختصر طریقہ پر اس طرح درج کیا جا سکتا ہے:

بادشاہ کا خیال ہو گیا تھا کہ حق ہر مذہب اور قوم میں یکساں طور پر موجود ہے (ج ۲ ص ۲۵۹) وہ عقیدۂ تناسخ کا قائل ہو گیا (ج ۲ ص ۲۵۸) شیخ تاج الدین ولد شیخ ذکریا نے وحدت الوجود کی روشنی میں اس کو انسان کامل کا درجہ دیدیا، جس کے بعد اس کے لیے سجدہ تجویز کیا گیا، اور اس کا نام زمین بوس رکھا گیا، چہرۂ شاہی کو کعبۂ مرادات اور قبلۂ حاجات قرار دیا گیا، (ج ۲ ص ۲۵۹) بیربر کے اثر سے دربار میں آفتاب پرستی کا بھی فروغ ہوا، اور آفتاب کو مظہر کامل، سرچشمۂ سعادت، نیر اعظم، عطیہ بخش ہمہ عالم بتایا گیا (ج ۲ ص ۲۶۰) نوروز جلالی کی تعظیم اہتمام سے کی جانے لگی، گائے کا ذبیحہ بھی بند کر دیا گیا، اس کا گوبر پاک سمجھا جانے لگا، گائے کا گوشت کھانا حرام ہو گیا، گاؤکشی کی سزا قتل قرار دی گئی، محل کے اندر یہ سمجھ کر آتشکدہ بنایا گیا کہ آگ بھی خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، اور اس کے انوار کا ایک پرتو ہے۔ اکبر آفتاب کے ساتھ آگ کو سجدہ کرنے لگا۔ وہ پیشانی پر قشقہ لگا کر دربار میں آنے لگا۔ راکھی بھی بندھوانی شروع کر دی۔ وغیرہ وغیرہ (ج ۲ ص ۲۶۱-۲۶۲)

پھر اکبر کے حقِ اجتہاد کے لیے ایک محضر تیار کیا گیا جس کے مطابق اس کو امام عادل قرار دے کر یہ حق دیا گیا کہ وہ اختلافی مسائل میں کسی روایت کو دوسری روایتوں پر ترجیح دے کر اس کے مطابق فیصلہ کر سکتا ہے، اس محضر کو شیخ مبارک ناگوری نے مرتب کیا،

ملا صاحب کے بیان کے مطابق اور علماء نے کراہت کے ساتھ اس پر دستخط کیے، اس کے بعد کسی کو اکبر کی مخالفت کی مجال نہیں رہی، ملا صاحب لکھتے ہیں کہ اکبر کی جسارتیں بڑھ گئیں، اس نے قرآن کو مخلوق قرار دیدیا، وحی کو امر محال کہا، نبوت و امامت کے بارے میں شکوک کا اظہار کیا، فرشتوں، معجزوں اور کرامتوں وغیرہ کا منکر ہو گیا، مرنے کے بعد بقائے ارواح اور عذاب و ثواب کو تناسخ پر منحصر کر دیا (ج ۲ ص ۲۷۳-۲۷۱) ملا صاحب نے شاید خود ہی اس بے راہ روی کی تاریخ "فتنہ ہائے امت" سے نکالی، لیکن تعجب کی بات ہے کہ اس بے دین بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر پھر ملازمت کر لی، جب وہ اس کے پاس آئے تو اس نے ان سے پوچھا کہ کیا ضعف تھا کہ ملازمت ترک کر دی" ان کے بجائے ایک درباری امیر غازی خاں بدخشی نے برجستہ کہا "قسمت کا ضعف تھا"۔ جب وہ شاہی ملازمت سے دوبارہ وابستہ ہو گئے تو ان کی جاگیر بھی بحال ہو گئی (ج ۲ ص ۲۷۵-۲۷۶) مگر دربار سے وابستگی کے بعد اکبر کی بے دینی سے ان کا دل کڑھتا رہا۔ وہ لکھتے ہیں کہ دربار کے کمینے، ذلیل اور عالم نما جاہل علماء نے اکبر کو باور کرایا کہ وہ اس عہد کے صاحب زمان ہیں" اور بعض کتابوں سے یہ شہادت پیش کی ۹۹۰ھ میں باطل کو ختم کرنے والے ایک شخص کا ظہور ہو گا، اور صاحب دین حق کے کلمہ کے حل کے حساب سے ۹۹۰ عدد ہوتے ہیں، اس کی مصداق صرف بادشاہ کی ذات ہے (ج ۲ ص ۲۸۰) ملا صاحب کے بیان کے مطابق اکبر نے اپنے اٹھائیسویں سال جلوس میں یہ اعلان کیا کہ پیغمبر علیہ السلام کی بعثت سے پورے ہزار سال ہو چکے ہیں، آپ کے لائے ہوئے دین کی مدت ختم ہو چکی ہے، اس لیے وقت آگیا ہے کہ ایک نئے دین کا اعلان کیا جائے (ج ۲ ص ۳۰۱)

اس اعلان کے بعد ملا صاحب کے بیان کے مطابق جو احکام جاری کیے گئے ان میں کچھ یہ ہیں:-

سکہ پر الفی تاریخ ثبت کیا جائے، اور یہ ہزار سنہ رسول اللہؐ کی رحلت سے شروع کیا جائے (ج ۲ ص ۳۰۱) بادشاہ کو سجدہ کرنا لازم ہے، شراب جسمانی صحت کی خاطر پی جا سکتی ہے، خاص خاص شرائط کے ساتھ طوائفوں کے یہاں جانے کی اجازت دیدی گئی، (ج ۲ ص ۳۰۲) گائے کے ذبیحہ کی ممانعت کر دی گئی، داڑھی منڈ والے کا عام رواج ہو گیا، داڑھی کی مذمت کی گئی، دربار میں نصاریٰ کی ناقوس نوازی بھی ہونے لگی (ج ۲ ص ۳۰۴) جو کوئی اس دین کو قبول کرتا، اس کو اقرار کرنا پڑتا کہ اپنے باپ دادا کے مجازی اور تقلیدی اسلام سے انکار کرتا ہوں، اور دین الٰہی اکبرشاہی میں داخل ہوتا ہوں، اور اخلاص کے چہارگانہ مراتب یعنی ترک مال و جان و ناموس و دین کو قبول کرتا ہوں (ج ۲ ص ۳۰۴) احکام اسلام کی مخالفت میں سور اور کتے کو پاک قرار دیدیا گیا، غسل جنابت ضروری نہ سمجھا گیا (ج ۲ ص ۳۰۵) موت کے دن مردہ کو ثواب پہنچانے کے لیے کھانا کھلانا بے معنی قرار دیا گیا، اس کے بجائے ولادت کے روز کھانا کھلا کر دعوت کرنے کی ہدایت دی گئی، اور اس کا نام آش حیات رکھا گیا (ج ۲ ص ۳۰۶) شیر اور جنگلی سور کا گوشت حلال کر دیا گیا، چچا، ماموں، اور قریبی رشتہ داروں کی لڑکیوں سے نکاح حرام کر دیا گیا، سونا اور ریشمی کپڑے جائز قرار دیے گئے۔ یہاں تک لکھتے لکھتے ملا صاحب کو غصہ آگیا ہے اور لکھتے ہیں کہ بعض حرام زادوں نے جیسے ملا مبارک کے بیٹے ابوالفضل نے نماز، روزہ اور حج کی مذمت اور تمسخر میں کئی رسالے لکھے، جو بادشاہ کی نظر میں مقبول ہوئے۔

> نماز، روزہ و حج خود پیش ازاں ساقط شدہ بود، بعضی اولاد الزنا چوں پسر ملا مبارک و شاگرد رشید شیخ ابوالفضل رسائل درباب قدح و تمسخر ایں عبادات بدلائل نوشتہ و مقبول افتادہ باعث تربیت گشت (ج ۲ ص ۳۰۶)

عربی کا سنہ ہجری موقوف کر دیا گیا، اس کی جگہ بادشاہ کے سنہ جلوس کی تاریخ لکھی جانے لگی،

عربی پڑھنا عیب ہوگیا، حدیث اور تفسیر پڑھنے والے مطعون ہونے لگے، وغیرہ وغیرہ (ص ۳۰۶ ج ۲)

شاہی دربار کا جب یہ رنگ ہوگیا تو ملا صاحب اس سے بد دل ہوئے، اپنی بددلی اور آزردگی کا حال اس طرح قلمبند کرتے ہیں:۔

جب دربار کا یہ رنگ ہوا تو فقیر گوشۂ عزلت میں بیٹھ گیا

اذ عظم المطلوب قل المتاعب

یعنی جب خواہشات بڑی ہوجاتی ہیں تو مشکلات بڑھ جاتی ہیں،

میں فرار کی آیت کو پڑھتا، بادشاہ کی نظر سے گر گیا، ان کی آشنائی بیگانگی میں تبدیل ہوگئی، لیکن الحمدللہ کہ میں اس حال میں خوش ہوں،

دل در رنگ و بو نشد نیکو شد کہ نشد   جز در تو فرو نشد نیکو شد کہ نشد

گفتی کہ بر نجم از نیکو شد کارت   دیدی کہ نیکو نشد نیکو شد کہ نشد

اپنے کو بادشاہ کی رعایت کے قابل اور نہ انکی خدمت کے لائق سمجھتا تھا،

با تا تکلف بر یک سو نہیم   نہ از تو قیام نہ از ما سلام

کبھی کبھی صف نعال سے کورنش بجا لاتا، اور اہل محفل کا تماشا دیکھ لیتا

کہ صحبت بر نیاید تا موافق نیست مشربہا

اور اس کے بعد یہ حال تھا

دیدم کہ دیدن رخت از دور خوشتر است   صحبت گذاشتم ز تماشائیاں شدم

پھر اور یہ دین الٰہی کی جو تصویر کھینچا ہے، اس کے بارہ میں اسی سلسلہ میں کہہ گئے ہیں کہ حزم و احتیاط کا تقاضا تو یہ تھا کہ میں ان حالات کو نہ لکھتا، لیکن خدائے عز و جل گواہ ہے، اور اس کا گواہ ہونا کافی ہے کہ میرے ان باتوں کے لکھنے کا مقصد

صرف اس دین کے ساتھ درد اور ملت مرحوم اسلام کے ساتھ دل سوزی کا اظہار
کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے، جو عنقا کی طرح کوہ قاف میں اجنبی بن گیا ہے، اور اسکے
بازو کا سایہ اس دنیا کے خاک نشینوں پر سے جاتا رہا ہے، میں تو خدا کی قسم
ملامت، نفرت، حسد اور تعصب سے پناہ مانگتا ہوں (ج ۲ ص ۲۶۴ - ۲۶۳)

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں: (ج ۲ ص ۲۷۹)

میں نے ہر چند چاہا کہ میں صرف تاریخی واقعات کو قلمبند کروں لیکن میرا قلم
بے اختیار ہو کر دوسری طرف بہک جاتا ہے۔ اور اس نئے مذہب اور نئی ملت
کی طرف رخ پھر جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کاش میں اس الجھن سے نجات پا جاتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

خطائی با فلک کردم از تیغ جفا کشتی ‏ ‏ ‏ شبہان مجلس آرائی و جوان مردان یکتا را
زمام حل و عقد خود نہادی در کف قومی ‏ ‏ ‏ کہ از ردی کرم برایشان شرف سگ را
بیان در گوش جانم گفت فارغ باش خوش میزی ‏ ‏ ‏ کہ سلطت برکند ایام ہردہ روزیکیک را

ملا صاحب کی اصلی خواہش یہ رہی کہ ان کو مدد معاش کے طور پر کوئی جاگیر مل جاتی
نوکری نہ کرتے بلکہ توکل و قناعت کے ساتھ ایک گوشہ میں بیٹھ کر علمی کاموں
لگے رہتے، (ج ۲ ص ۴۸، ۲۱۰، ۲۰۲) لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی، مجبوراً
ست کر لیتے پھر جس کے بدلے میں ان کو جاگیر ملتی رہتی (ج ۲ ص ۳۴۲) میر سید محمد
دلی امروہی کے ذکر کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ موروثی تعلقات اور قدیم شفقت کی
وہ مجھ پر بڑے مہربان تھے، میری ملازمت کے ابتدائی دنوں میں برابر کہا کرتے تھے
معاش کے چکر میں نہ پڑو، صدور کی خوشامد کی ذلت نہ اٹھاؤ، بادشاہی ملازمت
داخل ہو کر داغ کرالو، کیونکہ شاہی ملازمین میں بڑی انانیت اور فرعونیت ہوتی ہے،

میں نے ان کی یہ نصیحت قبول نہیں کی، اس لیے مجھے یہ سب دیکھنا پڑا، جو خدا نہ کرے کسی اور کو دیکھنا نصیب ہو (ج ۳ ص ۷۴-۷۵)۔ مدد معاش کے نہ ملنے کی وجہ سے گوشہ نشین نہ ہو سکے، لیکن ملازمت کرکے کڑھتے بھی رہے، ان کو ایک موقع پر اجمیر کی تولیت ملنے والی تھی لیکن نہ ملی، اسی سلسلہ میں وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سلسلہ کی ایک اولاد شیخ حسین کی ریاضت، عبادت، مجاہدہ، توکل و قناعت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی بزرگی کے طفیل میں ان کو شاہی ملازمت سے رہائی مل جاتی، تو شاید (دربار کی) لایعنی گفتاری، پریشان گوئی، بیہودگی، اور دروغ نویسی سے نجات پا جاتے، اور وطن جاکر اپنے اہل و عیال کے ساتھ اور بقیہ عمر مفید کاموں میں صرف کرتے (ج ۲ ص ۱۰۹-۱۰۸)، لیکن ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی، اور وہ شاہی ملازمت سے وابستہ رہے۔

پہلے ذکر آیا ہے کہ ملا صاحب ۹۸۵ھ (۱۵۷۷ء) میں پانچ مہینے کی رخصت پر گئے تو ایک سال تک واپس نہیں ہوئے۔ ۹۸۶ھ (۱۵۷۸ء) میں دربار میں حاضر ہوئے۔ تو اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ جب بادشاہ اجمیر کی حاضری کے بعد فتح پور واپس ہو رہے تھے، تو انھوں نے تودہ کے مقام پر حاضر ہوکر اپنی ایک کتاب چہل حدیث پیش کی جس میں جہاد کی فضیلت اور تیراندازی کے ثواب پر حدیثیں تھیں، اس کا نام بھی تاریخی تھا، بادشاہ نے یہ کتاب کتب خانہ میں داخل کر لی، اور رخصت میں وعدہ خلافی کی تقصیر کا کوئی ذکر نہیں کیا، (ج ۲ ص ۲۵۵-۲۵۴)

انھوں نے ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) میں اکبر کے حکم سے تاریخ الفی کی تدوین میں شرکت کی (ج ۲ ص ۳۱۹-۳۱۸)، ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) میں مہابھارت کے فارسی ترجمہ کرنے

میں بھی شریک ہوئے (ج ۳ ص ۱۱۸) ۹۹۲ھ (۱۵۸۴ء) میں اکبر ہی کے حکم سے راماین کا ترجمہ کرنا شروع کیا، جو ۹۹۶ھ (۱۵۸۸ء) میں ختم ہوا (ج ۲ ص ۳۳۱، ۳۶۶-۳۳۶) ۹۹۸ھ (۱۵۸۹ء) میں اکبر ہی کی فرمائش پر تاریخ کشمیر مترجمہ مولانا شاہ محمد شاہ آبادی کی زبان کو سلیس کر کے اس کا ایک انتخاب تیار کیا (ج ۲ ص ۳۷۴) ۹۹۸ھ (۱۵۸۹ء) میں شاہی حکم کے مطابق معجم البلدان کے دس جزء کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا (ج ۲ ص ۳۷۵)، ۹۹۹ھ (۱۵۹۰ء) میں ان کی والدہ کا انتقال ہوا، تو دربار سے پانچ مہینے کی رخصت لی، اس سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"مجھکو پانچ مہینے کی رخصت ملی، مرزا نظام الدین احمد نے بادشاہ کی خدمت میں میری طرف سے عرض کیا کہ میری والدہ دنیا سے کوچ کر گئی ہیں، میں اپنے بھائیوں اور رشتہ داروں کو تسلی دلاسا دینے کے لیے رخصت چاہتا ہوں، بادشاہ نے خفگی کے ساتھ یہ رخصت دی، اس موقع پر صدر جہاں نے کئی بار مجھ سے کہا کہ بادشاہ کو سجدہ کر دو لیکن میں نے نہیں کیا، بادشاہ نے صرف اتنا کہا کہ گذار دینی جانے دو، لیکن رنجیدہ ہو کر مجھکو سفر خرچ کے لیے کچھ نہیں دیا، میں مرزا کے ساتھ شمس آباد چلا گیا، اور وہاں جا کر بیمار پڑ گیا" (ج ۲ ص ۳۷۶)

ملا صاحب کی اسی انا سے ان کی سیرت کی بلندی کا اظہار ہوتا ہے، وہ اپنی خودداری اپنے علم اور اپنی عالمانہ شان کو شاہی دربار میں گروی رکھ دیتے تو ان کو بھی وہی درباری عزت اور دنیاوی وجاہت و ثروت مل سکتی تھی، جو ان کے معاصر درباری علماء کو ملی، لیکن ان چیزوں کے لیے اپنے انا کو کبھی قربان کرنا پسند نہیں کیا،

وہ وطن گئے تو وقت پر واپس نہ آسکے، اسی اثنا میں شاہی کتب خانہ سے گنگا سنگھاسن بتیسی

کے ان کے فارسی ترجمہ کا نسخہ خرد افزا گم ہوگیا، اس سلسلہ میں ان کو بار بار دربار میں طلب کیا گیا، پھر بھی حاضر نہ ہوسکے، لکھتے ہیں:۔

"شاہی کتب خانہ سے نامۂ خرد افزا کا نسخہ گم ہوگیا، سلیمہ سلطان بیگم نے چند بار بدایوں قاصد بھیجکر طلب کیا لیکن کچھ ایسے موانع تھے کہ جا نہ سکا، آخر حکم ہوا کہ میری مدد معاش موقوف کردیجائے، اور میری مرضی کے خلاف مجھکو طلب کر لیا جائے، اس موقع پر مرزا نظام احمد (خدا ان کو توفیق رحمت کرے) نے دوستی کا پورا حق ادا کیا، شیخ ابوالفضل نے بھی باربار بادشاہ سے کہا کہ کوئی نہ کوئی موانع ضرور درپیش ہیں جن سے میں نہیں آسکا ہوں اور وہاں رہ گیا ہوں (ج ۲ ص ۳۹۴)

اس موقع پر فیضی نے بھی دکن سے بادشاہ کو ملا صاحب کی تائید میں پرزور خط لکھا، جس کا اثر اکبر پر بھی ہوا، ان سفارشات کے بعد ملا صاحب پھر دربار سے وابستہ ہوگئے، اور سنہ ۱۰۰۰ھ (۱۵۹۱ء) میں جامع رشیدی کے ترجمے میں شریک ہوئے، اور سنہ ۱۰۰۳ھ (۱۵۹۴ء) میں بحر الاسمار کا ترجمہ مکمل کیا، جس کے صلہ میں اکبر نے ان کو دس ہزار تنکے اور ایک گھوڑا انعام میں دیا (ج ۲ ص ۴۰۱-۴۰۲)۔ وہ برابر اپنی علمی سرگرمیوں میں مشغول رہے، ان کی ایک اور تصنیف نجات الرشید ہے، جس میں کبیرہ اور صغیرہ گناہوں کی تفصیل ہے (ج ۲ ص ۴۰۰) یہ کتاب انھوں نے مرزا نظام الدین احمد بخشی مؤلف طبقات اکبری کی فرمائش پر لکھی، اس کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ

"این تالیف سبب نجات بر رشید و رشد بر طالب مزید گردد"

ملا صاحب کے تراجم تو زیادہ تر اکبر کے شاہی کتب خانہ کے لیے زینت بن کر رہ گئے لیکن ان کی جو تصنیف سب سے زیادہ مقبول ہوئی وہ ان کی منتخب التواریخ ہے،

یہ انھوں نے گوشۂ عزلت میں بیٹھکر اپنی مرضی کے مطابق لکھی، یہ تین حصوں میں ہے، پہلے میں اکبر سے قبل کے سلاطین ہند کی تاریخ ہے، دوسرے میں اکبری عہد کے سارے واقعات ہیں، تیسرے میں اس عہد کے علما، مشائخ، اطبا اور شعرا کا ذکر ہے۔

پہلے ذکر آچکا ہے کہ ملا صاحب نے خدا کی قسم کھاکر اعلان کیا ہے کہ انھوں نے اس میں جو کچھ لکھا ہے اس میں ملامت، نفرت، حسد اور تعصب کا جذبہ نہیں ہے، وہ اس کتاب کے خاتمہ پر بھی لکھتے ہیں کہ ان کے سودائی قلم نے ان کے جنون کے ہر قطرہ کو صفحۂ قرطاس پر ثبت کر دیا ہے، ان کا یہ جنون شرع مبین کی حمایت اور دین متین کی حمایت میں ظاہر ہوا ہے، ان کو دکھ تھا کہ اسلام کے احکام میں ایسے تغیرات کیے گئے جس کی مثال گذشتہ ہزار سال میں نہیں ملتی، پھر اس زمانہ کے تمام کفریات اور حشویات کو مستحسنات قرار دیکر خوشامد یا دین کی ناواقفیت یا حق پوشی کی بنا پر املا اور انشا کر دیے گئے ہیں، یہ غالباً ابوالفضل کی طرف اشارہ ہے، اسی لیے ملا صاحب نے اپنے مشاہدات قلمبند کرنے شروع کر دیے تاکہ آیندہ لوگ خرافات باطل اور تطویلات لاطائل پڑھ کر تذبذب میں مبتلا نہ ہو جائیں، لکھتے ہیں کہ اور ارباب تصنیف و تالیف تقرب ملوک، استجلاب منافع اور تحصیل مقاصد کی خاطر قلم چلاتے رہے، یہ بھی شاید ابوالفضل ہی پر چوٹ ہے، اس کے بعد کہتے ہیں کہ وہ طمع اور توقع سے بالاتر ہو کر اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے ایک ہدیہ چھوڑنا چاہتے ہیں، تاکہ لوگ اس زمانہ کے حالات و حقائق کے طالب ہوں، اس سے استفادہ کر سکیں،

اگر شراب خوری جرعہ فشان بر خاک ازاں گناہ کہ نفعے رسد بغیر چہ باک

اس کتاب کو لکھتے وقت ان کو ڈر تھا کہ ان کے ساتھ بھی لوگ وہی سلوک کریں گے جو

انھوں نے دوسرے کے ساتھ کیا، (ج ۳ ص ۹۴-۲۹۳)۔ ان کا یہ ڈر صحیح ثابت ہوا، موجودہ دور میں ان پر طرح طرح کے اعتراضات کیے جاتے ہیں،

ان پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ انھوں نے اکبر کی بہت بری تصویر پیش کرکے اسکی سطوت شکنی کی ہے، اور ان کو خود اس کا احساس رہا، اسی لیے اپنی زندگی میں اس کی اشاعت نہ کرا سکے، جہانگیر نے بھی اس کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی تھی لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اسی کتاب میں جب وہ اکبر کی سیاسی اور حربی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس کی شاہانہ سطوت کو برقرار رکھتے ہیں، کہیں اس کی عظمت میں فرق نہیں آنے دیتے، جب جب وہ اس کے یہاں باریاب ہوئے، اس کے ذکر میں بھی شاہانہ آداب کا لحاظ رکھا ہے۔ البتہ اس کے مذہبی عقائد میں ان کا قلم شمشیر برہنہ ہو گیا ہے، اور پھر اکبر ہی پر کیا منحصر وہ تو علماء میں بھی نقص دیکھتے تو ان کے لیے بھی سخت سے سخت الفاظ استعمال کرتے رہے، مثلاً شیخ الاسلام عبد اللہ سلطانپوری کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے یہ حیلہ کرتے کہ ہر سال کے خاتمہ پر اپنا سارا مال بیوی کے نام کر دیتے، اور دوسرے سال کے ختم ہونے سے پہلے اپنے نام واپس لے لیتے، وہ تو ایسے ایسے فریب کرتے کہ بنی موسیٰ یعنی بنی اسرائیل بھی سنکر شرمندہ ہو جاتے، ان کی خست، رذالت، خباثت، مکاری، دنیا داری اور ستمگاری کے بہت سے قصے مشہور ہیں، جو زیادہ تر انھوں نے پنجاب کے علماء، فقراء اور ائمہ کے ساتھ دکھائیں، یہ سب ایک ایک کرکے ظاہر ہونے لگیں، کیونکہ ایک دن راز ظاہر ہی ہو جاتا ہے، پھر تو زبانیں کھل گئیں، ان کی اہانت، استخفاف اور مذمت میں ایک سے ایک قصے سنائے جانے لگے۔ (ج ۲ ص ۲۰۳)

لیکن اسی کے ساتھ وہ عبد اللہ سلطانپوری کے فضائل کے بھی معترف تھے، اپنی

کتاب کی تیسری جلد میں علما کے تذکرے میں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے منفرد اور یگانۂ روزگار عالم تھے، عربی زبان، اصول فقہ، تاریخ اور علوم نقلی میں بڑی مہارت رکھتے تھے، ان کی بڑی اچھی اچھی تصانیف ہیں، جن میں عصمۃ انبیاء اور شرح شمائل النبی بہت مشہور ہیں ...... شریعت کے پھیلانے میں ہمیشہ کوشاں رہے (ج ۳ ص ۷۰)۔ اسی طرح صدر الصدور شیخ عبدالنبی کی تصویر تو ایک طرف اس طرح کھینچتے ہیں کہ جس وقت وہ اپنی مسند جاہ و جلال پر بیٹھ جاتے تو بڑے بڑے امراء اہل علم اور اہل صلاح کو ساتھ لے کر سفارش کے لیے ان کے پاس آتے، وہ ان کی بہت کم تعظیم کرتے، اور جب وہ حد سے زیادہ الحاح و عاجزی کرتے تو ان مدرسوں کو جو ہدایہ اور دوسری منتہی کتابیں پڑھا سکتے تھے، تقریباً سو بگھے کی آراضی منظور کرتے، باقی زمین کو جس پر وہ ایک مدت سے قابض ہوتے، قلمزد کر دیتے، اس کے مقابلہ میں جاہلوں، کمینوں بلکہ ہندوؤں کو اچھی اچھی زمینیں عطا کر دیتے تھے، اس طرح ان کی بدولت علم اور علما، دونوں کی قدر و قیمت روز بروز گھٹتی چلی گئی، وہ اپنے دفتر میں دوپہر کے بعد نہایت غرور سے بیٹھ کر وضو کرتے تو مستعمل پانی کے قطرے بڑے بڑے امیروں اور مقربوں کے سروں اور کپڑوں پر گرتے رہتے، مگر ان کو ذرہ برابر اس کی پرواہ نہ ہوتی (ج ۲ ص ۲۰۵)۔ دوسری طرف ان کے بارہ میں یہ بھی لکھ کر ان کی فضیلت کا اعتراف کیا ہے کہ وہ شیخ احمد بن شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے بیٹے تھے، چند بار مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ جا کر حدیث کا علم پڑھا، وہاں سے واپس آئے تو اپنے آبا و اجداد کی روش کے مطابق سماع اور غنا کے منکر رہے، اور محدثین کے طریقہ پر عمل کرتے تھے، تقوی، طہارت، پاکبازی اور عبادت میں مشغول رہتے تھے، جب منصب صدارت کو پہنچے تو ہر جگہ مدد معاش میں زمین دی، وظائف مقرر کیے، اوقاف قائم کیے، کسی اور بادشاہ

کے زمانہ میں ایسا صدر نہ ہوا ہو گا، انھوں نے جتنے اوقاف قائم کیے کسی اور صدر نے اس کا دسواں حصہ بھی نہ کیا ہو گا (ج ۳ ص ۸۰-۹۷) لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بعد میں ان کا طرزِ عمل بدل گیا۔

شریف آملی کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ مردود و مطرود پاؤں جلے کتے کی طرح ایک دیار سے دوسرے دیار میں مارا پھرتا، ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتا، سب سے جھگڑتا، یہاں تک کہ اس نے الحاد کا راستہ اختیار کیا، کچھ عرصہ صوفیوں کے بھیس میں بلخ جا کر مولانا محمد زاہد کی خانقاہ میں جو کہ شیخ حسین خوارزمی قدس اللہ سرہ کے پوتے تھے، درویشوں کے ساتھ رہا، درویشی سے اس کو کوئی تعلق نہ تھا، اس لیے وہ درویشوں کے ساتھ ہرزہ سرائی اور بیکار قسم کی نوک جھونک کرتا رہتا، پریشان ہو کر لوگوں نے اس کو خانقاہ سے نکال دیا، اس کے لیے یہ شعر کہا گیا،

بست یک ملحد سے شریف بنام　　ناتمامی بطور خوشش تمام

ملا صاحب لکھتے ہیں کہ یہ گھومتا پھرتا مالوہ پہنچا، اور اپنے کو دسویں صدی کا مجدد اعلان کرایا، اکبر کے دربار میں حاضر ہوا، تو اس کی بڑی پذیرائی ہوئی، اکبر اس سے خلوت میں باتیں کرتا، اس نے اپنے جہلات کا ایک مجموعہ بھی تیار کیا تھا، اور اس کا نام ترشح ظہور رکھا تھا، ملا صاحب لکھتے ہیں کہ اپنی اس مکاری کے باوجود اپنی فضیلت کا سکہ جما رکھا تھا اور ہزاری منصب تک پہنچ گیا، اور بنگالہ میں مذہب حق کا داعی مقرر ہوا، بادشاہ کے چار مخلص یاروں میں شامل ہے، مریدوں اور معتقدوں کے سامنے بادشاہ کی نیابت بھی کرتا ہے۔ (ج ۲ ص ۲۸۸)

بعض حلقوں میں ان کی راسخ العقیدگی کو ان کے مذہبی تعصب اور غلو پر محمول کیا جاتا ہے۔

لیکن ان کی تصانیف میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ انھوں نے شیعوں اور ہندوؤں کی تعریف دل کھول کر کی ہے، خانخانان بیرم خاں کی فیاضی، علم پروری اور عبادت گذاری کی تعریف میں ان کا قلم خوب چلا ہے، اور جب اس کو ہلاک کیا گیا تو ملا صاحب اسکو شہادت کا درجہ دیتے ہیں، کیونکہ وہ عازم حج تھا، کسی نے اس کی تاریخ وفات اس مصرعہ سے نکالی تھی:

گفتا کہ شہید شد بیرام

ملا صاحب نے یہ تاریخ قلمبند کرکے لکھا ہے کہ انھوں نے خود یہ تاریخ نکالی

گفت گل گلشن خوبی نماند (ج ۲ ص ۴۶)

ملا صاحب اکبر کے معزز امیر فتح اللہ شیرازی کی دنیا داری اور امرا پسندی کو پسند نہ کرتے تھے، لیکن ان کو اعلم العلمای زماں تسلیم کرتے ہیں (ج ۳ ص ۱۵۴)، انکے بارہ میں لکھتے ہیں کہ مذہب کے معاملہ میں بڑی ثابت قدمی دکھاتے رہتے، دیوان خانہ خاص میں جہاں کسی کو نماز پڑھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی، نہایت اطمینان کے ساتھ امامی مذہب کے مسلک کے مطابق نماز پڑھا کرتے تھے۔ بادشاہ ان کو تقلید پرست سمجھتا، لیکن ان کے علم وحکمت کا خیال کرکے چشم پوشی سے کام لیتا، پھر لکھتے ہیں کہ جب وہ وزارت کے عہدہ پر راجہ ٹوڈرمل کے شریک کار بنا دیے گئے تو نہایت دلیری کے ساتھ راجہ کے معاملات میں مداخلت کرکے وزارت کے فرائض بجالاتے تھے، ملا صاحب ان فضائل سے متاثر ہوکر یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ جب وہ دربار میں آئے تو ان کی آمد کی تاریخ "شاہ فتح اللہ امام اولیا" سے نکالی گئی، (ج ۲ ص ۳۱۶)۔ اپنی تیسری جلد میں قاضی نور اللہ شستری کی مدح تو ایسی کی ہے جس سے زیادہ ان کا انتہائی درجہ کا عقیدت مند بھی نہیں

...ا ہے، لکھتے ہیں کہ وہ مذہباً شیعہ تھے، بہت ہی منصف مزاج، عادل، نیک نفس،
...ر متقی اور عفیف تھے، ان میں شرفا کی تمام خوبیاں تھیں، علم، حلم، جودت فہم، وجدت طبع
...ٔ قلب اور ذکاوت وغیرہ کے لیے مشہور رہے، ان کی اچھی اچھی تصانیف بھی ہیں،
...یضی کی مہمل غیر منقوط تفسیر پر انھوں نے جو توقیع یعنی سرنامہ لکھا ہے وہ تعریف
...ہر ہے، شعر گوئی کا بھی ذوق تھا، اور دلنشین اشعار کہتے، حکیم ابو الفتح کے وسیلہ سے
...ی ملازمت میں داخل ہوئے...... انھوں نے اپنی قضائت کے زمانے میں
...ر کے شرارت پسند مفتیوں اور مکار محتسبوں کو جو معلم الملکوت شیطان کے بھی کان
...تے تھے، درست کر دیا رشوت کی ساری راہیں بند کرادیں، اس سے بڑھکر
انتظام نہیں کیا جا سکتا تھا، ان کے متعلق یہ شعر صادق آتا ہے (ج ۳ ص ۱۴۸-۱۴۷)

...آں کس کہ ذکر دی ہمہ عمر قبول   در قضا ہیچ زکس جز کہ شہادت زگواہ

...ہندوؤں میں ملا صاحب راجہ ٹوڈرمل اور راجہ بیربر سے خوش نہیں تھے، راجہ
...ر کے لیے تو وہ بہت ہی سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں لیکن اچھے ہندوؤں کی تعریف
ان کی تحریر شگفتہ ہوگئی ہے، جو راگڈھ کے راجہ رام چند کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ
...پنی ہمت اور اخلاق میں اپنی مثال نہیں رکھتا تھا، اس کی بخششوں کا یہ حال تھا کہ
...ے کرور روپے ایک ہی دن میں میاں تان سین کلاونت کو عطا کر دیا، ابراہیم سور
...ز بہت کچھ شاہانہ ساز و سامان دیا، تان سین اس سے جدا نہیں ہونا چاہتا تھا،
...ی جلال خاں قورچی وعدے وعید کر کے اس کو شاہی دربار میں اپنے ساتھ لے آیا،
یہ بھی لکھتے ہیں کہ جب رام چند رشاہی دربار میں آیا تو اس نے ایک سو بیس[۱۲۰] قیمتی لعل و جواہر
...نے میں دیے، ان کی قیمت پچاس ہزار روپے ہوتی تھی۔ (ج ۲ ص ۲۴۵)

وہ راجہ مان سنگھ کی خوبیوں کے بھی معترف رہے، اس کے کارناموں کا ذکر بہت اچھے الفاظ میں کیا ہے، جب وہ رانا پرتاب کے خلاف شاہی لشکر لیکر گیا تو جس بہادری سے وہ لڑا اسکے متعلق لکھتے ہیں کہ اس نے ایسی ثابت قدمی دکھائی کہ جو تصور میں نہیں آسکتی ہے (ج ۲ ص ۲۳۳) اسکی حق گوئی اور سیرت کی بلندی کی تعریف یہ لکھ کر کی ہے کہ ایک رات بادشاہ نے اس کو اپنے خلوت میں بلاکر اپنے دین کی ترغیب دلائی لیکن اس نے بڑی بے باکی سے یہ جواب دیا کہ اگر مریدی سے مراد جان نثاری ہے تو ہم تو اپنی جان ہتھیلی پر لیے ہر وقت حاضر رہتے ہیں، آزمانے کی ضرورت نہیں، اس کے علاوہ کچھ اور منشا ہے تو اس کا تعلق مذہب سے ہے۔ میں اعتقاداً ہندو ہوں، اگر حکم ہو تو مسلمان ہو جاؤں، ان دو کے علاوہ کوئی اور تیسرا راستہ نہیں جانتا (ج ۲ ص ۳۶۴)

وہ راجہ مان سنگھ کے باپ راجہ بھگونت سنگھ کی حق گوئی کے بھی معترف تھے، اکبر جب اپنے نئے دین کے اجراء کے فکر میں تھا تو ایک روز راجہ بھگونت سنگھ نے بڑھکر اس سے کہا کہ میں قبول کرتا ہوں کہ ہندو بھی برے ہیں اور مسلمان بھی، لیکن یہ فرمایئے کہ کون سا گروہ بہتر ہے، جس کو ہم سب لوگ قبول کرلیں"، ملا صاحب کا بیان ہے کہ بھگونت داس کی اس بات کو سن کر اکبر کی شدت کچھ دنوں کے لیے کم ہوگئی لیکن پھر اسلام کے احکام میں تغیر و تبدل کا سلسلہ شروع ہو گیا، اور اسکی تاریخ "احداث بدعت" سے نکالی گئی۔ (ج ۲ ص ۳۱۳)

(باقی)

بزم تیموریہ

بکثرت اضافوں کے ساتھ زیر طبع (مؤلفہ سید صباح الدین عبد الرحمن)

منیجر

بدایۃ المجتہد ابن رشد

از جناب مولوی عبدالعظیم صاحب اصلاحی

ابن رشد جس درجہ کا فلسفی تھا، اسی درجہ کا فقیہ و مجتہد بھی تھا لیکن اس کی فلسفیانہ شہرت نے اس کی فقہی حیثیت کو بالکل دبا دیا، اس مضمون میں اسکی اسی حیثیت کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے،

اس کے تفقہ اور اجتہاد پر مورخین متفق ہیں، اسکے سوانح نگار مولانا محمد یونس مرحوم لکھتے ہیں:

"ابن رشد نے حدیث و فقہ کی تعلیم جن اساتذۂ فن سے حاصل کی تھی، ان کا مرتبۂ اجتہاد ہی اس کی شہادت ہے کہ ابن رشد کا کمال فقہی اپنے ہم عصروں میں بہت زیادہ ممتاز حیثیت رکھتا تھا، دنیا سمجھتی ہے کہ ابن رشد محض ارسطو کا مقلد تھا، اسکا سوانح نگار ابن الآبار کہتا ہے کہ فلسفہ وغیرہ کو نظر انداز کرکے کم از کم فقہ میں تو اس کا کوئی نظیر نہ تھا"[1]

ابن ابی اصیبعہ کا بیان ہے:-

اوحد فی علم الفقہ والخلاف[2]	وہ علم فقہ اور خلافیات میں یکتا تھے،

سلیم خوری اور سلیم شحادہ لکھتے ہیں:-

اوحد آحاد عھدہ ذکاء وعلماء اجتھادا[3]	وہ ذکاوت اور علم و اجتہاد میں اپنے عہد میں یکتا تھے۔

ابن رشد کا فرانسیسی سوانح نگار رینان لکھتا ہے کہ

---

[1] ابن رشد مولانا یونس مرحوم [2] طبقات الاطباء ص ۵، [3] آثار الادھار ص ۲۲

"جس قدر اس (ابن رشد) کو فلسفہ اور طب میں عبور تھا، اس سے کم فقہ میں نہ تھا، ابن الابار فقہ میں اسکے کارناموں پر زیادہ زور دیتا ہے، اور بمقابلہ ان تصنیفات کے جو فلسفہ ارسطو پر اس نے کیں اور جو اس کی شہرت کا باعث ہوئیں، اس کے تبحر فقہ کو زیادہ اہمیت دیتا ہے، اور ابن سعید فقہائے اندلس کی سب سے اگلی صف میں اس کو جگہ دیتا ہے، جن علماء سے اس نے علوم فقہیہ و طبیہ حاصل کیے وہ اپنے زمانہ کے بڑے لوگوں میں گذرے ہیں۔"[1]

اس کے تفقہ اور اجتہاد کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مختلف اوقات میں قاضی القضاۃ کے جلیل القدر منصب پر فائز ہوا، علامہ شبلی حکمائے اسلام کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ

"عبد المومن کے عہد ۵۴۸ھ میں جبکہ ابن رشد کی کل عمر ستائیس برس کی تھی، وہ قاضی القضاۃ مقرر ہوا، یعنی اندلس سے لیکر مراکو تک کے کل علاقے اس کے قضا کے حدود میں آگئے۔"[2]

فرمانروائے مراکش عبد المومن کے بعد اس کے چھوٹے بھائی یوسف نے اس کو اشبیلیہ کا قاضی القضاۃ بنایا۔[3]

یوسف کے بعد اس کے جانشین یعقوب منصور نے ابن رشد کی سب سے زیادہ قدردانی کی، اس کے دور میں اس کو بڑا عروج حاصل ہوا، اس عروج نے ابن رشد کے بہت سے حاسد پیدا کر دیے، جن کی سازش سے ابن رشد کو بڑے مصائب میں مبتلا ہونا پڑا جس کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے،

ابن رشد کے فقہی کمال کا سب سے بڑا ثبوت اس کی فقہی تصانیف ہیں، اس لئے فقہ میں

---

[1] ترجمہ اردو رینان ص ۱۳ [2] مقالات شبلی حصہ پنجم ص ۱۱۷ [3] الدیباج المذہب ص ۲۸۴

بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان میں جو موجود ہیں یا جن کے نام معلوم ہیں وہ آٹھ یا نو ہیں، اس مضمون میں ان کا مختصر ذکر اور اس کی سب سے اہم تصنیف بدایۃ المجتہد پر تفصیلی تبصرہ کیا جاتا ہے۔

(۱) **بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد** ۔ اس کتاب کا ذکر محمد بن علی شاطبی، ابن الآبار، ابن ابی اصیبعہ[۱] اور ابن فرحون مالکی[۲] نے کیا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ اسکوریال کی لائبریری میں موجود ہے۔ بعض نے اسی کتاب کا نام کتاب المعتقد لکھا ہے،[۳] بعض نے نہایۃ المجتہد[۴]، بعض نے بدایۃ المجتہد[۵] بعض نے کفایۃ المجتہد،[۶] خود ابن رشد نے اس کتاب کا نام بدایۃ المجتہد وکفایۃ المقتصد لکھا ہے،[۷] ۱۳۲۷ھ میں سلطان عبدالحفیظ سابق سلطان مراکش نے اپنے شاہی کتب خانہ کا قدیم وصحیح قلمی نسخہ شائع کرایا۔ فقہ میں ابن رشد کی یہ پہلی کتاب ہو جو پہلی مرتبہ شائع ہوئی، اس کے بعد اس نسخہ کو پیش نظر رکھکر ۱۳۳۵ھ میں مصر سے اس کا دوسرا اڈیشن نکلا،[۸] پھر کچھ ہی عرصہ کے بعد ۱۳۳۹ھ میں ایک ہندوستانی اور مصری فرم نے ملکر اس کتاب کو شائع کیا،[۹] اور اب ہر جگہ دستیاب ہوتی ہے۔ ہم آیندہ صفحات میں اس پر مفصل ریویو کریں گے۔

(۲) **خلاصۃ المستصفیٰ** ۔ یہ ابن رشد کی دوسری کتاب ہے، اس کا نام مختصر المستصفیٰ فی اصول الفقہ ہے۔[۱۰] یہ الغزالی کی کتاب المستصفیٰ کا جو اصول فقہ پر ہے، اختصار ہے،

---

[۱] طبقات الاطباء ص ۵، [۲] الدیباج المذہب ص ۲۸۴ [۳] ترجمہ رینان ص ۶، [۴] نفح الطیب ج ۲ ص ۱۲۶ [۵] تاریخ فلاسفۂ اسلام ص ۲۱۳ [۶] کشف الظنون حاجی خلیفہ بحوالہ ابن رشد فرنگی محلی مرحوم ص ۱۰۲ [۷] بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۲۰۴ [۸] ابن رشد فرنگی محلی مرحوم ص ۱۰۳ [۹] بدایۃ المجتہد (طبع مطبعہ مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ بمصر علی نفقتہم ونفقۃ ابنا مولوی محمد بن غلام رسول السورتی فی بمبائی) اس مضمون میں اسی کتاب سے حوالے دیے گئے ہیں [۱۰] تاریخ فلاسفۂ اسلام ص ۲۱۲۔

ابن الآبار نے اس کا ذکر کیا ہے اور کتب خانہ اسکوریال کی فہرست میں بھی اس کا نام ہے، مقری نے لکھا ہے کہ ابن سعید نے بھی اس کا ذکر کیا ہے[1]۔ ابن فرحون مالکی کتاب الدیباج المذہب اور ابن ابی اصیبعہ کی طبقات الاطباء میں بھی اس کا ذکر ہے[2]۔

(۳) **النظر فی اغلاط الکتب الفقہیہ** - یہ تین جلدوں میں ہے۔ لاؤن افریقی نے اس کا ذکر کیا ہے[3]۔ رینان کی کتاب کے اردو ترجمہ میں مذکورہ نام دیا گیا ہے، محمد لطفی جمعہ نے اس کا نام "کتاب فی التنبیہ الی اغلاط المتون" لکھا ہے[4]۔

(۴) **اسباب الاختلاف** - یہ کتاب بھی تین جلدوں میں ہے، اور اس کا ایک عربی نسخہ کتب خانہ اسکوریال میں موجود ہے[5]۔ معلوم نہیں کن اسباب کی بنا پر مولانا محمد یونس مرحوم نے ابن رشد کی جانب اس کتاب کی نسبت پر شبہہ کا اظہار کیا ہے[6]۔ محمد لطفی جمعہ نے الدعاوی (۳ جلدیں) نام کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے[7]۔ معلوم نہیں اسی کتاب کا دوسرا نام ہے، یا یہ کوئی اور کتاب ہے۔

(۵) **اصول فقہ کا نصاب کامل** - کتب خانہ اسکوریال میں ہے[8]۔ محمد لطفی جمعہ نے اس کا نام دروس فی الفقہ العربی لکھا ہے[9]۔

(۶) **رسالہ اضحیہ** (منہ) شاید یہ مذکورہ بالا کتاب کے کسی حصہ کا دوسرا نسخہ ہو[10]، اس میں قربانی سے متعلق احکام ہوں گے۔

(۷) **رسالہ عشر** - (منہ) یہ بھی اوپر کی کتاب کی طرح اصل کتاب دروس فی الفقہ العربی

---

[1] رینان ص ۷۷، [2] الدیباج ص ۲۸۴، طبقات الاطباء ص ۷۷، [3] رینان ص ۷۷، [4] تاریخ فلاسفۃ اسلام ص ۱۱۲ [5] رینان ص ۷۷، [6] ابن رشد مولوی محمد یونس فرنگی محلی ص ۱۲۷ [7] تاریخ فلاسفۃ الاسلام محمد لطفی جمعہ ص ۱۱۲ [8] رینان ص ۷۷، [9] لطفی جمعہ ص ۱۱۲ [10] ترجمہ کتاب رینان ص ۷۷،

کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے، محمد لطفی جمعہ نے اس کا نام کتاب الخراج لکھا ہے[۱]، مولانا محمد یونس مرحوم نے اس رسالہ کا ذکر نہیں کیا ہے[۲]،

(۸) **فرائض السلاطین والخلفاء** ۔ حاکموں اور سود خواروں کے ناجائز فوائد پر ہے، ابن ابی اصیبعہ نے اس کو ابن رشد کی جانب منسوب کیا ہے[۳]، لطفی جمعہ نے اس سلسلہ میں ایک کتاب الکسب الحرام کا نام لکھا ہے[۴]، غالباً یہ اسی کتاب کا دوسرا نام ہے،

(۹) **منہاج الادلہ** ۔ اس کتاب کو مولانا محمد یونس مرحوم نے ابن ابی اصیبعہ کی روایت سے کتب فقہ کی فہرست میں داخل کیا ہے[۵]، علامہ شبلی نعمانی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے، اور اس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ اصولِ فقہ میں اس کی مستقل تصنیف ہے[۶]، لطفی اور رینان کی فقہ کی فہرست میں اس کا ذکر نہیں ہے،

ابن ابی اصیبعہ نے فقہ کی دو اور کتابیں ابن رشد سے منسوب کی ہیں، کتاب التحصیل اور کتاب المقدمات ۔ کتاب التحصیل کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں ابن رشد نے صحابہ و تابعین اور ائمہ کے اختلافات تحریر کیے ہیں، اور ہر ایک کے دلائل بیان کرکے محاکمہ کیا ہے[۷]، لیکن اس میں ابن ابی اصیبعہ کو دھوکا ہوا ہے، یہ دونوں کتابیں ابن رشد کے دادا ابن رشد اکبر کی ہیں، غالباً یہ غلطی یہیں سے چلی ہے، جسے بعد کے مصنفین نے نقل کر دیا ہے، مثلاً سلیم میخائیل[۸]، نواب صدیق حسن خاں[۹] اور علامہ شبلی نعمانی[۱۰] وغیرہ، الدیباج المذہب میں ابن رشد اکبر کے تذکرے میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے ۔

---

[۱] تاریخ فلاسفۃ اسلام ص ۲۱۲، [۲] رینان ص ۷۷، [۳] ابن رشد مولوی محمد یونس مرحوم ص ۱۲۷، [۴] رینان ص ۷۷، [۵] تاریخ فلاسفہ اسلام ص ۲۱۲، [۶] ابن رشد مولوی یونس مرحوم ص ۱۲۷، [۷] مقالات شبلی جلد پنجم تاریخی حصہ اول ابن رشد [۷] طبقات الاطباء ص ۷۷، رینان ص ۷۷، [۸] آثار الازمانہ ص ۳۲۲ [۹] التاج المکلل ص ۳۰۲ [۱۰] مقالات شبلی جلد پنجم تاریخی حصہ اول

الف کتاب البیان والتحصیل	انھوں نے "کتاب البیان والتحصیل
لما فی المستخرجۃ من التوجیہ	لما فی المستخرجۃ من التوجیہ والتعلیل"
والتعلیل تنیف علی عشرین	لکھی ہے، جو تقریباً بیش جلدوں پر مشتمل
مجلدا وکتاب المقدمات	ہے، اور کتاب المقدمات لاوائل
لاوائل کتب المدونۃ[1]	کتب المدونہ لکھی ہے۔

یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں مصر میں چھپ گئی ہے،

ریتان نے ابن رشد کی فقہی کتابوں کے تذکرے کے بعد لکھا ہے کہ پہلی اور دوسری کتاب یعنی بدایۃ المجتہد و مختصر المستصفی کی نسبت تحقیق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ابن رشد کی ہیں لیکن راسی نیر (Caeirmere) نے جو نام لکھے ہیں ان میں ایک کا بھی پتہ ابن رشد کی سوانح عمریوں میں نہیں چلتا، چونکہ ابن رشد کے نام کے تین مشہور فقیہ گذرے ہیں، خاص کر دادا ابن رشد ۵۲۰ھ میں تھا اور جس کی تصانیف اسکوریال لائبریری میں موجود ہیں اسلیے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ان کے ناموں اور تصانیف میں خلط ملط ہو گیا ہو[2]

واقعہ جو بھی ہو، ابن رشد کی جانب ان تصنیفوں کی نسبت اس بات کی بہرحال دلیل ہے کہ اس نے بہت سی کتابیں اس فن میں تصنیف کیں،

بدایۃ المجتہد اور بعض دوسری کتب فقہ کا موازنہ

ابن رشد کی فقہی عظمت کے لیے اس کی صرف ایک کتاب بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد کافی ہے۔ الدیباج المذہب میں ہے:

ولا یعلم فی وقتہ انفع منہ	اس کے عہد میں اس سے زیادہ نفع بخش
ولا احسن سیاقاً[3]	اور بہتر کتاب موجود نہیں تھی،

---

[1] الدیباج المذہب لابن فرحون المالکی ص ۲۸۹ [2] کتاب ریتان ص ۷۰ [3] الدیباج المذہب ص ۲۸۴

اور یہ حقیقت ہے کہ آج بھی اس کی یہ خصوصیت بجنسہ برقرار ہے، فقہ میں مبسوط امام سرخسی فتح القدیر، امام شعرانی کی فقہ جات[1] وغیرہ، اسی طرز کی کتابیں ہیں، لیکن اختصار، جامعیت اور متانتِ استدلال میں بدایۃ المجتہد سے بہت پیچھے ہیں، مبسوط امام محمد کی کتاب کی شرح ہے، اور فتح القدیر ہدایہ کی، ان دونوں کتابوں کا امتیاز فروع کا احاطہ ہے، ان میں ائمہ احناف اور امام شافعی کے اختلافات مذکور ہیں، دوسرے ائمہ اور مجتہدین کے خیالات بہت کم ملتے ہیں، اور احناف کے مسالک کو مضبوط ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس لیے ان کو بدایۃ المجتہد کے طرز کی کتاب کہنا صحیح نہیں ہے،

امام علاء الدین ابی بکر بن مسعود الکاسانی حنفی متوفی ۵۸۷ھ کی بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، بدایۃ المجتہد سے پہلے کی ہے، اس میں فقہ اور مسائل فقہ کے ابواب کو فنی اعتبار سے درج کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جیسا کہ خود مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے :-

اذا لغرض الاصلی والمقصود	جملہ فنون میں کسی تصنیف کا اصل مقصد
الکلی من التصنیف فی کل فن من	ومنشا یہ ہوتا ہے کہ طالبین کے لیے مطلوب
فنون العلم ھو تیسیر سبیل	تک پہنچنے کی راہ آسان کی جائے اور اسکو
الوصول الی المطلوب علی الطالبین	اس سے اخذ کرنے والوں کیلئے قریب الفہم
وتقریبہ الی افہام المقتبسین	کیا جائے اور یہ مقصد کسی فنی اور حکیمانہ
ولا یلتئم ھذا المراد الا بترتیب	ترتیب کے بغیر پورا نہیں ہوتا، یہ ترتیب
تقتضیہ الصناعۃ وتوجبہ	ایسی ہونی چاہئے کہ مسائل کی قسموں
الحکمۃ وھو التصفح عن اقسام	اور اس کی فصلوں کو الگ الگ کیا جائے

[1] ابن رشد از مولانا محمد یونس فرنگی محلی مرحوم ص ۱۵۳

المسائل وفصولها وتخريجها على قواعدها	اور انہیں ٹھیک اصول وقواعد کے مطابق
واصولها ليكون اسرع فهما واسهل	درج کیا جائے تاکہ سمجھنے اور محفوظ کرنے
ضبطا وايسر حفظا فتكثر الفائدة و	میں آسانی ہو، اور اس سے منفعت
تتوفر العائدة فصرفت العناية الى ذلك	اور فائدہ زیادہ ہو، اس لیے میں نے اسکی
وجمعت في كتابي هذا جملا	جانب توجہ کی اور اپنی اس کتاب میں
من الفقه مرتبة بالترتيب	فقہ کا ایک بڑا مجموعہ فنی ترتیب اور
الصناعي والتاليف الحكمي	حکیمانہ تالیف کے ساتھ جمع کیا جسے اہل فن
الذي ترتضيه ارباب الصنعة	اور صاحب حکمت لوگ پسند کریں گے،
وتخضع له اهل الحكمة مع	اس کے ساتھ واضح دلائل اور مضبوط
ايراد الدلائل الجلية والنكت	نکتے بھی ایسی عبارتوں میں لکھ دیئے ہیں
القوية بعبارات محكمة المباني	جن کی بنیاد مضبوط اور معانی ومطالب
مؤدية المعاني وسميته	کے اظہار کے لیے مناسب ہے، نام میں نے
بدائع الصنائع في ترتيب	بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع
الشرائع، اذ هي صنعة بديعة	رکھا ہے، یہ ایک انوکھی صناعی، عجیب
وترتيب عجيب وترصيف	ترتیب اور نادر مرصع کاری ہے تاکہ اسکا
غريب لتكون التسمية موافقة	نام مسمی کے موافق اور اس کی صورت
للمسمى والصورة مطابقة للمعنى [1]	معنی کے عین مطابق ہو۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتاب مصنف کے دعوی کے مطابق ہے۔ اور اس کی ترتیب دوسری

---

[1] مقدمہ کتاب بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع للامام علاء الدین ابی بکر بن مسعود الکاسانی،

کتب فقہ کی بنسبت زیادہ بہتر ہے، لیکن اس کے باوجود ابن رشد کی کتاب کو نہیں پہنچتی، بدایہ کی فنی ترتیب ہی کچھ اور ہے، جس کا ہم آگے ذکر کریں گے، بدائع الصنائع میں پہلے ایک نوع کے مسائل کے لیے "کتاب" کا عنوان قائم کیا گیا ہے، مثلاً کتاب الطہارات پھر "الکلام" کے عنوان سے اس 'کتاب' کی مختلف قسمیں کردی ہیں، مثلاً الکلام فی الوضوء الکلام فی الغسل وغیرہ، اس کے بعد چھوٹی چھوٹی فصلیں قائم کرکے بہت سے بنیادی یا فروعی مسائل کا ذکر کیا ہے، مگر ان سب میں صرف ائمۂ احناف یا امام شافعی کے اختلافات مذکور ہیں،

مصر سے ایک کتاب "کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ" کے نام سے شائع ہوئی ہے، اس کے مصنف عبدالرحمٰن الجزیری ہیں، یہ کتاب اس حیثیت سے بدایۃ المجتہد کے طرز پر کہی جاسکتی ہے کہ اس میں متعدد مسلکوں کا ذکر ہے، مگر یہ تعدد بھی چار مذاہب میں محدود ہے، اس کے مقابلہ میں ابن رشد نے ائمۂ اربعہ کے علاوہ امام داؤد ظاہری، امام اوزاعی، سفیان ثوری، ابو ثور، ابن حزم، ابن عبد البر وغیرہ بہت سے ائمہ کے اقوال کا ذکر کیا ہے، عبدالرحمٰن الجزیری کی کتاب بہت طویل اور بڑے سائز کی چار ضخیم جلدوں میں ہے، جزء اوّل قسم العبادات، جزء ثانی وثالث قسم المعاملات اور جزء رابع قسم الاحوال الشخصیہ۔ اس کتاب میں کہیں کہیں احکام کے علل بھی بیان کیے گئے ہیں، اور کہیں کہیں کتاب وسنت سے دلائل دینے کی بھی کوشش کی گئی ہے،

ابن رشد نے بدایۃ المجتہد میں تقلید کے عام ہونے تک پیدا ہونے والے ان تمام مسائل کو ذکر کیا ہے، جن کا نصوص میں ذکر ہے، یا شریعت سے ان کا قریبی تعلق ہے، خواہ یہ مسائل متفق علیہ ہوں یا مختلف فیہ اور ان کے اسباب اختلاف اور دلائل کا خصوصیت

کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ ان مسائل کی حیثیت ایسے اصول وقواعد کی ہے جو مجتہد کو پیش آسکتے ہیں، اور جن کا ذکر شریعت میں نہیں ہے۔[1]

بدایہ کا طرز | اس کی فنی ترتیب جدید طرز کی ہے۔ کتاب الجہاد کو ابواب معاملات پر مقدم کیا ہے، کیونکہ اسلام میں نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے بعد جہاد ہی کا نمبر ہے، اسی طرح کتاب الاشربہ اور کتاب الضحایا کو معاملات کی فہرست سے جدا کر دیا ہے، کیونکہ اسلام میں ان چیزوں کی حیثیت محض تعبدی ہے۔[2] مسائل کے ذکر میں سب سے پہلے کسی چیز سے متعلق بحث کو کتاب کے عنوان سے شروع کیا ہے، پھر اس کو مختلف ابواب، فصول، مسائل اور انواع میں تقسیم کیا ہے، جس سے احکام کی تلاش اور یاد داشت میں بڑی آسانی ہو گئی ہے، جس حکم میں جتنے فروع نکلتے ہیں، اس میں اتنے ہی درجات قائم کیے ہیں، مثلاً طلاق کی بحث میں 'کتاب الطلاق' عنوان قائم کرکے اس میں چار جملے (مجموعے) متعین کیے ہیں، مجموعۂ اولی انواع طلاق میں مجموعہ ثانی ارکان طلاق میں، مجموعہ ثالث، رجعت میں، مجموعہ رابع مطلقات کے احکام میں، پھر ہر جملہ (مجموعہ) کے ابواب قائم کیے ہیں، مثلاً جملہ اولی میں پانچ باب ہیں، پھر ہر باب میں کئی کئی مسئلوں کا ذکر ہے۔[3]

جملہ اخیرہ (رابعہ) میں دو باب قائم کیے ہیں، اور باب اول کو دو فصلوں میں تقسیم کیا ہے، اور فصل اول کی دو نوعیتیں بنائیں اور نوع ثانی میں الگ الگ مسائل لکھے ہیں،[4] بحیثیت مجموعی کتاب کی ترتیب اور طرز نگارش کے متعلق یہ دعوی کیا جا سکتا ہے کہ دوسری کتب فقہ کو اس سے کوئی نسبت نہیں۔

---

[1] بدایۃ المجتہد جزء اول ص ۱ دیباچہ [2] ابن رشد مولانا محمد یونس فرنگی محلی ص ۱۴۱، [3] بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد ج ۲ ص ۵۶، ۶۲ [4] ایضاً ج ۲ ص ۸۳، ۹۰

کتاب بدایۃ المجتہد کا مقصد | اس کتاب کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ دوسری کتب فقہ کے برخلاف اس کی غرض وغایت اجتہاد کی صلاحیت پیدا کرنا ہے، ائمۂ اربعہ اور ان کے اصحاب کے بعد تقلید کے عام رواج کی بدولت فقہا کے صرف تین چار معمولی کام رہ گئے تھے، امام سے جو اصولی مسائل مروی ہیں ان کو پیش نظر رکھکر ابواب فقہ کے فروع کو ترتیب دینا، امام کی مختلف روایتوں کو تلاش کرکے انھیں باہم ترجیح دینا، ان کی صحت وغلطی دریافت کرنا، وقائع ونظائر ممکنہ وغیر ممکنہ کو ابواب فقہ کے مطابق ترتیب دینا، فروع مذہب کی طویل کتابوں کی مختصر شرحیں اور حاشیے لکھنا، ان کے علاوہ حنفیہ وشافعیہ کے تنازعات کے بدولت ایک خاص فن جدل وخلاف بھی پیدا ہوگیا تھا، جس میں ہر فریق اپنے امام کے آراء ومذاہب کی متعصبانہ تائید وحمایت کرتا تھا، اور اس کے لیے رطب ویابس، قوی وضعیف ہر طرح کے دلائل دیے جاتے تھے، اس سے بحث نہیں تھی کہ درحقیقت کون مذہب حق ہے، اس لیے ان کتابوں سے استعداد فقہی تو ضرور پیدا ہوتی ہے، لیکن اس کا دائرہ بہت محدود ہے، اور صرف تخریج وترجیح اقوال اور استنباط فروع کا ملکہ پیدا ہوتا ہے، اور ہر فریق یہ سمجھنے لگتا ہے کہ حق اسی کے ساتھ ہے، ملکۂ اجتہاد کا یہ فقدان مسلمانوں کے لیے ہر حیثیت سے مضر ثابت ہوا، لیکن اس کا احساس بہت کم لوگوں کو ہوا، جن کو ہوا ان میں ابن رشد بھی ہے، اس نے بدایۃ المجتہد اسی غرض سے لکھی، وہ لکھتا ہے :-

ان فی قوۃ ھذا الکتاب ان	جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس کتاب میں یہ وصف
یبلغ بہ الانسان کما قلنا رتبۃ	ہے کہ انسان اس کے ذریعہ اجتہاد کے
الاجتھاد اذا تقدم فعلم من	رتبہ کو پہنچ سکے گا، بشرطیکہ وہ لغت،
اللغۃ والعربیۃ وعلم من اصول	عربیت اور اصول فقہ سے اتنی واقفیت

الفقہ ما یکفیہ فی ذٰلک	حاصل کرلے جو اس کے لیے کافی ہو، اس لیے
ولذٰلک رأینا ان اخص الاشیاء	ہمارے خیال میں اس کا سب سے مناسب
بھذا الکتاب ان نسمیہ بدایۃ	نام بدایۃ المجتہد وکفایۃ المقتصد
المجتہد وکفایۃ المقتصد[1]	ہے۔

اس غرض کے حصول کے لیے ابن رشد نے جن باتوں کا التزام کیا ہے، ان سے کتاب میں امتیازی شان پیدا ہوگئی ہے، عام طور پر کتب فقہ میں فروع مسائل جمع کیے جاتے تھے، جن سے اصول کے سمجھنے میں بہت کم مدد ملتی تھی، باب اجتہاد بالکل مسدود تھا، اور فروع تک میں جزئیات کی پابندی لازمی خیال کی جاتی تھی، ابن رشد نے اس کتاب میں یہ مفاد انہ طرز ترک کر دیا تاکہ اصول سے استنباط فروع کا ملکہ پیدا ہو، اور اصول میں بھی صرف ان کو لے لیا جن کی شرع میں صراحت موجود ہے، یا ائمہ نے ان میں اختلاف کیا ہے، چنانچہ لکھتا ہے،[2]

قصدنا فی ھذا الکتاب انما ھو	اس کتاب سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس میں
ان نثبت المسائل المنطوق	شرع کے متفق علیہ و مختلف فیہ مسائل
بھا فی الشرع المتفق علیھا و	درج کریں کیونکہ انہی دونوں قسموں کے
المختلف فیھا.... فان معرفۃ	مسائل مسکوت عنہ اور نئے پیدا شدہ
ھذین الصنفین من المسائل	مسائل میں بطور اصول موضوعہ کام
ھی التی تجری علی المجتہدین	آتے ہیں، اور اگر ان مسائل کی واقفیت
مجری الاصول فی المسکوت	کے ساتھ فقہا کے اختلافات کے علل پر

[1] بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۳۹۳ [2] ابن رشد مولانا فرنگی محلی ص ۱۴۹

عنها وفي النوازل .... ولیشبه ان یکون من تدرب في هذه المسائل وفهم اصول الاسباب التي اوجبت خلاف الفقهاء ان یقول ما یجب في نازلة من النوازل[1]

اسباب بھی ذہن میں ہوں تو انسان ہر جدید واقعہ کی بابت فتویٰ دینے کے قابل ہو سکتا ہے۔

کتاب البیوع میں ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

نذکر منها اشهرها لتکون کالقانون للمجتهد النظار[2]

ہم اس فصل کے صرف مشہور مسائل لکھیں گے تاکہ وہ صاحب نظر مجتہد کیلئے قانون کا کام دیں۔

اس بات کا ابن رشد نے مختلف مقامات پر ذکر کیا ہے، باب قضاء الصلوٰۃ کے آخر میں لکھتے ہیں

وفروع هذا الباب کثیرة وکلها غیر منطوق بها وقصدنا ههنا الا ما یجری مجری الاصول[3]

اس باب کے فروع بہت ہیں لیکن سب کے سب غیر منطوق ہیں (یعنی نصوص شرعیہ میں ان کا ذکر نہیں ہے) اور ہمارا ارادہ صرف ان مسائل کے ذکر کرنے کا ہے جو اصول کے طور پر کام آئیں۔

ان تمام فقہی اختلافات کو چھ اسباب کے تحت جمع کیا ہے :

واما اسباب الاختلاف بالجنس

اختلاف کے اسباب عام طور پر چھ ہیں،

---

[1] بدایۃ المجتہد ص ۳۲۳ بحوالہ ابن رشد ص ۱۴۳ [2] بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۱۴۷ [3] ایضاً ج ۱ ص ۱۵۵

فسنة اسعدها تردد الالفاظ بين
هذه الطرق الاربع اعني بين
ان يكون عاما يراد به الخاص
او خاصا يراد به العام او عاما
يراد به العام او خاصا يراد به
الخاص. او يكون له دليل خطاب
او لا يكون له. والثاني الاشتراك
الذي في الالفاظ وذلك اما في
اللفظ المفرد كلفظ القرء الذي
ينطلق على الاطهار وعلى الحيض
وكذلك لفظ الامر هل يحمل
على الوجوب او على الندب ولفظ
النهي هل يحمل على التحريم او الكراهية
.... والثالث اختلاف الاعراب
والرابع تردد اللفظ بين حمله
على الحقيقة وحمله على نوع من
انواع المجاز التي هي اما الحذف
واما الزيادة واما التقديم و
اما التاخير واما تردده على

اول یہ کہ الفاظ کا ان چار طریقوں میں
استعمال ہونا یعنی لفظ عام ہو اس سے
خاص مراد ہو یا خاص ہو اور معنی عام
مراد ہو یا لفظ عام ہو اور معنی بھی عام
مراد ہو یا لفظ خاص ہو اور معنی بھی خاص
مراد ہو، یا وہاں دلیل خطاب ہو یا نہ ہو،
دوسرے وہ اشتراک جو الفاظ میں پایا جاتا
ہے۔ جیسے لفظ قرء جو طہر اور حیض دونوں
کے لیے بولا جاتا ہے۔ ایسے ہی لفظ امر یا
وجوب پر محمول ہوگا، یا ندب پر، اور
لفظ نہی تحریم پر محمول ہوگا یا کراہیت پر
..... تیسرے اعراب کا اختلاف، چوتھے
لفظ کا کبھی حقیقت پر استعمال ہونا اور کبھی مجاز کی
مختلف قسموں میں استعمال ہونا مثلاً حذف، استعارہ وغیرہ،
پانچویں لفظ کا کبھی مطلق آنا اور کبھی مقید آنا جیسے غلام آزاد
کرنے میں ایک بار حکم مطلق آیا ہے، اور
ایک بار ایمان کی قید کے ساتھ، چھٹے یہ کہ
الفاظ کی ان قسموں میں جن سے احکام
شرع ماخوذ ہوتے ہیں، باہم تعارض ہونا،

الحقیقۃ او الاستعارۃ والخاص
الطلاق اللفظ تارۃ وتقییدہ
تارۃ مثل اطلاق الرقبۃ فی
العتق وتقییدھا بالایمان تارۃ
والسادس التعارض فی الشیئین
فی جمیع اصناف الالفاظ التی
یتلقی منھا الشرع الاحکام بعضھا
مع بعض وکذلک التعارض
الذی یاتی فی الافعال أو فی
الاقرارات او تعارض القیاسات
انفسھا او التعارض الذی
یترکب من ھذہ الاصناف
الثلاثۃ اعنی معارضۃ القول
للفعل او للاقرار او للقیاس
ومعارضۃ الفعل للاقرار
او للقیاس ومعارضۃ الاقرار للقیاس

ایسے ہی وہ تعارض ہے جو نبیؐ کے افعال
اور اقرارات میں پایا جائے یا قیاسات کا
آپس میں معارض ہونا یا وہ تعارض جو ان
تین قسموں میں پیدا ہو یعنی فرمودات نبیؐ
کا آپ کے افعال سے یا اقرارات سے
یا قیاس سے یا آپ کے افعال کا اقرار
سے یا قیاس یا اقرار کا قیاس سے
معارض ہونا۔

کتاب کے ہر مسئلہ میں ثابت کیا ہے کہ اختلافات انہی چھ اسباب کی بنا پر ہوتے ہیں
اور جا بجا اس کی طرف اشارے بھی کیے ہیں۔

---

[1] بدایۃ المجتہد ج ۱ مقدمہ ص ۵

حدیث میں ابن رشد کا مرتبہ ایک ماہر فقیہ کے لیے احادیث پر عبور ضروری ہے، بدایۃ المجتہد کی بعض بحثوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ حدیث میں ابن رشد کا مقام کتنا اونچا تھا، وہ بلا تکلف احادیث کے ضعف، علل، قوت، مستخرجین اور راوین پر بحث کرتے ہیں، مثلاً "مسح علی الخفین" کی بحث میں کہتے ہیں :-

(قلت) اما حدیث علی فصحیح	رہی حضرت علیؓ کی حدیث تو وہ صحیح ہے
خرجہ مسلم واما حدیث ابی	اس کی تخریج امام مسلم نے کی ہے، اور ابی
بن عمارۃ فقال فیہ ابوعمر	ابن عمارۃ کی حدیث کے بارے میں ابن
ابن عبد البر انہ حدیث لا یثبت	عبد البر نے کہا ہے کہ یہ حدیث ثابت نہیں
ولیس لہ اسناد قائم	ہے اور نہ اسکی سند ٹھیک ہے، اور
واما حدیث صفوان بن عسال	صفوان بن عسال کی حدیث کا اگرچہ
فھو وان کان لم یخرجہ البخاری	امام بخاریؒ و مسلمؒ نے نہیں ذکر کیا ہے
ولا مسلم فانہ قد صححہ قوم	لیکن اہل علم کی ایک جماعت نے اسے
من اھل العلم[1]	صحیح قرار دیا ہے۔

السجود علی الجبھۃ والانف کی بحث میں فیصلہ کن طور پر کہتے ہیں

(قال القاضی ابوالولید) وذکر	قاضی ابوالولید (ابن رشد کی کنیت)
بعضھم الجبھۃ فقط وکلا الروایتین	نے کہا کہ بعض نے صرف پیشانی کا ذکر کیا
موجود فی کتاب مسلم[2]	ہے اور یہ دونوں روایتیں امام مسلم کی کتاب میں

فقہ میں وسعت معلومات فقہ میں ان کی وسعت معلومات کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ

---

[1] بدایۃ ج ۱ ص ۱۹ [2] ایضاً ص ۱۲۷

اس کتاب میں انھوں نے ائمہ اربعہ کے علاوہ دوسرے بہت سے ائمہ کے اقوال اور ان کے دلائل وضاحت کے ساتھ پیش کیے ہیں، مثلاً امام اوزاعی، سفیان ثوری، ابوداؤد ظاہری، ابو ثور، ابن ابی لیلیٰ، سفیان بن عینیہ، ابن جریج، عطاء بن دینار، اشہب، سحنون، طبری وغیرہم۔

ابن رشد کی بے تعصبی اور مجتہدانہ شان | کہنے کو تو ابن رشد مالکی تھے اور انھوں نے عموماً اپنی کتابوں میں مالکی فقہ کو ترجیح دی ہے لیکن کسی ایک امام کی تقلید و تائید کی ترغیب اس کتاب کے مقصد کے خلاف تھی، اس لیے وہ اس سے الگ ہے اور اس میں انھوں نے ائمہ کے اقوال مع ان کے دلائل کے جمع کر دیے ہیں اور اس کی کوشش کی ہے کہ جس کے دلائل جس حیثیت کے ہیں اسی حیثیت سے بیان کر دیے جائیں تاکہ لوگوں میں علی وجہ البصیرت کسی رائے کے اختیار اور ترک کرنے کا ملکہ ہو، چنانچہ اکثر مقامات پر فقہاء کی رایوں کی وضاحت کے بعد "فتأمله" (تم خود غور کر لو) کہہ کر فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا ہے[1]،

بعض مسائل میں محاکمہ کیا ہے اور دلیل کی قوت کی بنا پر کسی ایک رائے کو ترجیح دی ہے اور اس کی مطلق پروا نہیں کی ہے کہ یہ رائے امام مالک کے خلاف جاتی ہے یا کسی اور کے۔ بہت سے مسائل میں امام مالک کی رایوں کی کمزوری پر تعجب ظاہر کیا ہے، اور دوسرے ائمہ کی رایوں کو سراہا ہے،

مطلقہ کے وارث ہونے کے بارے میں ائمہ کے اقوال لکھنے کے بعد آخر میں لکھا ہے۔

وسوى مالك في ذلك كله	اس مسئلہ میں امام مالک نے سب کو برابر
حتى لقد قال ان ماتت لا	قرار دیا ہے، اور یہاں تک کہہ دیا ہے کہ
يرثها وترثه هي ان مات، وهذا	اگر مطلقہ عورت پہلے مر جائے تو شوہر

[1] بدایۃ جلد اول ص ۹۲

مخالف للاصول جداً[1] وارث نہیں ہوگا، اور اگر شوہر مرجائے تو عورت وارث ہوگی، حالانکہ یہ بات اصول کے بالکل خلاف ہے۔

سورِ کلب (کتّے کے جوٹھے) کے بارے میں لکھا ہے

واما قیل فی المذھب من ھذا الکلب ھو الکلب المنھی عن اتخاذہ او الکلب الحضری فضعیف وبعید من التعلیل[2]	مذہب مالکی میں جو یہ بات کہی گئی ہے کہ یہ وہ کتا ہے جس کے پالنے سے روکا گیا ہے یا شہری کتا، تو یہ کمزور بات ہے اور کسی چیز کی علت بننے سے قاصر ہے۔

اسی طرح لعان کے مسئلے میں عورت کے نکول (قسم سے انکار) کے بارے میں امام ابوحنیفہ کا فتویٰ درج کرنے کے بعد لکھا ہے

فابوحنیفۃ فی ھذہ المسئلۃ اولی بالصواب انشاء اللہ تعالیٰ[3]	ابوحنیفہ کی رائے اس مسئلہ میں انشاء اللہ تعالیٰ حق وصواب سے زیادہ قریب ہے۔

بعض ان فروعی مسائل میں جن کے متعلق کئی حدیثیں ملتی ہیں اور ترجیح کے لیے کوئی قوی دلیل بھی نہیں، تخییر کی رائے دی ہے، یعنی نوافل اور سنن سے تعلق رکھنے والے غیر بنیادی مسائل میں نسخ کی کوئی دلیل نہیں ہے، آدمی کو اختیار رہنا چاہیے، جس قول پر چاہے عمل کرے۔

اسی طرح وہ فقہاء کی بعض شکل پسندیوں کے بھی خلاف ہیں، جمعہ کی نماز کے متعلق فقہاء و مجتہدین نے اپنے اپنے اجتہاد سے بہت سے قیود و شرائط عائد کیے ہیں جن کا مبنیٰ صرف یہ ہے کہ یہ شرطیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جمعہ کی نمازوں میں اتفاقی یا غیر اتفاقی طور پر برابر پائی جاتی رہی ہیں۔ ابن رشد جمعہ سے متعلق ائمہ کی شرطوں کے ذکر کرنے کے بعد ان پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں

---

[1] ہدایۃ جلد ثانی ص ۸۰، [2] ایضاً ج ۱ ص ۲۰ [3] ایضاً ج ۲ ص ۱۱۳

وھذا کلہ تعمق فی ھذا الباب	یہ سب اس باب میں انتہا پسندی ہے،
ودین اللہ یسر۔ ولقائل ان یقول	حالانکہ اللہ کا دین آسان ہے، ایک
ان ھذہ لو کانت شروطا	کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ چیزیں نماز کی
فی صحۃ الصلوٰۃ لما جاز ان	صحت کے لیے شرط ہوتیں تو رسول اللہ
یسکت عنہا علیہ الصلوٰۃ	صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بارہ میں سکوت
والسلام ولا ان یترک بیانہا	نہ فرماتے اور اس کی وضاحت نہ چھوڑتے،
لقولہ تعالیٰ لتبین للناس	کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے
ما نزل الیھم۔ ولقولہ تعالیٰ	"لتبین للناس ما نزل الیھم" اور
ولتبین لھم الذی اختلفوا	"لتبین لھم الذی اختلفوا فیہ"
فیہ۔ واللہ المرشد للصواب[1]۔	اللہ ہی حق کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ یہ کتاب اسلوب تحریر، ترتیب مضامین، جمع اقوال ائمہ، قوت استدلال اور فقاہت میں بے نظیر اور مصنف کی فقہی مہارت کا واضح ثبوت ہے، اور ہر حیثیت سے دیگر کتب فقہ پر فوقیت رکھتی ہے، ابن سعید نے ان الفاظ میں اس کی تعریف کی ہے۔

کتاب جلیل معظم عند المالکیۃ[2]	یہ کتاب نہایت عظیم اور مالکیہ کیلئے معتمد علیہ ہے،

لیکن حق یہ ہے کہ صرف مالکیوں کے لیے نہیں بلکہ تمام علمائے اسلام کے لیے مفید ہے اور اس کا مطالعہ اجتہاد کی استعداد پیدا کرتا ہے[3]

گمنامی کے اسباب | لیکن یہ بڑا المیہ ہے کہ تقلید و روایت پرستوں نے نہ صرف اس بے مثال کتاب کو نظر انداز کر دیا، بلکہ اس کے جلیل القدر مصنف کے فقہی کارناموں سے بھی صرف نظر

---

[1] بدایۃ المجتہد جلد اول ص ۹۷، [2] نفح الطیب ج ۲ ص ۱۲۱، [3] ابن رشد مولانا محمد یونس مرحوم ص ۱۵۴

کر لیا اور اس پر کفر کے فتوے لگے، اس کے حسب ذیل اسباب ہو سکتے ہیں :

ابن رشد فقیہ کے ساتھ فلسفی بھی تھا، فلسفہ میں اسے امامت کا درجہ حاصل تھا، اور اندلس میں فلسفہ سے زیادہ مبغوض کوئی چیز نہیں تھی، علامہ مقری نفح الطیب میں لکھتے ہیں،

کلما قیل فلان یقرء الفلسفۃ	جب کسی شخص کے بارے میں معلوم ہوتا کہ
اطلقت علیہ العامۃ اسم الزندیق	وہ فلسفہ پڑھتا ہے تو فوراً عوام الناس
فان زل فی شبہۃ رجموہ بالحجارۃ	اسے زندیق کا خطاب دے ڈالتے اور
وحرقوہ قبل ان یصل امرہ	اگر کسی مسئلہ میں اس سے لغزش ہو جاتی
الی السلطان[1]	تو قبل اس کے کہ حاکم وقت تک اس کا
	معاملہ پہنچے اس کو پتھر مار مار کر ہلاک کر ڈالتے
	اور اس کی لاش جلا ڈالتے،

ابن رشد نے اپنی کتاب میں اشاعرہ کے مذہب کا رد کیا ہے، اور امام غزالی کی تصنیف تہافت الفلاسفہ کا بھی رد لکھا ہے، اور امام صاحب کی شان میں نازیبا الفاظ استعمال کیے ہیں[2]، یہ چیز بھی علماء کی برہمی کا باعث ہوئی، اس لیے بعض مورخین نے اپنی کتابوں میں اس کا ذکر تک نہیں کیا ہے، ابن خلکان نے یوسف بن عبد المومن کے تذکرے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ اسکے دربار میں ابن رشد بھی تھا[3] صفدی جس کی کتاب مشاہیر اسلام کی انسائیکلوپیڈیا ہے، ایک حرف بھی ابن رشد کے متعلق نہیں لکھتا، اسی طرح جمال الدین قفطی جس نے ابن رشد کی وفات کے ایک مدت بعد اپنی تاریخ الحکماء لکھی ہے، ابن رشد کا نام تک نہیں لیا، حالانکہ اندلس کے بہت سے گمنام فلسفیوں کا تذکرہ اس نے کیا ہے[4]

---

[1] نفح الطیب مقری جلد اول ص ۱۰۲ [2] ایسے حملوں کیلیے ملاحظہ ہو کشف الادلہ ص ۲۱ بحوالہ ابن رشد ص ۱۵۶ اور تہافت التہافۃ ص ۴۳، ۴۴ بحوالہ ابن رشد مولانا محمد یونس [3] تاریخ ابن خلکان ص ۵۵ [4] ابن رشد ص ۹۹

مشرق میں اس کی فقہی حیثیت کی اس لیے شہرت نہیں ہوسکی کہ یہاں خود بڑے بڑے فقہاء و مجتہدین موجود تھے. اس لیے وہ ایک دور دراز کے فقیہ کی طرف کیوں توجہ کرتے، دوسرے یہاں مالکی مذہب رائج نہ تھا، اور ابن رشد مالکی تھا۔

استاذ کی شہرت کا ایک بڑا ذریعہ شاگرد ہوتے ہیں۔ ابن رشد کے شاگرد زیادہ تر یہودی اور عیسائی تھے، جو اس سے صرف فلسفہ پڑھتے تھے، فقہ اسلامی سے ان کو کوئی تعلق نہیں تھا مسلمان لڑکے بدعقیدگی کی شہرت کی بنا پر بہت کم پڑھتے تھے، وکان اکثر تلامذتہ الیھود والنصاریٰ وقل من یقرء علیہ من المسلمین لانہ کان یری بضعف المعتقد[1]۔ اس لیے اس کے شاگرد بے دین سمجھے جاتے تھے، لوگوں نے ان کے فتوے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا، اگرچہ بعض شاگردوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ابن رشد کے عقائد صالح مسلمانوں سے اتنے مختلف نہیں ہیں، جتنے سمجھے جاتے ہیں[2]۔

ہندوستان میں ابن رشد کے ساتھ اعتنا

مگر آخر ایک وقت آیا جب ابن رشد کا دنیا نے اعتراف کیا، ہندوستان میں غالباً سب سے پہلے نواب عماد الملک بلگرامی نے ابن رشد پر ایک گرانقدر مقالہ لکھ کر اس کو اہل علم میں متعارف کیا، اس کے بعد علامہ شبلی نعمانی نے ایک مبسوط مقالہ لکھنا شروع کیا، جو نامکمل رہ گیا، پھر بھی جو کچھ مولانا نے لکھ دیا ہے وہ ابن رشد کی سوانح حیات کا بہترین مرقع ہے۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ فقہ میں ابن رشد کے طرز فکر اور اس کی کتاب بدایۃ المجتہد کو بہت پسند فرماتے تھے۔ انھوں نے اگرچہ اس پر قلم نہیں اٹھایا لیکن مشہور دینی درسگاہ مدرستہ الاصلاح کے نصاب میں اس کو داخل کرکے تعلیمی حلقوں میں روشناس کرایا۔

۱۹۲۲ء میں دارالمصنفین نے ابن رشد پر مولانا محمد یونس مرحوم کی مستقل کتاب شائع کی۔

---

[1] آثار البلاد ص ۲۲۲ [2] رینان ص ۴۸ - ۴۹

اس میں مصنف نے ابن رشد کی سوانح نگاری کا پورا حق ادا کیا ہے، اس کے بعد اردو میں ابن رشد کے متعلق بہت سی کتابوں کے ترجمے اور مستقل مقالات لکھے گئے، اب اردو میں بھی وافر ذخیرہ ہوگیا ہے، اور ابن رشد اہل علم میں محتاج تعارف نہیں رہ گیا ہے، ہر مکتب فکر اور ہر مسلک فقہ کے لوگ اپنی تصنیفات میں اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، حنفی مسلک کے علماء نے بھی اپنی تصنیفات میں اس سے استفادہ شروع کر دیا ہے، ترمذی پر مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی تقریروں کو ان کے شاگرد رشید مولانا یحییٰ کاندھلوی نے جمع کیا ہے، جس پر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کی تعلیقات ہیں، اس میں باب ما جاء فی الوضوء من الریح کے حاشیہ میں ابن رشد کی پوری تقریر نقل کی ہے[1]،

اسی طرح حضرت شیخ الحدیث نے اوجز المسالک الی موطا مالک میں بدایۃ ابن رشد کے جا بجا اقتباسات نقل کیے ہیں، اعادۃ الصلوٰۃ مع الامام کی شرح میں لکھتے ہیں :-

قال ابن رشد اکثر الفقہاء	ابن رشد کا بیان ہے، اکثر فقہاء
علی انہ لا یعید منھم مالک	کا یہ مسلک ہے، ایسا شخص اعادہ صلوٰۃ
وابوحنیفۃ وقال بعضھم	نہیں کرے گا، ان میں امام مالک و
یعید وممن قال بھذا احمد	ابوحنیفہ بھی ہیں اور بعض اعادہ کے
وابوداؤد واھل ظاھر،[2]	قائل ہیں، ان میں احمد، داؤد اور اہل ظاہر ہیں،

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے بھی صحیح مسلم کی شرح فتح الملہم میں ابن رشد کی تحقیقات سے استفادہ کیا ہے، بدایۃ المجتہد میں ابن رشد نے قدموں کے دھونے یا مسح کرنے کے مسئلہ میں بڑی مبسوط بحث کی ہے، جس سے اس کی ادبی و منطقی مہارت پر بھی روشنی پڑتی ہے،

---

[1] الکوکب الدری ص ۹۴ [2] اوجز المسالک الی موطا امام مالک جلد ثانی ص ۱۲

مولانا شبیر احمد نے صحیح مسلم کے "باب وجوب غسل الرجلین بکمالہا" کے تحت بڑی لمبی شرح لکھی ہے، اور آخر میں ابن رشد کی یہ رائے پیش کی ہے،

واما من طریق المعنی فقال ابن
رشد فی البدایۃ ان الغسل
اشد مناسبۃ للقدمین
من المسح کما ان المسح اشد
مناسبۃ للرؤوس من الغسل
اذ کانت القدمان لا ینقی
دنسھما غالبا الا بالغسل
وینقی دنس الرأس بالمسح
وذالک ایضا غالب والمصالح
المعقولۃ لا یمتنع ان یکون
اسبابا للعبادات المفروضۃ
حتی یکون الشرع لاحظ فیھما
معنیین معنی مصلحیا ومعنی
عبادیا اعنی بالمصلحی ما رجع
الی الامور المحسوسۃ وبا
لعبادی ما رجع الی زکاۃ
النفس (فتح الملہم شرح مسلم جزء اول ص ۴۰۴)

ابن رشد کا بیان ہے کہ مقصود کے
لحاظ سے قدموں کا دھونا مسح کے
مقابلہ میں زیادہ بہتر ہے، اسی طرح
سر کا مسح کرنا دھونے کی بہ نسبت زیادہ
مناسب ہے، کیونکہ پیروں کا میل بغیر دھلے
صاف نہیں ہوتا، اور سر کا میل صرف
مسح سے صاف ہو جاتا ہے، اور یہ
بات بہت عام ہے، فرض عبادتوں
میں عقلی مصلحتوں کا سبب بننا کوئی
انہونی بات نہیں ہے، اس طرح شریعت
نے گویا دو مقصد پیش نظر رکھے، ایک
مصلحی دوسرا تعبدی، مصلحی سے مراد
وہ امور ہیں جن کے علل وغیرہ انسان
محسوس کرے، اور عبادی سے مراد
وہ امور ہیں جن کا تعلق تزکیہ النفس
سے ہوتا ہے،

اور یہ بڑی خوش آیند بات ہے کہ ہمارے علما ابن رشد کی تحقیقات کو جگہ دینے لگے ہیں،

اس زمانہ میں اس کی بڑی ضرورت ہے کہ ابن رشد کے طریقۂ کار کو اپنایا جائے، اور ان کے طرز پر فقہ اسلامی کی تدوین کیجائے، اس سے گروہی عصبیت اور ملی افتراق کے دور ہونے میں بڑی مدد ملے گی، اب تمام ائمہ کے اقوال کو مع ان کے دلائل کے جمع کر دینا بہت آسان ہے، اس سے فائدہ ہوگا کہ اہل علم ان اقوال اور انکے دلائل کا موازنہ کرنے کے بعد جس کو چاہیں گے اختیار کر سکیں گے کسی ایک قول کی صحت پر خواہ وہ کتنا ہی ضعیف ہو، اصرار اہل علم کی شان نہیں ہے، اصل ماخذ کتاب اللہ اور حدیث رسول ہے،

قدماء میں ائمۂ مجتہدین کے تلامذہ بھی اپنے اساتذہ سے اختلاف کرتے تھے، امام شعرانیؒ نے اپنی کتاب میزان میں لکھا ہے کہ

> امام قرانی نے اس بات پر صحابہ کا اجماع نقل کیا ہے کہ عہد صحابہ میں جو شخص حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ سے فتوی لیتا تھا، وہ دوسرے صحابہ سے بھی فتوی لیکر اس پر عمل کرتا تھا اور کوئی شخص اس پر نکیر نہیں کرتا تھا[1]

امام قرانی کا یہ قول اس کا ثبوت ہے کہ جس طرح مختلف صحابہ سے فتویٰ لیکر اس پر عمل کرنا جائز تھا اسی طرح کئی ائمہ کے فتووں کو سامنے رکھکر مضبوط دلیل سے کسی معاملہ میں کسی امام کی پیروی اور دوسرے معاملہ میں دوسرے امام کی پیروی جائز ہے جبکہ تلفیق یا ہوائے نفس کی صورت نہ ہو، جو بالاجماع ناجائز ہے، اسکی اجازت صرف اہل علم کے لیے ہے، جو مختلف اقوال کے دلائل میں صحیح موازنہ کر سکیں

ابن رشد نے اپنی کتاب میں اسی صلاحیت کو پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ عامل میں خود تفقہ اور اجتہاد کا ملکہ پیدا ہو،

---

[1] میزان للشعرانی ص ۱۳۹

حکیم علوی خاںؒ دہلوی

از

جناب حکیم محمد زماں صاحب سیفی حسینی

ہندوستان کے اطباء میں ایسے چند ہی طبیب گذرے ہیں، جو اپنی ذات میں بجائے ایک فرد کے انجمن تھے، ان ہی میں ایک ذات گرامی حکیم علوی خاں کی ہے،

نام ونسب | ان کا نام محمد ہاشم ہے، والد کا اسم گرامی ہادی دادا کا مظفرالدین ہے، اصل باشندہ شیراز کے ہیں، شیراز ہی میں ۱۰۸۰ھ رمضان المبارک میں ولادت ہوئی،

تعلیم | جملہ علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل شیراز ہی میں وہاں کے اکابر علماء سے کی، فن طب اپنے والد سے حاصل کیا، اور اُن ہی کے مطب میں عملی مہارت وتجربہ میں درجۂ کمال تک پہونچے،

سفر ہند | ۱۱۱۱ھ میں دارالحکومت دہلی میں ان کا ورود ہوا، اس وقت اُن کی عمر کل اکتیس سال کی تھی، گویا عہدِ جوانی تھا، بادشاہ وقت اورنگ زیب عالمگیر نے پذیرائی کی، اور خلعت شاہی سے نوازا، اور اپنے بیٹے محمد اعظم بن عالمگیر کے ساتھ کردیا، اس کے قتل کے بعد اس کے بھائی، شاہ عالم بن عالمگیر نے ان کو اپنا مصاحب ومقرب بنالیا، اور ان کے فضل وکمال کے اعتراف کے طور پر علوی خاں کا خطاب عطا کیا، اور اپنے خصوصی مشیروں میں انھیں خاص درجہ دیا،

اس کے عہدِ سلطنت میں علوی خاں برابر درجہ بدرجہ ترقی کرتے رہے، محمد شاہ کا دور آیا، تو اُس نے بھی ان کو اپنا خاص صاحب بنایا، اور ان کو معتمد الملوک کا خطاب عطا کیا، اور اب وہ حکیم محمد ہاشم کے بجائے معتمد الملوک حکیم محمد ہاشم علوی خاں" کے معزز لقب سے مشہور ہوئے، بعد کو عوام نے "نواب" کا اس میں اضافہ کر دیا،

محمد شاہ نے اسی پر بس نہیں کیا، ان کا پچھلا منصب شاہی بڑھا کر شش ہزاری منصب پر انھیں فائز کیا، اور تین ہزار روپیے نقد ماہوار وظیفہ مقرر کیا، اس اکرام و اعزاز کے ساتھ حکیم صاحب کی زندگی گذر رہی تھی کہ نادر شاہ کی دلی میں آمد ہوگئی، وہ علوی خاں کو باصرار اپنے ساتھ ایران لے گیا،

نادر شاہ نے دلی میں حکیم صاحب سے وعدہ کیا تھا، کہ وہ ان کو حج اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لئے اپنے خرچ سے بھیجے گا، ایران پہونچ کر نادر شاہ نے یہ وعدہ پورا کیا، اور حکیم صاحب کو اعزاز و اکرام کے ساتھ سفرِ حرمین شریفین پر روانہ کیا، اور وہ حج و زیارت سے مشرف ہوئے، مگر حکیم علوی خاں کے دل میں ہندوستان کی محبت و کشش ایسی جاگزیں تھی، کہ حج سے فارغ ہونے کے بعد ایران جانے کے بجائے پھر دہلی واپس آئے، یہ واقعہ ۱۱۵۶ھ کا ہے،

دلی پہونچکر بدستور اپنے طبی مشاغل درس و تدریس اور علاج و معالجہ میں مصروف ہوگئے، اور مخلوقِ خدا کو اُن کی ذات سے فیض پہنچنے لگا، پانچ سال کے بعد حکیم صاحب کو شدید قسم کا مرض استسقا لاحق ہوگیا، ہر چند بہتر سے بہتر تدبیریں کی گئیں، مگر شفا نہیں ہوئی، اور حکیم صاحب نے اسی مرض میں وفات پائی، سنِ وفات کے متعلق دو روایتیں ہیں،

(۱) صاحب بیان الوقائع نے ۱۱۶۹ھ ۱۰ رجب تحریر کیا ہے،

(۲) اور صاحب بحرِ جہان تاب نے رجب ۱۱۶۲ھ،

۵ "بر فلک رفت مسیحائے جدید" مادۂ تاریخ ہے، وصیت کے مطابق حضرت خواجہ نظام الدین سلطان الاولیا کے مقبرہ میں دفن ہوئے۔

علی اختلاف القولین حکیم علوی خاں کی عمر ۸۰ یا ۸۲ سی سال ہوئی،

تصنیفات | حکیم صاحب نے اپنے پیچھے نہایت ہی مفید اور اہم کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جو ایک زمانہ تک مخلوقِ خدا کو فیوضِ علمی سے بہرہ ور کرتی رہیں، مگر اب یہ تمام کتابیں نا پید ہیں، مگر بعد کے اربابِ فن نے اپنی اپنی کتابوں میں حکیم صاحب کی جستہ جستہ عبارتیں نقل کرکے ان ذخائرِ علمی کا خلاصہ محفوظ کر دیا ہے، اس طرح آج بھی علوی خاں کے علمی فیوض و برکات کا سلسلہ جاری ہے، اور شائقین علم اس سے مستفید ہو رہے ہیں،

مندرجۂ ذیل کتابیں اُن کی تصنیفات میں شمار کی جاتی ہیں۔

(۱) - شرح ہدایۃ الحکمۃ للمیبذی پر مفید حاشیہ،

(۲) تحریر اقلیدس کی شرح۔

(۳) مجسطی کی شرح۔

(۴) موجز القانون کی شرح،

(۵) شرح اسباب و علامات پر قیمتی حواشی۔

(۶) احوال اعضائے نفس پر ایک کتاب،

(۷) فنِ موسیقی پر ایک رسالہ،

(۸) التحفۃ العلویہ والایضاح العقلیہ،

(۹) جامع الجوامع۔ صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں،۔ فن طب میں اس کی مماثل دوسری کتاب نہیں ہے، (نزہہ) صاحب اکسیراعظم نے کتاب کا نام بجائے جامع کے جمع الجوامع لکھا ہے، اور اپنی کتاب اکسیراعظم میں اس سے استفادہ کیا ہے، دیباچہ میں اس کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ لیکن رموز اعظم میں قرابادین جمع الجوامع لکھا ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ ادویۂ مرکبہ کی یہ کتاب جامع قرابادین ہے،

(۱۰) آثار باقیہ۔ یہ کتاب بھی فن طب میں ہے، صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں کہ ترکیب ادویہ کے بیان میں یہ کتاب حکیم علوی خاں کی عظمتِ علمی کے لئے "دلائل الاعجاز" کی حیثیت رکھتی ہے۔ (نزہۃ الخواطر)

(۱۱) عشرۂ کاملہ۔ اس کتاب کا تذکرہ صرف حکیم محمد اعظم خاں نے اکسیراعظم جلد اوّل کے دیباچہ میں کیا ہے، یہ بھی فن طب کی کتاب ہے،

(۱۲) قرابادین علوی خانی۔ فن طب میں ہے، (دیباچۂ اکسیراعظم)

(۱۳) بیاض علوی خاں طب میں۔ (علاج الامراض ص ۱۰)

یہ ان کتابوں کی فہرست ہے جو اب بالکل نایاب ہیں، میری نظر سے دو اور ایسی کتابیں گذری ہیں جو گو ان کی جانب منسوب ہیں، مگر میری تحقیق یہ ہے کہ ان میں سے ایک تو قطعی ان کی نہیں ہے، اور دوسری کا ان کی جانب انتساب مشکوک ہے۔

(۱) خلاصۃ التجارب۔ یہ کتاب فارسی میں طب کے ایسے علمی و فنی معلومات پر مشتمل ہے جس سے مصنف کی علمی عظمت کا پتہ چلتا ہے، اس کتاب میں مریضوں کے ایسے حکایات احوال بھی مذکور ہیں، جو طب کے طلبہ کے لئے رہنمائی کا کام دیتے ہیں، نولکشور پریس کانپور کی طبع شدہ ہے، میرے پیش نظر نسخہ اخیر سے ناقص ہے، اندازہ ہے کہ نصف

حصہ دو ورق سے زیادہ نہیں ہوگا جس میں طبی اوزان وغیرہ کا بیان ہے، اس لئے کہ پیش نظر کتاب کی آخری سطروں میں درج ہے کہ "باب بست و پنجم در بیان بعضے الفاظ غریبہ کہ متعارف اطبا است" "و اوزان مذکورہ در طب خصوصاً آنچہ دریں کتاب آوردہ شدہ"۔

اس کے قبل بالترتیب اور کتب طب کی طرح سب مسائل کے بیان پر کتابیں ختم ہوتی ہیں، یہ بھی اسی طرح ختم ہوئی ہے، مسائل فن کے بعد اوزان کی بحث ہوتی ہے، جو ایک ضمنی دو ورقی مسئلہ ہے، اس قرینہ کی بنا پر میرا خیال ہے کہ زیادہ سے زیادہ دو ورق اخیر سے ضائع ہوئے ہیں، جو حصہ موجود ہے، وہ چھ سو چھتیس صفحات ڈبل کراؤن سائز پر مشتمل ہے کتاب کے لوح پر سنہ طباعت درج نہیں ہے ممکن ہے اخیر کتاب میں ہو جو شکستہ ورق کے ساتھ ضائع ہوگیا،

اسی طرح خاتمہ کتاب میں مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کا علم نہیں ہوسکا، شروع کتاب میں اس زمانہ کے دستور کے مطابق حمد نعت، مصنف کا نام، سنہ تصنیف وغیرہ کا ذکر ہے، لوح کتاب پر پریس کی جانب سے درج ہے، "مجربات حکیم علوی خاں دہلوی موسوم بخلاصۃ التجارب" اسی کتاب کا ایک اشتہار مطبوعہ نولکشور کی ایک کتاب مطب علوی خاں کے کور پر اس طرح درج ہے،

"خلاصۃ التجارب، مجربات طبیہ حکیم علوی خاں مدونہ حکیم بہاء الدولہ بہادر"

اس اشتہار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب حکیم بہاء الدولہ کی سعی کا نتیجہ ہے، اور مضامین علوی خاں کے ہیں، لیکن درحقیقت واقعہ اس کے خلاف ہے، اس کی کئی وجہیں ہیں،

۱۔ دیباچہ کتاب میں بحیثیت مصنف بہاء الدولہ کا نام درج ہے، اس میں اشارۃً کنایۃً بھی اس کا تذکرہ نہیں، یہ کتاب ان معلومات طبیہ پر مشتمل ہے جو حکیم علوی خاں کے

فیض کا ثمرہ ہیں، اور وہ صرف جامع اور مرتب ہیں،

(۲) بلکہ حکیم بہاء الدولہ نے اس کے برعکس یہ لکھا ہے، کہ "ایں بیچارہ را بعضے از تجارب طبی گزشتہ است بر فوائد بدنی حاصل بود" جو اس کا ثبوت ہے، کہ یہ مجموعہ خود ان کے ذاتی تجربات کا مجموعہ ہے،

(۳) حکیم بہاء الدولہ نے دیباچۂ کتاب میں سال تصنیف سنہ ۹۰۷ھ ہجری کی تصریح کی ہے "ایں رسالہ موسومہ بخلاصۃ التجارب در اوان سنۃ سبع وتسعمائۃ" اور حکیم علوی خاں اُس کے ایک سو بہتر سال بعد ۱۰۸۰ھ ہجری میں پیدا ہوئے، (ولد بشیراز فی شہر رمضان سنۃ ثمانین والف) ایسی صورت میں اس کا انتساب حکیم علوی خاں کی جانب کیسے درست ہو سکتا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس حقیقت کے باوجود لوحِ کتاب پر نولکشور پریس کی جانب سے علوی خاں کے نام کی صراحت موجود ہے، جس سے بعض اربابِ علم کو بھی تو اس کتاب کے بارے میں دھوکہ ہو گیا ہے، چنانچہ مشہور فاضل اور بالغ نظر مصنف حکیم علی احمد نیر واسطی نے اپنے رسالہ نباض کے ایک شمارہ میں اور حکیم کوثر چاند پوری نے اپنی کتاب "اطباء عہد مغلیہ" میں خلاصۃ التجارب کو علوی خاں کی کتابوں میں شمار کیا ہے، لیکن یہ خوشی کی بات ہے، کہ مشہور طبیب اور مصنف حکیم محمد اعظم خاں رامپوری مرحوم کو یہ مغالطہ نہیں ہوا، انھوں نے اکسیر اعظم کے دیباچہ میں کتب ماخذ کے فہرست کے سلسلہ میں خلاصۃ التجارب کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ مگر کتاب کی نسبت میر بہاء الدین کی طرف کی ہے، جن کا لقب "بہاء الدولہ" ہے، حکیم صاحب نے علوی خاں مرحوم کی جانب اس کی نسبت نہیں کی ہے،

(۴) مطلب علوی خاں۔ یہ ۱۹ صفحات کا ایک مختصر طبی رسالہ ہے، جس میں معمول مطب نسخہ جات درج ہیں، نولکشور پریس کانپور میں چھپا ہے، میرے پیش نظر ۱۹۱۰ء کا

چھٹا اڈیشن ہے، اس کے اخیر میں ۵ صفحات کا ایک رسالہ مسئلہ بحران پر مصنفہ حکیم علی حسین مرحوم لگا ہوا ہے، مطب علوی خاں میں اس موضوع کی دوسری کتابوں کے مقابلہ میں کوئی خاص ندرت علمی نہیں ہے، جس سے مصنف کتاب کے بارے میں کوئی خصوصی علمی تصور قائم کیا جائے، عجیب بات یہ ہے کہ شروع رسالہ میں نہ کوئی تمہید ہے، نہ حمد و نعت ہی، اور نہ مصنف ہی کا نام مذکور ہے، اخیر میں بھی نہ کوئی خاتمہ، نہ کلمۂ خاتم، نہ نام مصنف اسی طرح کتاب کے مضامین میں بھی کہیں نہ مصنف کا نام ملتا ہے، نہ کسی شاگرد کا، البتہ صفحہ پانچ پر دو جگہ یہ درج ہے،

(۱) ضماد مستعمل حضرت قبلہ گاہی صاحب (۲) دوا معمول قدوۃ الاطباء والد ماجد

ان دونوں عبارتوں سے شخصیت کی تعیین مشکل ہے، البتہ نولکشور پریس کی طرف سے لوح کتاب پر مطب علوی خاں تحریر ہے، میرا خیال ہے کہ پریس سے اس رسالہ کے انتساب میں بھی غلطی ہوئی ہے، اس خیال کو اس قرینہ سے بھی تقویت ہوتی ہے کہ حکیم محمد اعظم خاں مرحوم جیسا وسیع النظر محقق اپنی تصنیفات کے کتب "ماخذ" میں کہیں بھی مطب علوی خاں کا تذکرہ نہیں کرتا، جب کہ علوی خاں کی دوسری کتابوں کا ذکر کیا ہے، بلکہ اُن کی بعض غیر مشہور کتابوں تک کا پتہ دیا ہے، مثلاً عشرہ کاملہ، بلا شبہہ عدم ذکر سے عدم نفی گو لازم نہیں آتا، مگر حکیم محمد اعظم خاں کی نظر سے علوی خاں کی کسی معتبر کتاب کا اوجھل رہنا بظاہر ناقابلِ یقین ہے، اس لئے اپنے خیال کی تائید کا اس کو قرینہ ضرور سمجھتا ہوں، البتہ حکیم محمد اعظم خاں مرحوم نے اکسیر اعظم کے دیباچہ ص ۵ میں حکیم علوی خاں کے شاگرد حکیم میر حسن صاحب کی ایک کتاب مطب میر حسن، کا ذکر کیا ہے، ممکن ہے کہ اس کو پریس والوں نے مطب علوی خاں کے نام چھاپ دیا ہو، اس پر نے مطب علوی کی صحت انتساب

مشکوک ہے ،

حکیم علوی خاں مرحوم نے ان بیش قیمت کتابوں کے علاوہ لائق و فائق تلامذہ کا بھی ایک بڑا حلقہ چھوڑا ہے ، ان سے مخلوقِ خدا کو جو فیض پہنچا اس کا حصہ بھی حکیم علوی خاں کے نامۂ اعمالِ خیر میں درج ہوگا ،

ان تلامذہ میں سے صرف چند کے نام مجھے معلوم ہوسکے ۔

(۱) حکیم نوراللہ صاحب مرحوم مصنف انوار العلاج ،

(۲) حکیم شناءاللہ صاحب مصنف طب اثنا ئی ، ساکن بریلی ،

(۳) حکیم میرحسن صاحب مرحوم مصنف "طب میرحسن"

(۴) حکیم اسد علی مرحوم

حکیم محمد اعظم خاں رام پوری مرحوم نے اکسیر اعظم رموز اعظم کے دیباچوں میں اسماء اطبا کے عنوان سے ان کا ذکر کیا ہے ، تلاش سے ان ناموں میں اور اضافہ ہو سکتا ہے ،

یہ ان شاگردوں کے نام ہیں جنھوں نے براہ راست حکیم علوی خاں مرحوم کے فیض صحبت سے فائدہ اٹھایا ہے ، ایسے تلامذہ جو ان کے شاگرد در شاگرد کے سلسلۂ تعلیم سے وابستہ ہیں ان کا حلقہ بہت وسیع ہے ، اور ہندوستان کے اکثر بڑے بڑے طبی خانوادے علوی خاں کے فیوضِ طبی کے خوشہ چیں ہیں ، خاندانِ اجلی دہلوی کے مورثِ اعلیٰ حکیم محمد شریف خاں جو خود استاذ الاساتذہ ہیں ، اور حکیم محمد اعظم خاں رامپوری صاحب اکسیر اعظم وغیرہ اور حکیم اعظم خاں رام پوری مرحوم کے بھانجے حکیم نجم الغنی اور دیگر قابلِ ذکر اطبا حکیم علوی خاں مرحوم کے تلامذہ میں داخل ہیں ،

علوی خاں کے بعد ہر محقق و مصنف نے اپنی طبی تصنیفات میں حکیم علوی خاں کے مجربات

ومعمولات سے استفادہ کیا ہے، اس طرح اس بلبلِ شیراز نے دبستانِ ہند کو اپنی علمی نغمہ سرائیوں سے ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا،

اس مقالہ کی تیاری میں درج ذیل کتب پیشِ نظر تھیں،

(۱) نزہتہ الخواطر مصنفہ حکیم عبدالحئی لکھنوی مرحوم ج ۶ ص ۲۰۶،

(۲) اکسیر اعظم جلد اوّل ص ۵،

(۳) رموز اعظم جلد اول ص ۳،

(۴) علاج الامراض مصنفہ حکیم محمد شریف خاں دہلوی ص ۱۰،

(۵) شرح اسباب وعلامات یوسفی لکھنو،

(۶) خلاصۃ التجارب،

(۷) مطب علوی خاں،

(۸) اطباء عہد مغلیہ، کوثر چاند پوری،

(۹) رسالہ نباض لاہور حکیم نیر واسطی،

تلخیص و تبصرہ

عُمان

" عمان ~~شرق~~ میں ایک چھوٹی سی عرب ریاست ہے، سلطان قابوس یہاں کے حکمراں ہیں، عرب دُنیا کی سیاست میں عمان کا نام بھی آتا ہے، اُس کے حالات سے بہت کم واقفیت ہے، حال کے ایک عرب سیاح نے اُس کے چشم دید حالات لکھے ہیں جو مفید معلومات پر مشتمل ہیں، اس لئے اُس کی تلخیص دی جاتی ہے "

اسلامی ممالک میں عمان غیر متمدن اور قدامت پسند ملکوں میں شمار کیا جاتا ہے، یہاں صدیوں تک خارجیوں کا تسلط رہا، جو بالعموم اباضی فرقہ سے تعلق رکھتے ~~تھے لیکن~~ ~~اب عمان شرق اردن کا دارالحکومت ہے~~، وہ سیاسی طور پر دو حصوں میں منقسم ہے ایک مسقط اور اُس کے قرب و جوار کا علاقہ دوسرا عمان جو اندرون ملک کے علاقوں پر مشتمل ہے، اور اب اس پر ہاشمی خاندان حکومت کرتا ہے، خارجیوں کا تسلط صدیوں پہلے ختم ہو چکا ہے،

ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں عمان بالخصوص اس کے ایک خوبصورت شہر نزوی کا تذکرہ بڑی دلچسپی سے کیا ہے کہ عمان سرسبز و شاداب نہروں درختوں کھجوروں کے باغات اور مختلف قسم کے پھل پھلواریوں پر مشتمل ہے جس کا ایک شہر نزوہ پہاڑ پر آباد ہے جو باغات سے گھرا ہوا ہے، یہاں کے لوگ بڑے باہمت اور بہادر ہیں، ان میں اکثر

آپس میں جنگیں رہتی ہیں، اس کے ساتھ بڑے خلیق اور عربوں جیسے مہمان نواز بھی ہیں، یہ
اُن کی عادت میں شامل ہے کہ وہ اپنے اپنے گھروں سے کھانے پینے کی چیزیں قریب
کی کسی مسجد میں لاکر کھاتے ہیں، اور اس میں ہر وارد و صادر کو شریک کرتے ہیں،
اُن کے دسترخوان پر پالتو گدھے کا گوشت بھی ہوتا ہے، اور بازاروں میں عام
طور پر فروخت ہوتا ہے، کیونکہ یہاں کے لوگ اس کو حلال سمجھتے ہیں، ان کا بادشاہ
عرب کے مشہور قبیلہ ازد بن الغوث کا ہے، جو اپنے مکان کے سامنے دربار منعقد کرتا
ہے، نہ کوئی حاجب اور وزیر ہوتا ہے، اور نہ کسی کے آنے سے روکا جاتا ہے، بادشاہ
خود شکایتیں سنتا اور فیصلہ کرتا ہے،

ابن بطوطہ سے تقریباً ایک صدی قبل عرب کے ایک دوسرے سیاح یاقوت حموی
کا اس شہر میں گذر ہوا تھا، جس نے یہاں کی پارچہ بافی کی تعریف کی ہے، اور لکھا ہے کہ
اس قسم کے ریشم کے کام اور زربافی کی مثال دوسرے عرب ملکوں میں نہیں ملتی،
لیکن یہ کپڑے بہت گراں فروخت ہوتے ہیں،

یہ تو چھ سو سال پہلے کا عمان تھا، لیکن آج بھی وہاں قدامت پسندی کے ساتھ
ساتھ غریبی جہالت اور بدحالی بدستور قائم ہے، اور صدیوں پہلے کا عمان آج بھی
وہی عمان ہے، قدامت پسندی اور بے کاری نے اُس کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے،
زرخیز زمینوں نہروں اور وادیوں کے باوجود اب تک اس سے کوئی فائدہ نہیں
اٹھایا گیا، عمان کی سرحد سے مغرب جانب نزوی کی سمت میں شمالی مغرب کے
پچاس کیلومیٹر کے بعد تقریباً ڈھائی سو کیلو میٹر کا وسیع اور سرسبز و شاداب علاقہ
جو وادی سمایل کے نام سے مشہور ہے، بالکل بیکار پڑا ہوا ہے، اور دور دور تک آبادی

کا نام و نشان نظر نہیں آتا کسی زمانہ میں یہاں آبادیاں تھیں، جن کے نشانات آج بھی جا بجا ملتے ہیں، لیکن اب ان آبادیوں کی جگہ خاردار درخت اور بوسیدہ مکانات کے ٹیلے، اور قابلِ کاشت افتادہ زمین ہیں، جو انسانی قدم کی منتظر ہیں، اگر ان طویل وادیوں میں انسانی آبادی کے نشانات ملتے بھی ہیں تو وہ چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں، جو میلوں کے بعد ایک دو نظر آجاتے ہیں، اُن کے مکانات اس قدر خستہ ہیں کہ ان سے ویرانی برستی ہے، مٹی کے کچے مکانات ہیں، جن کی چھتیں کھجور کی پتیوں اور ٹہنیوں پر قائم ہیں، یہی حال دوسرے علاقوں کا ہے، جہاں میٹھے پانی کی نہروں اور باصلاحیت زمینوں کی کثرت کے باوجود وہاں کے لوگ غربت کی زندگی گذار رہے ہیں،

سمائل کی سرسبز و شاداب وادیاں اپنی خوبصورتی اور زرخیزی کے اعتبار سے بے مثال ہیں، جگہ جگہ صاف و شفاف پانی کے چشمے، گھنے سایہ دار درخت اور بلند پہاڑوں پر پھیلے ہوئے باغات نہایت دلکش منظر پیش کرتے ہیں، یہاں کی شاعری میں سمائل کی وادیوں کا ذکر ضرور آتا ہے، یہ وادیاں فطری حُسن کے ساتھ اپنے دامن میں تاریخی واقعات بھی رکھتی ہیں، بڑے بڑے علما، صوفیہ اور امراے اکابر کی یادیں ان سے وابستہ ہیں، یہاں کی روایت کے مطابق عمان میں دعوتِ اسلام پہنچنے سے قبل سمائل ہی کے ایک شخص مازن ابن غضوبہ السعدی نے مدینہ جا کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پر اسلام قبول کیا تھا، یہاں کے والی نے اس سوال کے جواب میں کہ کیا یہاں کے سبھی لوگ کاشت کرنا جانتے ہیں، بتایا کہ ہر شخص تو زراعت نہیں کرتا، عموماً یہاں کے باشندے کویت سعودی عرب بحرین زنجبار

اور عدن وغیرہ ملکوں میں رہتے ہیں، اور وہیں ملازمت اور دوسرے پیشوں کے ذریعے اپنی زندگی گذارتے ہیں

یہی حال پورے عمان کا ہے، تمام شہروں خصوصاً دیہی علاقوں کی اقتصادی ومعاشی حالت کا انحصار زراعت اور کاشت پر ہے، ان کی اکثریت کاشت کار ہے لیکن زراعت کے جدید آلات اور کیمیاوی کھاد سے ناواقف ہونے کی وجہ سے زراعت میں کامیاب نہیں ہیں، اور جہاں صدیوں پہلے تھے، وہیں آج بھی ہیں، وہ قدامت پسندی کے دامن کو اپنے ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتے، اور اپنے آباواجداد کے طریقے کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں، بونے جوتنے کے لئے وہی پرانے ہل اور کدال استعمال کرتے ہیں

ملکی پیداوار کی کمی کی وجہ سے بیرونی برآمد بہت کم ہے، چیزیں انتہا گراں ہیں جسکو ایک معمولی شخص جو کاشت نہ کرتا ہو، نہیں خرید سکتا، عمان کی اقتصادی بدحالی اور غربت نے وہاں کے لوگوں کو دوسرے ملکوں میں ملازمت کرنے پر مجبور کر دیا ہے، عمان میں دو کروڑ آبادی کی گنجایش ہے، مگر موجودہ آبادی بیس لاکھ سے زیادہ نہیں ہے، ان کا بڑا حصہ بھی دوسرے ملکوں میں رہتا ہے، عمان میں طرح طرح کی متعدی بیماریاں پھیلی رہتی ہیں، عموماً لوگ آنکھوں اور دانتوں کے امراض میں مبتلا رہتے ہیں، سل اور ملیریا کی بیماریاں وبائی طور پر پھیلی رہتی ہیں، اسکی وجہ یہ ہے کہ آبادیوں میں گندگی بکثرت ہے، صفائی کا معقول انتظام نہیں ہے، سمائل کے ایک حاکم نے بتایا کہ صفائی کے انتظامات کی ذمہ داری وزارت صحت پر ہے جو بہت تھوڑے علاقوں میں محدود ہے اس کے اخراجات وزارت اوقاف برداشت کرتی ہے، جہاں صفائی کا کچھ انتظام ہے، وہ بھی ناقابل اطمینان ہے، ہر جگہ سڑکوں اور بازاروں

میں گندگی کے ڈھیر نظر آتے ہیں، ان گندگیوں کی وجہ سے آئے دن وبائی امراض پھیلے رہتے ہیں، خصوصاً نزوی کے باشندے طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا نظر آتے ہیں لیکن اس کے باوجود اتنے بڑے شہر میں طبیبوں کی کمی ہے، اور کوئی ایسا سول اسپتال نہیں ہے جو یہاں کے شہریوں کے لیے کافی ہو، ایک ہندوستانی طبیب بڑی محنت اور دلچسپی سے مطب کرتے ہیں، ان کو وزارت صحت کی طرف سے سہولتیں بھی ملی ہوئی ہیں، جن میں ایک پختہ عمارت بھی شامل ہے، جو اس شہر کا گویا اسپتال ہے، انھوں نے بتایا کہ یہاں آنکھوں کی بیماریاں وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہیں، سل ملیریا، اور اسہال کا مرض عام طور پر ہوتا ہے، ایسی حالت میں یہاں کم سے کم دس بارہ اطبا کی ضرورت ہے، اس لیے کہ نزوی عمان کا مرکزی شہر ہے جہاں دوسرے مقامات کے مریض بھی پہنچتے رہتے ہیں،

عمان میں تعلیم کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا، بچوں کی ابتدائی تعلیم عموماً کھجور کے باغوں میں کسی معلم کی سرپرستی میں ہوتی تھی، جو معلم کے لیے وقف ہوتا تھا، مگر ادھر چند سالوں سے کئی مدرسے قائم ہو چکے ہیں، اس وقت نزوی میں تقریباً پانچ مکاتب قائم ہیں، ان مکاتب میں گذشتہ سال سات سے سترہ سال تک کی عمر کے تقریباً پانچ سو طلبہ داخل ہوئے، اسی طرح سمائل میں متعدد ابتدائی مدرسے قائم ہیں، جن میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ علوم عصریہ کی بھی تعلیم ہوتی ہے حکومت بھی اس میں دلچسپی لے رہی ہے، چنانچہ سمائل کی ایک نامور شخصیت شیخ سعود خلیلی کو تمام عمان کے مدرسوں کا ذمہ دار بنا دیا گیا ہے، جنھوں نے عمان کی تعلیمی مہم کے لیے مختلف اسلامی ممالک کا دورہ کیا ہے، اب آئندہ سال عمان

کے مختلف حصوں میں بیالیس ۴۲ مدرسوں کے قیام کا منصوبہ ہے، جن میں دس لڑکیوں کے لیے خاص ہوں گے،

عمان کے بڑے شہروں میں نزوی، فہود، میناء الفحل اور صحار امشہور ہیں، صحارا ساحلی علاقہ ہے، اور عمان کا سب سے زیادہ متمدن اور خود کفیل شہر شمار کیا جاتا ہے، یہ تاریخی بندرگاہ بھی ہے، جہاں سے چینی تجارتی سامان درآمد برآمد ہوتا تھا، اس لیے اس کو خزانۂ شرق بھی کہتے ہیں، ابو اسحاق اصطخری نے اس کو بلاد اسلامیہ میں سب سے زیادہ متمول اور تجارتی بندرگاہ بتایا ہے، آج بھی یہ بہت آباد اور پر رونق اور ساحل باطنہ کے تمام علاقوں میں ممتاز ہے یہاں کا ذریعہ معاش زراعت مچھلی اور موتیوں کی تجارت ہے،

میناء الفحل بھی ساحلی علاقہ ہے، اور عمان کے تیل کا سب سے بڑا اسٹیشن ہے، فہود میں تیل کی دریافت کے بعد سے روز بروز آبادی بڑھتی جا رہی ہے اور جدید طرز کے مکانات بنتے جا رہے ہیں،

عمان میں تیل کی دریافت اس کی ترقی کا پہلا زینہ اور اس کی اقتصادی تاریخ میں بہت بڑا انقلاب ہے، فروری ۱۹۵۴ء میں ماہرین ارضیات کی ایک جماعت نے الربع الخالی کے نشیبی علاقوں میں تیل کی تلاش شروع کی اور اسی سال اکتوبر میں پٹرولیم کی تلاش کے لیے کھدائی بھی شروع ہو گئی، لیکن چھ مہینہ کی مسلسل جد وجہد کے باوجود خاطرخواہ کامیابی نہیں ہوئی، اس مدت میں چار کنویں کھودے گئے، جن پر ایک کروڑ بیس لاکھ اسٹرلنگ صرف ہوا، بالآخر اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے پانچ کمپنیوں نے آپس میں معاہدہ کیا، لیکن اس کام میں ناکامی کے بعد ان میں سے

تین کمپنیوں نے دستبردار ہونے کا اعلان کر دیا، جن میں فرانس کے ساتھ برطانیہ کی بی پی اور نیو جرسی کی اسٹینڈرڈ موبل کمپنی شامل تھے۔ باقی دو کمپنیوں نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور فروری ۱۹۶۴ء میں گذشتہ کنوؤں سے کچھ دور ہٹ کر کھدائی شروع کی۔ اس مرتبہ تیل کا بہت بڑا چشمہ ابل پڑا۔ اب یہ تیل کا ذخیرہ شیل اور پارٹیکس کے ٹھیکہ میں ہے، جس میں شیل کی کمپنی ۸۵ فی صد کی حصہ دار ہے، اور دوسری پندرہ فی صد کی۔ موجودہ چشمہ سے تین لاکھ تیس ہزار ڈرام یومیہ تیل حاصل ہوتا ہے، جب کہ ۱۹۶۷ء میں اسکی رفتار ایک لاکھ چالیس ہزار ڈرام تھی۔ فی الحال فہود سے حلوتک تین سو کیلومیٹر کے پائپ پھیلا دیے گئے ہیں، اور دوسرے چشموں کی تلاش جاری ہے۔ اس طرح عمان بہت جلد خود کفیل ہو جائے گا اور اس کی ترقی کی راہیں کھل جائیں گی، یہاں کی حکومت نے شفا خانوں اسکولوں اور سڑکوں کے بنانے کا پروگرام بنایا ہے، اور حتی الامکان ترقی کے لیے کوشاں ہے، چنانچہ غیر ملکی سیاحوں کے لیے دو بڑے پیمانہ پر ہوٹل بن چکے ہیں اور دیگر تعمیری کاموں میں ہاتھ لگا ہوا ہے۔ دو رسالے بھی شائع ہوتے ہیں جو ملک کی ذہنی تعمیر اور سیاسی مباحث میں حصہ لیتے ہیں۔ دوسرے ملکوں میں سرکاری سطح پر خیرسگالی کے لیے وفد بھی بھیجے جا رہے ہیں، جن کے اب تک اثرات ملک کی تعمیر اور استحکام کے لیے مفید ثابت ہوئے ہیں۔ عمان کے ایک حاکم نے اپنی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے بڑے وثوق سے کہا کہ ہم جن مشکلات سے دوچار ہیں، دنیا کو اس کی خبر نہیں، لیکن آیندہ پانچ سال کے اندر ہم وہ نہیں رہیں گے جو آج ہیں۔

مکتوب حمید

از ڈاکٹر حمید اللہ صاحب پیرس

پیرس کے رومانی کلیسا کے ایک پادری کرنسان ورژیل جارج نے فرانسیسی زبان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ایک کتاب لکھی تھی، اس کا ترجمہ فارسی میں ہوا تھا، فارسی سے مولانا وارث علی ایم، اے فاضل دیوبند نے اردو میں منتقل کیا، مئی ۱۹۶۱ء میں معارف میں اس پر ریویو ہوا، اس میں مترجم نے مصنف کا جو تعارف اور کتاب کے متعلق جو رائے لکھی تھی، ریویو میں اس کو نقل کر دیا گیا تھا، اور کتاب میں جو غلطیاں نظر آئی تھیں، ان کو ظاہر کر دیا تھا،

مشہور فاضل ڈاکٹر حمید اللہ کتاب کے مصنف سے پوری طرح واقف ہیں اور فرنچ میں اصل کتاب ان کی نظر سے گذر چکی ہے، ان کے بارہ میں انکی رائے اس سے بالکل مختلف ہے، جو اردو کے مترجم نے ظاہر کی ہے، اس لیے ان کی نظر سے جب معارف کا ریویو گذرا تو انھوں نے مصنف اور تصنیف کی اصل حقیقت لکھ کر بھیجی،

معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے جن قابل اعتراض باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، ان کو فارسی کے مترجم نے حذف کر دیا تھا، یہ کتاب

ہماری نظر سے گذری ہے، بعض غلطیوں کے سوا جن کی مترجم نے حاشیہ میں تصحیح و تردید کر دی ہے، کوئی اہم قابل اعتراض بات نظر میں نہیں آئی، مصنف کے متعلق اردو کے مترجم کو فارسی ترجمہ سے جو حالات معلوم ہوئے، وہی انھوں نے اپنے مقدمہ میں نقل کر دیے، اس لیے وہ اس میں بھی بے قصور ہیں لیکن ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے سامنے اصل فرانسیسی کتاب ہے، اور مصنف کے حالات سے پوری طرح واقف ہیں، اس لیے ان کا بیان بھی صحیح ہے، بہر حال ان کے خط سے دونوں کے متعلق غلط فہمیوں کی تصحیح ہوتی ہے، اس لیے ان کا خط شائع کیا جاتا ہے۔　　　م

مخدوم و محترم زاد مجدکم

سلام مسنون و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

مئی کا رسالۂ معارف آج ۲۹ جولائی کو یہاں پہنچا، سارے کام چھوڑ کر اس کا مطالعہ کیا، چشم بد دور۔

اگر اجازت مرحمت ہو تو عرض کروں کہ مطبوعات جدیدہ کی تنقید میں "پیغمبر اسلام" مترجمہ وارث علی صاحب کے متعلق "ض" کے معلومات اصلاح طلب ہیں،

ورژیل جارج کا صحیح تلفظ ورجیل گیور گیو ہے، یہ نہ کبھی مسلمان ہوا اور نہ "بائیس سال کے مطالعہ و تحقیق" کے بعد یہ کتاب لکھی، یہ شخص ابھی زندہ ہے، پارس میں رومانوی کلیسا میں پادری اور راہب ہے، زندگی افسانہ نویسی میں گذری اور کئی ناولوں پر ادبی انعام بھی ملے، سیرت نبویؐ پر بھی ایک افسانہ لکھا ہے، اور غالباً بائیس ہفتوں میں نہ کہ بائیس سال میں۔

مولف کی دیانتداری کا اس سے اندازہ لگایا جائے کہ اسے عربی رسم الخط بھی نہیں آتا لیکن کتاب میں عربی کتابوں کے راست حوالوں میں نہ صرف مطبوعات ہیں بلکہ ایسے مخطوطات بھی جن کا دنیا میں صرف ایک نسخہ ہے اور مولف نے ان کی کبھی صورت بھی نہیں دیکھی ،

پارلیس کے ایک مسلمان نے مولف ہی کی درخواست پر کتاب کی تاریخی اغلاط کی ایک فہرست مرتب کر دی جو ۴۲ صفحوں میں تھی ، چند ماہ بعد مولف نے ایک اخبار میں ایک مضمون اپنی کتاب کی تعریف اور خلاصے میں چھاپا اور اس میں یہ جملہ بھی تھا کہ فلاں فاضل و ممتاز مولف نے اس کتاب کو غور سے دیکھکر اس میں جو غلطیاں پائیں وہ "نہایت قلیل وحقیر صرف املاء کی غلطیوں پر مشتمل ہیں"۔

مولف کا انداز یہ ہے کہ کسی انتہائی نامناسب (اور غلط) چیز کا رسول اکرمؐ کی طرف انتساب کرے ، پھر اس کی تائید میں کہے : "مگر وہ اللہ کا پیغامبر تھا ، اسے قطعاً حق تھا کہ جو چاہے کرے"۔ انتہائی فحش اور پاجی پن کی چیزیں بھی اصل کتاب میں ہیں ،

چونکہ شکر میں لپیٹ کر اسلام اور رسول اکرمؐ کے متعلق رکیک باتیں لکھی گئی ہیں مشنری اس کتاب کو خوب پھیلا رہے ہیں ، اور ہمارے بھولے مسلمان بھی نادانستہ اس کے ترجمے کر کے (جو ممکن ہے ، حذف و اضافہ و تحریف کے بعد ہی ہوں) اس گناہ میں شریک ہو رہے ہیں ۔

اگر مناسب ہو تو اسے بھی چھاپ دیجئے

المفتقر الی اللہ

محمد حمید اللہ

ادبیات

بیانِ حقیقت

از جناب ڈاکٹر ولی الحق صاحب انصاری

ماہ و انجم سے پرے فکرِ بشر جاتی ہے — عقلِ اول کے جہاں جلتے ہیں پر جاتی ہے

سقفِ افلاک سے بھی ہو کے گذر جاتی ہے — کیا بتاؤں میں کہاں تک یہ نظر جاتی ہے

منزلِ شوق کو جو راہ گزر جاتی ہے — اپنے دامن میں لیے تحفۂ سر جاتی ہے

کیا خبر آتی ہے کس سمت سے یہ جوئے حیات — کیا پتہ ہو کے یہاں سے یہ کدھر جاتی ہے

خنجر و تیغ سے بھی ہو نہیں سکتا ہے کبھی — ایک معصوم نظر کام جو کر جاتی ہے

جو ہر ذات مصائب سے نہیں ہوتے فنا — خاک میں ملنے سے کب آب گہر جاتی ہے

آبروئے دل کی بہت ہم نے بچائی تھی مگر — اب وہ تیرے سبب اے دیدۂ تر جاتی ہے

جبرِ قدرت کو سمجھ بیٹھے ہیں جو ورِ اجل — دستِ قاتل کی جفا تیغ کے سر جاتی ہے

روحِ انساں کا سکوں خواہ مٹے اسکے سبب — قلبِ انساں سے کہیں خواہشِ زر جاتی ہے

گاہ شعلوں میں نمو پاتی ہے یہ روحِ حیات — اور کبھی لمس سے شبنم کے بھی مر جاتی ہے

رخ پہ تا حشر رہے گا یہ ترے داغِ ستم — ہم پہ جو کچھ بھی گزرتی ہے گزر جاتی ہے

فن و فنکار تو بکتے ہی رہے ہیں لیکن — آج تو حرمتِ ناموسِ بشر جاتی ہے

آج تو مشتق ہے پاکیزگیٔ حسن و جمال آج تو آبروئے اہلِ نظر جاتی ہے

نشرِ نکہتِ گل لے کے گلستاں سے وہی

پھر اسیروں کی طرف بادِ سحر جاتی ہے،

غزل

جناب عروج زیدی

بحمد اللہ نظر کے سامنے ہے سوادِ حاصل تک مگر سعیِ طلب محدود کب ہے ایک منزل تک

الجھ کر بات جب پہنچی نزاعِ حق و باطل تک تلاشِ دوست میں جانا پڑا مجھکو درِ دل تک

خوشا وقت پسندی، سخت جانی، حوصلہ مندی مرے ہاتھوں پریشاں ہو گئی ہر میری مشکل تک

یہاں تو فاصلے ہی فاصلے، دوری ہی دوری ہے وفا ناآشنا دل سے پرستارِ وفا دل تک

کہاں تلوؤں کے چھالے اور کانٹے، یہ حقیقت ہے ترے قدموں پہ لے رہبر! نہیں ہو گرد منزل تک

ذرا سی جنبشِ پردہ سے نظمِ ہوش برہم ہے بکھر سکتا ہے وقتِ دید تو شیرازۂ دل تک

مری نظریں بلند و پست کا معیار ہیں شاید ہزاروں محفلیں تھیں راستہ میں تیری محفل تک

جو موجیں میری کشتی کو ڈبو دینے میں کوشاں تھیں وہ موجیں کیوں پلٹ کر آئی ہیں یاران ساحل تک

طربناکیٔ آغازِ محبت بھی مسلّم ہے مگر یہ بات پہنچے گی شکستِ شیشۂ دل تک

میں رنگِ بزمِ محفل دیکھنے سے قبل کیوں اٹھوں اگرچہ میرے دشمن ہیں در و دیوارِ محفل تک

فضا افروز نظریں ہیں، تصور خوبصورت ہے یہ دنیا بھی حسیں ہے فطرتِ رنگینیٔ دل تک

خدا کی شان ہے وہ جانِ محفل، شانِ محفل ہیں جنھیں آتے نہیں اے دوستو! آدابِ محفل تک

عروج! ان سرفروشانِ وفا پر رشک آتا ہے

خراجِ داد دیتا ہے جنھیں شورِ سلاسل تک

فریب سکون

از

جناب بدر الزماں صاحب ایڈوکیٹ

گل کو تجدید رنگ و بو کی خلش — دل کو اظہار آرزو کی خلش
حسن کو بے نیاز کیوں کہئے — شکنِ زلفِ مشکبو کی خلش
ہمہ عالم فریب نقش خیال — عقل کو ریزا دتو کی خلش
ہمہ طاعت اسیر حور و قصور — رند کو ساغر و سبو کی خلش
چشم کو اضطرب دید جمال — ذوق کو کیفِ گفتگو کی خلش
کس کو حاصل ہوا فراغ و سکون — خلوت وصل میں عدو کی خلش
وصل کو منزلِ سکوں نہ کہو — دامن زخم کو رفو کی خلش
رند مصروف شغل پردہ دری — چشم ساغر کو آبرو کی خلش
نفس بیگانۂ خلوص و نیاز — پھر بھی پیرا ہن نکو کی خلش

تو ہے اک پیکر تغافل کیش
اور مجھے تیری جستجو کی خلش

حیات شبلی

مولفہ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ۔

جدید اڈیشن — قیمت عہ

مطبوعاتِ جدیدہ

فریبِ تمدن: ازجناب اکرام اللہ صاحب ایم اے، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات: ۵۰۰ مجلد مع گردپوش قیمت: عنہ، پتہ:- اقبال پبلشرز فتح گنج، امین آباد روڈ، لکھنو۔

یورپ نے سائنسی اور صنعتی حیثیت سے جیسی حیرت انگیز ترقی کی ہے، اسی قدر وہ اخلاقی ومعاشرتی حیثیت سے زوال وانحطاط کا شکار ہوا ہے، اور اب وہاں جنسی بے راہ روی اور جرائم اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ انسانیت وبہیمیت میں کوئی فرق ہی نہیں رہ گیا ہے، لائق مصنف نے اس کتاب میں مغربی تہذیب وتمدن کے اسی پہلو کا مفصل جائزہ لیا ہے، اور اس کی سفلیت وبہیمیت کو پوری طرح بے نقاب کیا ہے، یہ کتاب چار حصوں اور بارہ ابواب میں منقسم ہے، پہلے حصہ کے ابواب میں انسانی جذبات اور شہوانیت کو برانگیختہ کرنے والے محرکات فحش نگاری، عریانیت، مینوشی، قماربازی، رقص وسرود، فلموں، اور ڈراموں کی کثرت اور دوسرے حصہ میں یورپ کی فحش کاری، صنفی آوارگی کے واقعات کی تفصیل پیش کی گئی ہے تیسرے حصہ میں اس حیوانی زندگی کے سنگین نتائج اور اس سے پیدا ہونے والے پیچیدہ مسائل یعنی منع حمل، اسقاط، ناجائز ولادت، جرائم وتشدد کی کثرت، اور مادی جسمانی اور طبی نقصانات کا ذکر ہے، آخری حصہ مغربی دانشوروں کے اُن بیانات پر مشتمل ہے، جن میں مغربی تہذیب وتمدن کی ناکامی کا اعتراف، اور اس پر سخت بے اطمینانی کا اظہار کیا گیا ہے

اس سلسلہ میں اس کے مرض کی تشخیص اور طریقۂ علاج وغیرہ کے متعلق مغربی و مشرقی مفکرین کے خیالات بھی درج کئے گئے ہیں، مصنف نے یہ سب باتیں مستند حوالوں سے بڑی تفصیل کے ساتھ لکھی ہیں، اور اعداد و شمار کا نقشہ بھی دیا ہے، اس ناگفتنی کی حکایت کا مقصد ایشیائی و افریقی ممالک کو متنبہ اور خبردار کرنا ہے جو یورپ کی اصل خوبیوں کے بجائے انہی لعنتوں کا طوق اپنی گردن میں ڈالنا چاہتے ہیں حالانکہ بقول اقبال

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور

مصنف کا جذبہ بہت نیک اور بڑا قابلِ قدر ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بارآور بنائے

ہندوستان کی مسجدیں مرتبہ جناب ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی صاحب ایم اے ڈی لٹ۔
متوسط تقطیع، کاغذ بہتر طباعت ٹائپ صفحات ۵۰ مصور قیمت ۵ روپیے پبلیکیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند اولڈ سیکریٹریٹ دہلی، نمبر ۶۔

ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی نے جو حکومت ہند کے فارسی و عربی کتبات محکمۂ آثار قدیمہ کے سپرنٹنڈنٹ ہیں، اس کتاب میں ہندوستان کی چند اہم اور ممتاز مسجدوں کا تذکرہ کیا ہے، شروع میں اسلام میں مسجد کے مقام، اس کی تعمیر کے آغاز و ارتقاء کا پھر خاص ہندوستان میں مسجدوں کی تعمیر کی ابتدا، طرز تعمیر کی نوعیت اور ترقی وغیرہ دکھائی گئی ہے، آخر میں دلی بنگال، جونپور، گجرات، احمدآباد، بیجاپور، حیدرآباد، سری نگر، آگرہ، فتحپور سیکری، اور سرنگا پٹن کی خاص خاص مساجد کے متعلق ضروری معلومات بانیوں اور سنہ تعمیر کی تعیین، ان کے وسعت، رقبہ، عام کوائف اور اہم خصوصیات وغیرہ بیان کئے گئے ہیں، اور ان کے عکسی فوٹو دیئے گئے ہیں، غالباً اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے، جو ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کے عہد کی شاندار

اہم مسجدوں کے متعلق مفید اور مستند معلومات پر مشتمل ہے، اور ہندوستانی تاریخ اور آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے خاص طور پر لائق مطالعہ ہے،

سچے نبی کی سچی باتیں مرتبہ شفاء الملک حکیم عبد اللطیف صاحب مرحوم لکھنوی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۸۲، مجلد قیمت عہ، ناشر کتاب آزاد گھر کلاں محل دہلی، نمبر ۶،

اس میں حدیث کی مشہور و معتبر کتاب صحیح بخاری کی ان حدیثوں کا اردو ترجمہ کیا گیا ہے جس کا تعلق عورتوں اور بچوں سے ہے، انکے متعلق ہدایات بیان کی گئی ہیں، اس طرح اس میں طہارت، عبادت، معاشرت، اخلاق اور معاملات و آداب وغیرہ مختلف النوع ابواب کی حدیثوں کا ترجمہ آگیا ہے، اگر ان کو مختلف عنوانات کے تحت جمع کیا گیا ہوتا، اور بعض تشریح طلب حدیثوں کی تشریح بھی کی گئی ہوتی تو اس کا افادہ بڑھ جاتا، شروع میں ایک مفید مقدمہ بھی ہے، لیکن اس میں علماء و مشائخ کے بارہ میں جس رائے کا اظہار کیا گیا ہے اس میں انتہا پسندی اور بے اعتدالی پائی جاتی ہے، یہ مجموعہ عورتوں اور بچوں کی اصلاح و تربیت کے نقطۂ نظر سے بہت مفید ہے، اللہ تعالیٰ مصنف کو اس دینی خدمت کا صلہ عطا فرمائے،

مقدمہ شعر و شاعری (حالی) مرتبہ نمبر ۱ تا ۳ جناب رشید حسن خاں صاحب
موازنۂ انیس و دبیر (شبلی) نمبر ۴ و ۵ ڈاکٹر محمد حسن صاحب و نمبر ۶
دیوان درد، انتخاب میر صدیق الرحمن صاحب قدوائی چھوٹی تقطیع
انتخاب سراج اورنگ آبادی کاغذ، کتابت وطباعت بلند پایہ صفحات
و انتخاب اکبر الہ آبادی بالترتیب ۲۳۵ مجلد، ۲۴۴ غیر مجلد، ۱۰۰ مجلد ۸۶ و نمبر غیر مجلد، ۹۹ مجلد، ۱۰۰ غیر مجلد، قیمت بالترتیب عہ، سے، عہ، سے،

ہم ، ۶عا، پتہ :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ، نمبر ۲۵،

مکتبہ جامعہ نے حکومت جموں وکشمیر کی مالی مدد سے قدیم معیاری اور کلاسیکل کتابوں کے جواب کمیاب ہیں نئے اڈیشن شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے، مذکورۂ بالا کتابیں اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، ان میں اوّل الذکر دو میں اردو تنقید کی دو اہم اور بنیادی کتابیں ہیں جن سے فن تنقید کے غیر معمولی ارتقا کے باوجود ناقدینِ فن بے نیاز نہیں ہو سکے ہیں، دوسری چاروں کتابیں اردو شعر و سخن کے نامور اساتذہ کے دواوین ہیں، ان میں دیوانِ درد کے علاوہ جو خود سراپا انتخاب ہے، سب منتخب کلام پر مشتمل ہیں، ہر کتاب کے شروع میں فاضل مرتبین کے قلم سے مختصر تعارف بھی شامل ہے جس میں مصنفین کے فنی کمالات، ادبی مرتبہ کتابوں کی اہمیت، اور فنی حیثیت وغیرہ پر تبصرہ کیا گیا ہے، یہ سب کتابیں متن کی صحت، طباعت کی نفاست اور حسن و آرائش کے ظاہری لوازم کے ساتھ نہایت اہتمام سے شائع کی گئی ہیں، ان کی اشاعت، ادبی خوش مذاقی بھی ہے، اور مفید ادبی خدمت بھی، اس کے لئے مکتبہ جامعہ اور مرتبین اردو زبان و ادب کے قدردانوں کے شکریہ کے مستحق ہیں،

جگر بریلوی شخصیت اور فن مرتبہ جناب مالک رام صاحب و سیفی پریمی صاحب متوسط تقطیع کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۹۶، مجلد قیمت سے، ناشر علمی مجلس ۱۴۲۹ چھتہ نواب صاحب، فراشخانہ دہلی، نمبر ۶،

جناب شیام موہن لال جگر بریلوی اردو زبان کے نامور شاعر اور نکتہ سنج ادیب ہیں، اس کے باوجود ان کو جیسی شہرت ملنی چاہئے تھی نہیں ملی، زیرِ نظر کتاب جگر صاحب کے کمالات کے اظہار کے لئے شائع کی گئی ہے، جو ان کے حالات، سیرت و شخصیت، ادبی خدمات اور فنی کمالات پر مشتمل ہے، یہ کتاب درحقیقت مختلف اہلِ قلم کے مضامین کا مجموعہ ہے اکثر مضا

ہندو اصحاب قلم کے ہیں، شروع کے دو مضامین خود جگر صاحب کے ہیں، ایک میں ان کے خود نوشت اور دوسرے میں اُن کی اہلیہ کے حالات ہیں، ایک مضمون میں ان کی صاحبزادی نے اُن کی گھریلو زندگی دکھائی ہے، یہ تینوں مضامین دلچسپ ہیں، باقی مضامین میں اُن کی شاعری کے مختلف اصناف اور پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے، ایک اہل کمال اور صاحب فن کی یہ قدردانی لائق تحسین ہے،

ندائے ملت رسول نمبر مرتبہ جناب محمد عبد القدوس، حکیم عبد القوی نور عظیم (حصہ اول و دوم) ندوی، نذر الحفیظ ندوی صاحبان لبا سائز مجموعی صفحات اصل وضمیمہ ۲۳۲ قیمت: عار اور قیمت ضمیمہ ۰۷ پیسے، پتہ: دفتر ندائے ملت ۹۹ گوئن روڈ، لکھنو،

ہفت روزہ ندائے ملت لکھنو ملی و قومی مسائل پر سنجیدہ و باوقار مضامین بے لاگ اور جرأتمندانہ تبصروں کی وجہ سے مسلمانوں میں بہت مقبول ہے، اس کے سال میں بعض خاص نمبر بھی شائع ہوتے ہیں، اس سال ربیع الاول کے موقع پر "رسول نمبر" بڑے اہتمام سے شائع کیا گیا ہے، جو تعلیم نمبر کی طرح وقیع اور پُر از معلومات ہے، اس کے اکثر مضامین ہیں تو پرانے اور ماخوذ لیکن ان کو اس سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے، کہ نئے معلوم ہوتے ہیں "اوراق زریں" کے عنوان سے رسول اللہؐ کی سیرت و ارشادات کی تلخیص کی گئی ہے، جو خاص طور پر لائق مطالعہ ہے، جس کے بعد سابق و موجود اکابر علما و اصحاب قلم کے اصل مضامین یا ان کے ترجمے مختلف جاذب نظر اور دلآویز عنوان کے تحت شامل کئے گئے ہیں، شروع میں قدیم و جدید شعرا کی عربی، فارسی، اور اردو نعتوں کا گلدستہ بھی ہے، نمبر کی ضخامت بڑھ جانے کی وجہ سے بعد میں اس کا ضمیمہ بھی شائع کیا گیا ہے، یہ بھی سیرت پر مفید مضامین پر مشتمل ہے، یہ رسول نمبر زود اور قابلِ

کے رسول نمبروں سے زیادہ بلند پایہ، جامع اور سیرت نبویؐ کے مختلف پہلوؤں کا عکاس ہے۔

جنرل سائنس مرتبہ مولانا عزیز احمد قاسمی بی اے، جامعہ، تقطیع کلاں، کاغذ و کتابت و طباعت اچھی، صفحات: ۱۴۰ - قیمت: للعہ، پتہ بک ڈپو دیوبند۔ یو۔ پی،

لائق مصنف دارالعلوم دیوبند میں جنرل سائنس اور انگریزی کے استاذ ہیں، یہ کتاب انھوں نے مبتدیوں اور عربی خواں طلبہ کی جنرل سائنس کے مبادیات اور بنیادی مسائل سے واقفیت کے لئے لکھی ہے، اس میں پہلے طبیعیات و کیمیا کے سلسلہ میں مادہ کی حقیقت و اقسام، ہوا، بجلی، پانی، اور نور کی ماہیت، اُن کے اجزاء و عناصر اور آخر میں حیاتیات (حیوانات اور نباتات) کی خصوصیات، کیفیات، اور قسموں کے بارہ میں بنیادی اور ضروری معلومات تحریر کئے گئے ہیں، اور جا بجا سائنسی مسائل کے ساتھ دینیاتی مباحث بھی ٹانک کر دونوں میں تطبیق کی گئی ہے، یہ موضوع خشک تھا لیکن مصنف کے انداز تحریر نے اس کو دلچسپ بنا دیا ہے، آخر میں جنرل سائنس کے اصطلاحی انگریزی الفاظ کے اردو تلفظ و معنی دیئے گئے ہیں، عربی مدارس میں جدید علوم و مضامین کے مبادی کی تعلیم دینے کا اہتمام، اور دارالعلوم دیوبند کی طرح اس کتاب کو اپنے نصاب میں شامل کرنے کی ضرورت ہے۔

(ض)

ہماری بعض نئی مطبوعات

مقالات سلیمان جلد اوّل تاریخی

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے ان اہم تاریخی مضامین کا مجموعہ جو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر لکھے۔ قیمت: للعہ

مقالات سلیمان جلد دوم تحقیقی

سید صاحب کے علمی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں ہندوستان میں علم حدیث، محمد بن عمر الواقدی، عرب امریکہ، اسلامی رصدخانے کے علاوہ اور بھی بہت سے محققانہ مضامین ہیں۔ قیمت: لعہ

مقالات سلیمان جلد سوم قرآنی

مولانا سید سلیمان ندوی کے مقالات کا تیسرا مجموعہ جو قرآن کے مختلف پہلوؤں اور اس کی بعض آیات تفسیر و تعبیر سے متعلق ہیں۔ (زیر طبع)

مقالات عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور تقریروں کا مجموعہ۔ قیمت: غہ

تذکرۃ المحدثین (جلد اوّل)

دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک صحاح ستہ کے مصنفین کے علاوہ دوسرے ۲۱ مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام وغیرہ کے حالات و سوانح، اور ان کے خدمات حدیث کی تفصیل، مرتبہ مولوی ضیاء الدین اصلاحی رفیق دارالمصنفین۔ قیمت: ۵عہ

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری حضرت شمس تبریز کی ملاقات کی روداد، اور ان کی زندگی کے بہت سے واقعات کی تفصیل، مؤلفہ قاضی تلمذ حسین صاحب مرحوم، قیمت:- غہ

کشمیر سلاطین کے عہد میں

جنت نظیر کشمیر میں مغل فرمانرواؤں سے پہلے جن مسلمان فرمانرواؤں کی حکومت رہی ہے اور جنھوں نے اس کو ترقی دیکر رشک جناں بنا دیا، ان کی بہت ہی مستند اور مفصل سیاسی و تمدنی تاریخ، مترجمہ علی حماد عباسی ازغلی ایم اے قیمت ۵عہ

(منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ)

رجسٹرڈ نمبر ال (۲۰) ستمبر ۱۹۷۱ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

(کتبہ اقبال احمد)

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارمِ اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات و احکام و قوانین کے لحاظ سے بلا تفریق مذہب و ملت، نسل و رنگ، زاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے، اس کو اختیار کرنے اور اسی کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے یہاں اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے حق میں اہلِ کتاب اور مشرکینِ عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب داخل ہیں، اور حیوانات کے حقوق، ان سب کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات ان کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں اُن کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا ہے۔

……((مرتبہ))……

شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت: ۳۲۰ صفحے قیمت: ؎

جلد ۱۰۸ ماہ رجب المرجب ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۷۱ء عدد ۳

مضامین

مقالات

آثار تاریخیہ

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

بعض چیزیں اپنی جگہ پر بالکل صحیح اور حقیقت ہوتی ہیں، اگر ان کو دائرے میں رکھا جائے تو ان سے بڑے مفید کام لیے جا سکتے ہیں لیکن انکے غلط استعمال سے اسی قدر ہلاک نتائج بھی نکلتے ہیں، اسکی مثال آزادی، وطنیت اور قومیت ہے۔ آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے جس سے اسکو کوئی طاقت محروم نہیں کر سکتی۔ اسلام میں انسانی آزادی کی اتنی اہمیت ہے کہ اس نے اس کو خدا کی بندگی کے سوا ہر قسم کی غلامی سے آزاد کر دیا، اور ادنیٰ و اعلیٰ کے امتیازات مٹا کر سارے انسانوں کو ایک سطح پر کھڑا کر دیا لیکن اگر آزادی، مذہب، قانون، اخلاق انسانی شرافت اور تہذیب و شائستگی سے آزادی کا نام ہے تو یہ انسانیت کے لیے سب سے بڑی لعنت اور اس کی تباہی کا پیام ہے۔

اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو آجکل آزادی محض سیاسی آزادی کا نہیں بلکہ ہر قید و بند سے آزادی کا نام ہے جس سے زندگی کا کوئی شعبہ بھی مستثنیٰ نہیں، گھر کی چار دیواری سے لیکر سیاست کے میدان اور حکومت کے ایوانوں تک آزادی کا ایک طوفان بپا ہے، مذہب و اخلاق تو فرسودہ ہو چکے، ان کا تو سوال ہی نہیں، ملکی قوانین کا بھی احترام باقی نہیں ہے، قانون شکنی اور ہنگامہ آرائی کا نام آزادی بن گیا ہے، اور یہ لعنت سب سے زیادہ نو آزاد ایشیائی ملکوں میں ہے، جہاں آئے دن انقلاب ہوتے رہتے ہیں، اشخاص اور افراد میں اس کو شخصی آزادی سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اولاد ماں باپ سے، بیوی شوہر سے اور شاگرد استاد سے آزاد ہے، کسی کو ایک دوسرے کے معاملات میں دخل دینے کا اختیار نہیں کہ یہ شخصی آزادی میں مداخلت ہے، آزادی کے اس تصور نے یورپ کی خانگی زندگی اور وہاں کے نوجوانوں کے اخلاق کو جس قدر تباہ کیا ہے اس سے سب واقف ہیں، اب ہندوستان کے سپوت بھی ان ہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں، اور ان کے ہاتھوں آئے دن

ان کے بزرگوں اور استادوں کی جو درگت بنتی رہتی ہے اور تعلیم گاہوں میں جو ہنگامے بپا ہوتے رہتے ہیں، وہ سب کے سامنے ہے۔

حالانکہ آزادی اگر ایک طرف انسانوں کو اپنے ہم جنسوں کی غلامی سے آزاد کرتی ہے تو دوسری طرف قانون اور اخلاق کی پابندیوں سے جکڑ دیتی ہے۔ ورنہ معاشرہ کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ بے لگام آزادی نری حیوانیت ہے، بلکہ حیوان بھی جبلی قوانین کے پابند ہوتے ہیں اور اشرف المخلوقات ان سے بھی آزادی چاہتا ہے، جس پر یورپ اور امریکہ کی حیوانی تحریکیں شاہد ہیں، تہذیب و شائستگی مطلق آزادی کا نہیں بلکہ پابندیوں کا نام ہے، جو انسان جس قدر ذمہ دار ہوگا، اسی قدر پابندیوں سے گرانبار ہوگا۔

یہی حال قومیت اور وطنیت کے موجودہ تصور کا ہے، اپنی قوم اور وطن سے محبت بالکل فطری اور ان کے حقوق کی ادائیگی ایک فریضہ ہے، اس لیے مذہب نے بھی اس کی تعلیم دی ہے، لیکن یورپ نے جس قومیت اور وطنیت کا صور پھونکا ہے اور اس کو پرستش کی جس حد تک پہنچا دیا ہے، اس کا لازمی نتیجہ جارحیت ہے، یہ قومیت اور وطنیت محض اپنی قوم اور اپنے وطن کی محبت و ہواخواہی تک محدود نہیں، بلکہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں اس کی سیاسی و معاشی برتری بھی ضروری ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ اقوام عالم میں کشمکش اور کمزور قوموں کی پامالی ہے کہ اس کے بغیر برتری حاصل نہیں ہوسکتی، خود یورپ میں اس نیشنلزم نے کیسی کیسی لڑائیاں برپا کیں، موجودہ بڑی قوموں کی ساری کشمکش اسی کا نتیجہ ہے، اور اب یہ دیو اتنا بے قابو ہوگیا ہے کہ " بقائے باہم" اور "پنچ شیل" کی کمزور زنجیروں سے قابو میں نہیں آتا۔

یورپ جہاں چھوٹے چھوٹے ملک اور چھوٹی چھوٹی قومیں آباد ہیں جن کی نسل، مذہب، زبان اور تہذیب ایک ہے، ایک حد تک قومیت اور وطنیت مفید اور قومی وحدت کا ذریعہ ہے، لیکن بڑے ملکوں کے لیے جن کی نسلیں، زبانیں، مذہب اور کلچر مختلف ہیں، قومیت اور وطنیت دودھاری تلوار ہے، جس سے قومی وحدت کم پیدا ہوتی ہے، اختلاف و افتراق زیادہ بڑھتا ہے۔

جب قومیت نسل میں اور وطنیت جغرافی حدود میں محدود ہوگی تو ان ملکوں میں جنکی حیثیت ایک براعظم کی ہے، جن کی آب و ہوا، مذاہب، نسلیں، زبانیں اور تہذیب جداجدا ہیں ان کے لحاظ سے ان کی قومیت اور وطنیت بھی سمٹتی اور محدود ہوتی جائے گی، اور ہر خطہ اپنی زبان اور تہذیب وغیرہ کے لحاظ سے اپنی جداگانہ حیثیت کا طالب ہوگا، جس کی ابتدا حقوق کی طلب سے ہوتی ہے، اور انتہا مرکز سے علٰحدگی پر، پاکستان کا انقلاب اس پر شاہد ہے، مشرقی و مغربی پاکستان کی جنگ خواہ مغربی پاکستان کی اقتدار پسندی اور احساس برتری کا نتیجہ ہو یا مشرقی بنگال کی لسانی اور نسلی عصبیت کا، بنیاد دونوں کی قومیت و وطنیت ہے، ہندوستان کی بعض ریاستوں میں بھی اس کی صدا بلند ہونے لگی ہے، اور اندیشہ ہے کہ آئندہ چل کر یہاں بھی یہ صورت پیش نہ آئے۔

چھوٹے ملکوں میں بھی اگر نسلی قومیت ایک ہو اور جغرافی وطنیت الگ الگ ہو تو قومیت کا اشتراک و اتحاد نہیں پیدا کر سکتا، اس کی مثال عرب ملک ہیں، ان سب کی نسل ایک ہے، زبان ایک ہے، مذہب ایک ہے، تہذیب ایک ہے، مگر جغرافی وطنیت نے انکا شیرازہ بکھیر کر رکھدیا ہے، اور اتحاد کی کوئی کوشش آجتک کامیاب نہ ہوسکی، یہ سب آزادی، نسلی قومیت اور جغرافی وطنیت کے غلط تصور کا نتیجہ ہے، جس قومیت اور وطنیت کی بنیاد نسل پرستی اور وطن پرستی پر ہوگی اسکو قومیت اور وطنیت کے وسیع تصور اور اخلاقی اصولوں کا پابند نہیں بنایا جاسکتا، اسکا دائرہ برابر سمٹتا جائیگا، اور آئندہ چل کر بڑے بڑے ملک مختلف ٹکڑوں میں بٹ جائینگے اور انکی وحدت ختم ہو جائیگی، اسلئے جبتک قومیت اور وطنیت کے اس غلط تصور کو ختم نہیں کیا جائیگا اسوقت تک انسانی وحدت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا، اسکا احساس ہر ملک کے مفکرین کو ہے، اور اسکی آوازیں بھی بلند ہوتی رہتی ہیں، اسی لئے اسلام نے ابتدا ہی سے اس قسم کی قومیت اور وطنیت کی جڑ کاٹ دی تھی اور اس کو ایک حد کے اندر محدود کر دیا تھا۔

افسوس ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی نے وفات پائی، وہ ادب کے استاد تھے، عربی زبان و لغت پر انکی نظر بڑی گہری و وسیع تھی، انھوں نے لغت کی کئی کتابیں لکھیں، ان میں مصباح اللغات اور اردو عربی ڈکشنری چھپ گئی ہیں، بعض مسودے کی شکل میں ہیں، دینی علوم میں بھی بڑی دستگاہ رکھتے تھے، انکی پوری زندگی عربی زبان کی تلاش و تحقیق میں گذری، انکی وفات سے عربی زبان کا ایک بڑا ماہر اٹھ گیا، اللہ تعالیٰ اس شیدائے علم کی مغفرت فرمائے۔

مقالات

ملا عبد القادر بدایونی

از سید صباح الدین عبد الرحمن

(۲)

ملا صاحب کا قلم علمائے سو، اکبر کے دین الٰہی، اور اس کے مریدوں اور معتقدوں کے خلاف ضرور تیغ برہنہ ہو گیا ہے، اور یہ عجیب بات ہے کہ ابو الفضل نے اپنی انشا پردازی کے زور سے اکبر کی مذہبی رواداری اور فراخدلی کی جو گنگا بہائی تھی، اس کے پانی کو ملا صاحب نے اپنی تحریر کی قوت سے تلخ بلکہ زہرناک بنا دیا، اس لحاظ سے ابو الفضل کا قلم ملا صاحب کے قلم سے شکست کھا گیا ہے، اکبر کا دین الٰہی زیادہ تر ملا صاحب کی تحریروں ہی کے ذریعہ سمجھا گیا، کیونکہ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ پورے وثوق کے ساتھ لکھا، ابو الفضل کے گومگو طرز بیان کے مقابلہ میں ان کے بیانات میں کوئی شک کی گنجایش نظر نہیں آتی، دونوں کی تحریروں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابو الفضل کا ضمیر اکبر کے دین الٰہی پر خوبصورت الفاظ کا ایک پردہ ڈالنا چاہتا ہے، اور ملا صاحب اسی پردے کو چاک کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں،

اگر دین الٰہی اور اس کے مریدوں سے متعلق تحریروں کی تلخی اور صاف گوئی کو نظر انداز کرکے منتخب التواریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ملا صاحب نے اس دور

میں بیٹھ کر جو تاریخ لکھی وہ موجودہ دور کے مذاق کے مطابق ہے، اس بے تکلف انداز میں اس زمانہ میں کوئی اور تاریخ نہیں لکھی گئی۔ محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب دربار اکبری میں ملا صاحب کی جا بجا چٹکیاں لی ہیں لیکن ان کی منتخب التواریخ کی سب سے بڑی خوبی یہ بتائی ہے کہ انھوں نے اس میں غیر کی یا اپنی کوئی بات نہیں چھپائی ہے (دربار اکبری ص ۴۴۴) صاف گوئی اور حق پسندی ان کی فطرت میں تھی، اسی لیے انھوں نے جب اپنے عشق کا ذکر کیا ہے تو اس پر بھی کوئی پردہ نہیں ڈالا ہے، اور اس عشق کو شہوت و آز سے تعبیر کرکے اپنے اوپر بھی لعنت بھیجی ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی جو درگت بنی اس کو بھی صاف صاف لکھدیا ہے، جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔

تاریخ نویسی میں ان کی یہ صاف گوئی جہانگیر کو پسند نہ آئی تھی، کیونکہ اس سے اکبر کی ایک بری تصویر سامنے آتی تھی، اس لیے اس نے اپنے زمانہ میں اس کی اشاعت بند کردی تھی[1] لیکن اس کتاب پر سب سے اچھا تبصرہ الیٹ کا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"یہ ان چند کتابوں میں ہے جس کا ترجمہ بہت مفید ثابت ہوگا لیکن اس کے لیے فارسی زبان میں کافی مہارت حاصل کرنے کی ضرورت ہے، اور ساتھ ہی ساتھ معاصر تاریخوں سے کامل واقفیت بھی چاہیے، کیونکہ مصنف نہ صرف الفاظ استعمال کرتا ہے، بلکہ مذہبی مناظرے، تعریف و توصیف، ہجو و ذم، ذاتی اور خاندانی تاریخوں کی تفصیلات تو اس طرح بیان کرنے لگتا ہے کہ واقعات کا تسلسل قائم نہیں رہتا، پھر سلسلۂ تاریخ قائم کرنے میں کافی دقت ہوتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہی غیر متعلقات اس کی تصنیف کے دلچسپ حصے ہیں۔ بہت کم ایسے واقعہ نگار ہیں جو بدایونی کی طرح اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، خصوصاً جو شاہی کا ان

کو ناگوار ہوں، یا جو اپنی غلطیوں اور لغزشوں کو اس وضاحت اور بے توجہی کے
ساتھ آشکارا کر دیتے ہوں۔" (الیٹ جلد ۵ ص ۴۸۱)

یہ صحیح ہے کہ اس میں تعریف و توصیف کے ساتھ ہجو و ذم بھی ہے، ہم اس کی تھوڑی سی مثالیں دے چکے ہیں، لیکن پوری کتاب میں ہجو و ذم کا پہلو کم نکلے گا، تیسری جلد جو چار سو صفحے پر مشتمل ہے، مشائخ، علما، اطبا اور شعرا کی مدح ہی مدح ہے۔ ملا صاحب کی تینوں جلدوں کے ماخذ ان کے ذاتی مشاہدات کے علاوہ ان کے بیان کے مطابق صرف دو کتابیں ہیں، ایک تو خواجہ نظام الدین احمد بخشی کی تاریخ طبقات اکبری ہے، جس کو وہ نظام التاریخ لکھتے ہیں، اور دوسری بخشی ابن احمد بن عبد اللہ سرہندی کی تاریخ مبارک شاہی ہے۔ (دیکھو دیباچہ منتخب التواریخ)، لیکن ان ہی دو کتابوں کے سہارے انھوں نے اپنی یہ ضخیم جلدیں تیار کر دیں، جن میں ان کی قوت آخذہ کے طرح طرح کے جلوے نظر آتے ہیں، وہ خود لکھتے ہیں کہ انھوں نے یہ تاریخ لکھتے وقت اختصار سے کام لیا ہے، اور عبارتی تکلفات اور استعارات سے پرہیز کیا ہے (ج ۲ ص ۶) یہ گویا ابو الفضل کی انشا پردازی پر ایک قسم کی ضرب ہے، یہ صحیح ہے کہ انھوں نے تاریخی واقعات کے قلمبند کرنے میں انشا پردازی کا سہارا نہیں لیا، بلکہ ان کی انشا پردازی خود تاریخی واقعات کو قلمبند کرنے میں سہارا بنتی چلی گئی ہے جس سے ان کی قدرت بیان کا اندازہ ہوتا ہے، وہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر الفاظ لا کر اپنی تحریروں کو سجانے کی کوشش نہیں کرتے ہیں، بلکہ انھوں نے اپنی کتاب زمانہ کی زبان (زبان روزگار) میں لکھ کر عام آدمیوں کے لیے بھی مائدۂ افضال بچھایا ہے، جس کو ابو الفضل پسند نہیں کرتا تھا۔ (جلد دوم ص ۱۰۳)

وہ دربار کے امرا، اور علما کا ذکر کرتے وقت ان سے اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی

کا بھی اظہار کرتے جاتے ہیں، خواہ ناظرین ان کی رائے سے اتفاق کریں یا نہ کریں، لیکن انکے اس ناقدانہ انداز بیان سے اُن کا طرز دلچسپ ہو جاتا ہے، کہیں کہیں تو ان کا اتنا اشتعال آگیا ہے کہ وہ ہرزہ سرائی پر بھی اتر آتے ہیں، وہ تو اپنی اس جھلاہٹ کو دینی درد اور دلسوزی سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن موجودہ دور کے ناقدین اس کو ان کے مذہبی تعصب کی شدت پر محمول کرتے ہیں، مگر ان کا یہ غصہ بلکہ ان کے قلم کا کچھ کا پن ان کی تحریروں کو بعض اوقات جاندار بھی بناتا رہتا ہے،

وہ تصنع اور آورد سے دور رہ کر بے تکلفانہ انداز میں واقعات کی ترتیب دیتے چلے جاتے ہیں، جس سے رزم اور بزم دونوں کی مرقع آرائی میں جان پڑتی نظر آتی ہے، اکبر کی فوج اور میواڑ کے رانا سے جو لڑائی ہوئی، وہ اس دور کی بڑی اہم معرکہ آرائی تھی، اکبر کی طرف سے مان سنگھ اس کی فوج کی سربراہی کر رہا تھا، ملا صاحب خود اس مہم میں شریک رہے، انھوں نے میدان جنگ کی جو تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے، وہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کا کوئی جنگی نامہ نگار تمام واقعات کو قلمبند کر رہا ہے، اس سلسلہ میں ہاتھیوں کی خوفناک لڑائی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :-

> فیلان رانا مقابل فیلان افواج بادشاہی در آمدہ ازاں جملہ دو فیل تومست نامی با یکدیگر در افتادند، و حسین خاں فوجدار فیلان کہ عقب مان سنگھ بر فیل دیگر سوار بود نیز افتاد و مان سنگھ بجائے مہاوت براں فیل خود سوار شدہ و ثبات قدمی ورزید کہ فوق آں متصور نباشد و یکے ازاں دو فیل کہ یکے خاصہ پادشاہی بود.... جنگ عظیم کردہ ہر دو یکدیگر را می راندند، از قضا بر مقتل فیلبان فیل رانا تیر رسید وازصدمۂ حملۂ فیلان بر زمین افتاد، فیل بان فیل پادشاہی بہ چستی و چالاکی از فیل

خود جستہ بر فیل از آن نشست، و کاری کرد کہ ہیچ کس نکند و از مشاہدۂ ایں حال دانا تاب نتوانست آورد و دو طلبانۂ رواں شد و تذبذب در افواج را افتاد و جوانان یکہ کہ آن را محافظت می نمودند، پیش در آمدند چپقلشی کردند کہ کارنامہ بود و از سرداری مان سنگھ آں روز معلوم شد کہ ایں مصرع ملا شیری چہ معنی داشت

کہ ہندو می زند شمشیر اسلام (ج ۲ ص ۲۳۳)

بزم کی تصویریں کھینچنے میں ان کے قلم میں بڑا زور آجاتا ہے، اکبر کے عبادت خانہ کی مرقع آرائی تو طرح طرح سے کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ آخر میں اس مباحثہ میں نبوت، کلام، رویت، تکوین حشر و نشر خواہ وہ اصول سے متعلق ہو یا فروع سے، طرح طرح کے شبہات وارد کیے جاتے، ہر ایک کا تمسخر اور استہزا کیا جاتا، اگر کوئی شخص جواب دینے یا تنقید کرنے پر آمادہ ہوتا تو اس کو روک دیا جاتا، اس طرح مناظرہ میں ثابت کرنے والے کے مقابلہ میں انکار کرنے والے کا پلہ بھاری رہتا، پھر اسی سلسلہ میں سارے مناظرے کو یہ کہکر باطل قرار دیدیتے ہیں :-

خانہا بر سر ایں مباحثہ رفت و حاشا کہ ایں مباحثہ باشد بلکہ مکابرہ و مشاغبہ بود و دین فروشاں برائے خوش آمد و شکوک مترو کہ را از ہر جا پیدا کردہ بہ تحفہ می آوردند" (ج ۲ ص ۳۰۷)

اور پھر اس عبادت خانہ کے آخری نتائج کی نقشہ آرائی اس طرح کرتے ہیں، جس میں دردناکی بھی ہے اور دلسوزی بھی (ج ۲ ص ۳۰۸-۹)

سفیان مغلوب و اخبار ہمہ جا غالب و اشرار امین بودند. ہر روز حکمے تازہ و قدحی جدید و شبہۂ نو پدید ہی کاری آمد و اثبات خود در نفی دیگران دیدند، و ازیں نکتہ کہ

برنا فی منفی می باشد واہل بنا بران مقبولان مردود و مردودان مقبول ونزدیکان دور و دوران نزدیک بودند سبحان من تصرف فی ملکہ کیف یشاء بزبان عام کالانعام جز ورد واللہ اکبر چیزے دیگر نبود وغوغائے عظیم برخاست وملا شیری دران وقت قطعہ گفتہ مشتمل بر دہ بیت واین ازان جملہ است

تا بزاید ہر زمان کشور براند از آفتی	فتنہ در کوی حوادث کہ خدا خواہد شدن
باعقاب قرض خواہ تیغ در ارباب شرک	بار سر از ذمہ گردن ادا خواہد شدن
شورش مغز است اگر در خاطر آرد جاہلی	کز خلائق ہر پیغمبر جدا خواہد شدن
خندہ می آید مرا زین بیت بس کز ظرفگی	نقل بزم منعم و ورد گدا خواہد شدن
بادشاہ امسال دعوی نبوت کردہ است	گر خدا خواہد پس از سالی خدا خواہد شدن

لیکن کچھ دنوں کے بعد ان مباحثہ کرنے والوں کو یاد کرتے ہیں تو پھر ان کی تحریر میں بڑی خستگی اور برشتگی بھی پیدا ہو جاتی ہے اور بڑے درد و گداز کے ساتھ لکھتے ہیں (ج ۲ ص ۸۹-۱۸۰)

مدت دہ سال ازان تاریخ الی الیوم گذشتہ وآن جماعۃ مباحثین ومناظرین چہ محقق وچہ مقلد کہ از صد نفر متجاوز بودند، یک کس نمی بیند، وہمہ روی در نقاب کل نفس ذائقۃ الموت ماندند

جرت الریاح علی مکان دیارہم	فکانہم کانوا علی میعاد
زخیل دردکشان غیر ما نماند کسی	بیار بادہ کہ باہم غنیمتیم بسی

حالا کہ بمقتضای النعمۃ اذا فقدت عرفت ان ہم صحبتان را یاد می کنند ونابۂ حسرت از دیدۂ غم دیدہ فرو می بارد و می زارد و می نالد و می گوید کہ دریں حسرت آباد کاشکی روزی چند دیگر ہم اقامت می نمودند کہ بہر حال مغتنم بودند

وخطاب منحصر بایشان بود

پائے درزنجیر پیش دوستاں　　به که با بیگانگان در بوستان

این پشۂ مغرور، وایں نفثۂ المصدور، از عتراز داغ حرمان ونالۂ تنہا

چہ در بان غفر اللہ الماضیین ورحم الباقین

افسوس کہ یاران ہمہ از دست شدند　　دریائے اجل یگاں یگاں پست شدند

بودند تنک شراب در مجلس عمر　　یک لحظہ ز ما پیشترک مست شدند

ملا صاحب عربی کے بھی بہت بڑے عالم تھے۔ اس لیے اپنی تحریروں میں بکثرت عربی الفاظ، فقرے، ترکیبیں حتیٰ کہ اشعار استعمال کرتے جاتے ہیں، جن کو سمجھ کر وہی لطف لے سکتا ہے جو عربی بھی اچھی طرح جانتا ہو۔ اسی لیے الیٹ کا یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ نامانوس الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں، کبھی کبھی تو وہ ایسی عبارت بھی لکھ جاتے ہیں جو صرف فارسی جاننے والوں کے لیے بڑی گراں گزرتی ہے۔ مثلاً

ایں را بواعث و دواعی بسیار بود، وبموجب القلیل یدل علی الکثیر والخیبنة تدل علی الغدیر انموذجی ازان در سلک تقریر وتحریر می آورد واللہ المستعان حاصل آنکہ دانایان از ہر دیار و ارباب ادیان ومذاہب بدربار جمع شدہ بشرف ہم زبانی مخصوص بودند (ج ۲ ص ۲۵۶)

ان کی تحریروں میں "قوادح"، "مطاعن"، "ملت سہلۂ بیضا"، "حنیفۂ غرا"، "مظہر اسم المضل"، "مظہر اسم الہادی"، "ضال ومضل"، "علما نافعا وعملا متقبلا" وغیرہ جیسے الفاظ بہت آتے ہیں، لیکن اس قسم کے الفاظ مذہبی مباحث کے سلسلہ ہی میں استعمال ہوتے ہیں۔ ان کو جب کسی سے جھلاہٹ آتی ہے تو اس کے لیے "ملعون"

سگ ملعون، ملاعین، ولدالزنا، بدبخت، فاسق، فاجر، ملحد، بے دین، بے حیا، پاجی طبیعت، پاجیان، مردود، مطرود، مکار، دنیا ساز، رذیل، خبیث، مردم اراذل وسفلہ وغیرہ جیسے الفاظ لکھنے پر اتر آتے ہیں،

منتخب التواریخ کی تیسری جلد ان کی تحریر کا شاہکار ہے، اس میں ان کے طرز بیان میں بڑی متانت اور سنجیدگی ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ لکھ رہے ہیں، اس سے انشراحی کیفیت بھی محسوس کرتے جاتے ہیں، خصوصاً مشائخ اور علماء کے توکل، قناعت، عبادت، ریاضت، زہد، تقویٰ، معرفت الٰہی، استغنا، گوشہ نشینی، علمی تبحر وغیرہ کے ذکر میں تو ان کے قلم میں بڑی گرمی اور ان کے قلب میں بڑی حرارت پیدا ہوتی نظر آتی ہے، ان کی ہر سطر سے ان کے ادب و احترام کا اظہار بھی ہوتا ہے، انکی کتاب کا یہ حصہ اس دور کی علمی و مذہبی تاریخ کا بڑا بیش بہا خزانہ ہے،

وہ شعر و ادب کے بڑے اچھے نقاد بھی تھے جیسا کہ ان کی اس تیسری جلد کے اس حصہ سے اندازہ ہوگا جہاں وہ اپنے زمانہ کے شعراء کا ذکر کرتے ہیں، اس نقد و تبصرہ میں کچھ چٹکیلی باتیں لکھ کر مزاحیہ رنگ بھی پیدا کر دیا ہے، مثلاً قاسم کاہی کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ اس کو کتوں سے بڑا پیار تھا، غالباً کتے سے پیار ملک الشعرائی کا لازمی شیوہ ہے، یہ اشارہ ملک الشعراء فیضی کی طرف ہے، اس کو بھی کتوں سے بڑا لگاؤ تھا،

اختلاط با سگان بے تحاشی داشت، غالباً این شیوہ لازمۂ ملک الشعراء بودہ۔ (ج ۳ ص ۱۰۳)

سانبر کے راجہ لون کرن کا بیٹا منوہر تھا، فارسی میں شاعری بھی کرتا، اس کا تخلص توسنی تھا، ملا صاحب اس کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ سانبر کا نمک زار مشہور رہے، توسنی کے کلام

میں بھی تیز نمک ہے،، وہاں کا سارا نمک اس کے کلام میں چلا آیا ہے،

منوہر نام دارد ولد لون کرن راجہ سانبھر است کہ نمک زار مشہور است

داریں ہمہ نمک در سخن او تاثیر آں سرزمین است (ج ۳ ص ۲۰۱)

بیرم خاں کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک رات کی مجلس میں وہ ہمایوں سے باتیں کر رہا تھا کہ اس پر غنودگی طاری ہوگئی، ہمایوں نے اس سے کہا ہاں بیرم تم سے کچھ کہہ رہا ہوں، بیرم نے جواب دیا، ہاں بادشاہ سلامت، میں حاضر ہوں، لیکن میں نے سنا ہے کہ بادشاہوں کے حضور میں آنکھوں کی حفاظت، درویشوں کے نزدیک دل کی نگہداشت، اور عالموں کے سامنے زبان کی احتیاط کرنی چاہیے، میں یہی سوچ رہا تھا کہ حضرت والا بادشاہ بھی ہیں، درویش بھی ہیں اور عالم بھی ہیں، کن کن چیزوں پر نگاہ رکھوں، بادشاہ کو یہ جواب پسند آیا، اور تعریف کی۔

شبے ہمایوں بادشاہ مخاطبہ با بیرم خاں داشتند اور ا بغلبہ غنودگی دست داد بادشاہ بتنبیہ فرمودند کہ ہان بیرم با تو می گویم، گفت بلے بادشاہم حاضرم اما چوں شنیدہ ام کہ در ملازمت پادشاہاں محافظت چشم و پیش درویشاں نگاہداشت دل و نزد عالماں حفظ زبان باید کرد، بنا براں دریں فکر بودم کہ چوں حضرت ہم بادشاہ و ہم درویش و ہم عالمند کدام را نگاہ توانم داشت بادشاہ مغفرت پناہ را ایں ادا از و خوش آمد و تحسین فرمودند (ج ۳ ص ۱۹۳)

ایک شاعر سلطان سیلکی کے متعلق لکھتے ہیں، سیلک قندھار کا ایک گاؤں ہے، وہ وہیں کا رہنے والا تھا، اس لیے لوگ اس کو سیلکی کہتے، مگر ہندوستان میں سیلکی ایک گھناؤنا جانور ہے، اس لیے اس تخاطب سے وہ تنگ آ جاتا، ملا صاحب لکھتے ہیں کہ

یک دن اس نے قاسم کاہی سے پوچھا کہ تمھاری کیا عمر ہو گی؟ اس نے جواب دیا "خدا سے دو سال چھوٹا ہوں"۔ سلطان سیلکی نے کہا "میرے مخدوم! میں تو سمجھتا تھا کہ آپ دو سال بڑے ہیں، آپ اپنی عمر کم بتا رہے ہیں"، قاسم کاہی یہ سن کر ہنس پڑا اور کہا کہ تم ہماری صحبت کے لائق ہو،

روزیکہ ملا قاسم کاہی را دیدہ پرسیدہ کہ سن شریف چند باشد، قاسم گفتہ کہ از خدا دو سال خوردم، سلطان گفتہ کہ مخدوم ماشما را دو سال زیادہ می دانستیم طولیت عمر خود را کم می فرمائید، ملا قاسم خندہ زدہ وگفتہ تو قابل صحبت مائی۔

(ج ۳ ص ۲۳۶)

فیضی اور عرفی کے ایک مشہور لطیفہ کو ملا صاحب کے قلم ہی نے مشتہر کیا، لکھتے ہیں، ایک دن عرفی شیخ فیضی کے گھر آیا ہوا تھا، فیضی اپنے کتے کے ایک پلہ سے کھیل رہا تھا، عرفی نے پوچھا کہ اس مخدوم زادہ کا کیا نام ہے، فیضی نے جواب دیا 'عرفی'، عرفی نے فی البدیہہ کہا "مبارک باشد"۔ فیضی کے والد کا نام مبارک تھا، اسلیے تلملا گیا لیکن خاموش رہا۔

(عرفی) روزے بخانہ شیخ فیضی آمد، چوں سگ بچہ را باشیخ مخلوط دید پرسید کہ ایں مخدوم زادہ را چہ نام است، شیخ گفت عرفی، او در بدیہہ گفت "مبارک باشد" و شیخ بسیار برہم و درہم شد، اما چہ فائدہ۔" (ج ۳ ص ۲۸۵)

انھوں نے بعض شعرا کی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے بہت ہی دلچسپ اور چبھتے ہوئے فقرے بھی لکھے ہیں، مثلاً قاسم کاہی کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کا سارا مضمون دوسرے شعرا کے یہاں سے لیا ہوا ہوتا ہے، لوگوں نے جب اس سے پوچھا کہ تمھارے اشعار کے اکثر مضامین دوسرے شاعروں سے ملتے ہیں، تو اس نے جواب دیا کہ میں شعر کہتے وقت

ایسا کوئی التزام نہیں کرتا ہوں کہ یہ سب اشعار میرے ہی ہوں، اگر تم کو پسند نہیں آتے ہیں تو قلم تراش لو اور میرے دیوان سے تراش کر ان کو نکال دو۔

ہم مضمون دیگران...... چوں ملا قاسم راہی گفتند کہ اکثر اشعار شما مضمون دیگران است، می گفت کہ من التزام نکردہ ام کہ ہمہ اشعار من باشد، اگر شما را خوش نیاید، قلم تراش بگیرید واز دیوان من تراشید۔ (ج ۳ ص ۱۶۵)

ثنائی مشہدی کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ جب تک وہ ہندوستان نہیں آیا تھا، یہاں کے اکابر اس کے کسی شعر کو طرح بنا کر بزم آراستہ کرتے، اور ہر مجلس میں اس کے اشعار تبرک کے طور پر پڑھے جاتے، اور بالاتفاق اس کی استادی کے معترف رہے، لیکن جب وہ یہاں آگیا تو حسد سے اس کی عقیدت افسردگی میں تبدیل ہوگئی، وہ گوشۂ گمنامی میں پڑ گیا، اس پر اعتراضات کے تیر رسائے جانے لگے اور وہ حیرت کی وادی میں پڑ گیا،

پیش از آنکہ بہ ہندوستان بیاید بزرگان این دیار ہمیشہ از وغائبانہ بزمی می آراستند و در ہر مجلس شعر او را بہ تبرک می خواندند ومتفق الکلام والاقلام برات دیگر او خط می نوشتند چوں آمد آن ہمہ شوق از حسد بہ فسردگی مبدل شد و در گوشۂ مجہولی افتاد و نشانہ صد تیر اعتراض بردہ حیران وادی سائر لناسی گردید (ج ۳ ص ۲۰۸)

فیضی جیسے باکمال شاعر کی شعر گوئی پر ملا صاحب کے تبصرے کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس سے ناظرین کو اتفاق کرنا ضروری نہیں لیکن اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ ان کا قلم باغ و بہار بن کر جب قلم تراش بن جاتا... پھر اس سے اپنی قلم تراشی کس کس طرح کرتے رہے۔

ملا صاحب کو مادۂ تاریخ نکالنے میں بھی بڑی مہارت تھی، اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

ان کے والد صاحب کی وفات ۹۶۹ھ میں ہوئی، تو یہ تاریخ نکالی: (ج ۱ ص ۵۳)

سپرد فترا فاضل بود در ان ملوک شاہ — آں بحر علم و معدن احسان و کان فضل
چوں بود در زمانہ جہانی ز فضل ازاں — تاریخ سال فوت ولے آمد جہان فضل

۹۶۸ھ میں بیرم خاں کی شہادت کے موقع پر انھوں نے بہ لحاظ تعمیہ یہ تاریخ نکالی:

گفت گل گلشن خوبی نماند

گلشن خوبی کے اعداد ۱۰۱۸ ہوتے ہیں، اس میں گل کے ۵۰ نکال دیے جائیں تو ۹۶۸ ہو جاتے ہیں۔ (ج ۱ ص ۴۸)

ملا صاحب لکھتے ہیں کہ ۹۷۱ھ میں خواجہ مظفر علی تربتی کو خاں کا خطاب دے کر وکیل کل کے عہدہ پر مامور کیا گیا۔ اس کے تقرر کا مادۂ تاریخ "ظالم" ہے، غالباً یہ تاریخ انھوں نے خود نکالی۔ (ج ۲ ص ۶۵)

شیخ سلیم چشتیؒ ۹۷۱ھ میں حرمین شریفین سے ہندوستان واپس تشریف لائے، تو ملا صاحب نے اس موقع پر دو تاریخیں کہیں۔ (ج ۲ ص ۷۳)

شیخ اسلام مقتدائے انام — رفع اللہ قدرہ السامی
از مدینہ چوں سوئے ہند آمد — آں ہدایت پناہ ہی نامی
ہند از مقدم ہمایونش — یافت از سر خجستہ فرجامی
گیر حرفے و ترک کن حرفے — بہر سالش ز شیخ الاسلامی

اسلامی میں سے ل نکالنے کے بعد ۹۷۱ھ ہو جاتا ہے، دوسری تاریخ یہ ہے:

شیخ اسلام ولی کامل — آں مسیحا نفس و خضر قدم
لامع از جبہۂ او سر ازل — طالع از چہرۂ او نور قدم
از مدینہ چو سوئے ہند شتافت — آں مسیحا نفس و خضر قدم

بشمر حرفے و شمر حرفے　　　بہر تاریخ ز خیر المقدم

خیر المقدم سے ۱۰۲۵ ہوتے ہیں۔ میم کے ۹۰ نکال دیے جائیں تو ۹۳۵ ہوں گے اور پھر "د" کے ۳۵ جوڑ دیے جائیں تو ۹۷۰ھ ہوتے ہیں، پھر بھی تاریخ درست نہیں ہوئی۔

۹۷۵ھ میں ملا صاحب کی دوسری شادی ہوئی تو اس کے لیے یہ تاریخ کہی (ج ۲ ص ۱۰۵)

چوں مرا از عنایت ازلی　　　اتصالے بماہ چہرے شد

عقل تاریخ کد خدائی را　　　گفت ماہی قرین مہرے شد

۹۷۶ھ میں فتح پور سیکری میں اکبر نے شیخ سلیم چشتی کے لیے مسجد اور خانقاہ بنوائی تو ملا صاحب نے عربی میں ان کی یہ تاریخ نکالی (ج ۲ ص ۱۰۹)

هذه البقعة قبة الاسلام　　　رفع الله قدر بانیها

قال روح الامین تاریخه　　　لا یری فی البلاد ثانیها

یعنی یہ مسجد قبۃ الاسلام ہے، خدا اس کے بنانے والے کے رتبہ کو بلند کرے، روح الامین نے اس کی تاریخ یہ کہی، اس کا ثانی دوسرے ملکوں میں نہیں۔

ایک دوسری تاریخ یہ کہہ کر بھی نکالی۔

بیت معمور آمده از آسماں

۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) میں پٹنہ فتح ہوا، تو ملا صاحب نے یہ تاریخ اکبر کی خدمت میں گذرانی (ج ۲ ص ۱۸۰)

چتر شہ دیں بہر کشاد پٹنہ　　　انداخت چو سایہ بر سواد پٹنہ

فی الحال رقم زد از پئے تاریخش　　　منشی خرد فتح بلاد پٹنہ

ملا صاحب اپنے زمانے کے ایک زاہد، متوکل اور گوشہ نشین بزرگ شیخ

برہان سے بہت متاثر تھے۔ ان کی وفات سنہ ۹۹۰ھ میں ہوئی، تو یہ مادۂ تاریخ نکالا

دل گفت کہ شیخ اولیاء بود (ج ۳ ص ۷)

سنہ ۱۰۰۴ھ (۱۵۹۵ء) میں اپنی کتاب منتخب التواریخ ختم کی تو اس کا یہ مادۂ تاریخ کہا

شکر للہ کہ باتمام رسید منتخب از کرم ربانی
سال تاریخ ز دل جستم گفت انتخابی کہ ندارد ثانی

لفظ "انتخاب" سے ۱۰۵۴ ہوتا ہے۔ لیکن "ن" کے ۵۰ نکال دیے جائیں

تو ۱۰۰۴ ہوجاتا ہے۔

ملا صاحب کو تاریخ گوئی سے بڑا ذوق رہا۔ اس لیے اپنی منتخب التواریخ میں دوسروں کے مادۂ تاریخ کو جابجا درج کرتے گئے ہیں۔

ملا صاحب شاعر بھی تھے، اس لیے اسی شاعرانہ کمال کی بدولت شعر میں بھی مادہ نکال لیا کرتے تھے۔ ان کا تخلص قادری تھا، انھوں نے اپنی کتاب کی تیسری جلد میں شعراء کے تذکرہ میں اپنی شاعری کی تفصیل نہیں لکھی ہے۔ البتہ کہیں کہیں اپنے کچھ اشعار نقل کر دیے ہیں، مثلاً اپنے زمانہ کے ایک عالی مقام بزرگ میر سید علاء الدین اودھی کے ذکر (ج ۳ ص ۶۲) میں لکھتے ہیں کہ ان کی ایک ترجیع بند کا ایک بند حسب ذیل ہے:

کہ بچشمان دل مبیں جز دوست ہرچہ بینی بدانکہ مظہر اوست

اس سلسلہ میں وہ عرفی کا یہ شعر بھی نقل کرتے ہیں:

کہ جہان صورت است و معنی دوست در بمعنی نظر کنی ہمہ اوست

پھر کسی اور شاعر کا یہ شعر بھی درج کرتے ہیں:

کہ جہان پرتویست از رخ دوست جملہ کائنات سایۂ اوست

آخر میں لکھتے ہیں کہ اسی مضمون کا ان کا بھی ایک شعر یہ ہے

اوست مغز جہاں جہاں ہمہ پوست خود چہ مغز و چہ پوست چوں ہمہ اوست

ملا صاحب کے ہم عصر بزرگ شیخ یعقوب کشمیری فضائل و کمالات کا مجموعہ تھے، شیخ
شیخ ابن حجر سے درس حدیث کی سند لی تھی، کئی کتابوں کے مصنف تھے، شعر بھی کہا کرتے
ملا صاحب سے بڑا لگاؤ رکھتے تھے، ان کو ایک خط لکھا، تو اس میں ان کی تعریف میں
یہ اشعار لکھ بھیجے، (ج ۳ ص ۱۴۴)

از دوانی بدادنی بیشک در فنون فضیلت است فزوں
پس ولیل زیادت معنیش کہ بنائیش بصورت است فزوں

ملا صاحب نے اس کے جواب میں یہ لکھ بھیجا:

اے زبانت کلید نامۂ غیب دل پاکت نتیجۂ لاریب
دادہ اعجاز کلک تو بیرون گنج ہائے نہاں کن فیکون
گفتی از منطق گہر پرور کز دوانی بدادنی خوشتر
گر دوانی و گر بدادنیند ہمہ از گنج فضل تو غنیند
دلم آئینہ جمال تو شد مظہر فیض لایزال تو شد
چہ عجب گر ز رشے حق بینی خویشتن را دلم رہمی بینی

اپنی منتخب التواریخ کے خاتمہ پر اپنی ایک مناجات بھی لکھی ہے جس سے انکی
ہی اور دینی کیفیات کا اظہار ہوتا ہے، اس مناجات کے کچھ اشعار یہ ہیں، جو یا ن
بہت ہی سلیس اور رواں ہے:

سراپا ز عصیان مراپیش بیں مبیں جرم ما رحمت خویش بیں

نگہدار از من بد روزگار | زہر بد کہ باشد مرا دور دار
چنان کار دنیا و دینم بساز | کہ از ہر دو عالم شوم بے نیاز
بالطاف خود داریم در امان | ز آفات و آشوب آخر زمان
برآری مراد من مستمند | ز دنیا و دین سازیم بہرہ مند
مکن در کف نفس بیچارہ ام | امان بخش از نفس امارہ ام
تمنا کنانم مبر پیش کس | تمنای من از در تست بس
ز کسب حلالم بدہ توشۂ | ز خلق جہاں گیریم گوشۂ
گناہم بیامرز و پوشیدہ دار | کہ ہم ستر پوشی ہم آمرزگار
ز فیض ازل بخش آگاہیم | خلاصی دہ از جہل و گمراہیم
نگہدارم از صحبت ناکسان | بہ صاحبدلے اہل دردی رسان
سوئے خویش کن روی یکبارہ مرا | خلاصی دہ از ماسوی اللہ مرا
مکن بر مرادے مرا کامگار | کہ خجلت مرا در سر انجام کار
نداند کسے جز تو بہبود من | تو دانی زیان من و سود من
غنی کن ز گنج قناعت مرا | حضوری دہ از ذوق طاعت مرا

ملا صاحب بڑے اچھے خطاط بھی تھے۔ سنہ ۹۹۹ھ میں کلام پاک کا ایک نسخہ خط نسخ میں لکھ کر شیخ داؤد جھنی وال کے روضہ میں رکھوا دیا، اور اس کو اپنی مغفرت کا ذریعہ سمجھتے تھے، لکھتے ہیں:

ہم دریں سال حق سبحانہ عز شانہ کاتب را توفیق کتابت کلام مجید رفیق گردانید
تا نسخۂ فردوسی و خوانا نوشتہ و باتمام رسانیدہ بلوح جدول مکمل وقف روضۂ منورۂ

حضرت غوث الاانامی مرشدی ملاذی میاں شیخ داؤد جھنی وال قدس سرہٗ ساخت
امید کہ کفارت گناہان بہنائی گذشتہ گرچون نامۂ اعمال بندہ سیاہ است گردیدہ
مونس ایام حیات و شفیع بعد ممات گردد۔ (ج ۲ ص ۳۹۴)

وہ قرأت بہت اچھی کرتے تھے، اس لیے موسیقی کے بھی ماہر ہو گئے تھے، وہ خود تو اس فن میں اپنی مہارت کا ذکر منتخب التواریخ میں نہیں کرتے، لیکن پہلے ذکر آیا ہے کہ فیضی نے ولایتی اور ہندی موسیقی میں ان کی فضیلت کا اعتراف کیا ہے (ج ۲ ص ۳۰۴) اس فن میں اپنی بلندی کا اظہار یہ لکھ کر کیا ہے کہ جب اکبر نے شیخ بجھو، میاں تان سین اور دوسرے ارباب غنا کو شیخ مبارک ناگوری کے پاس بھیجا کہ وہ ان کے فن کا جائزہ لیں تو شیخ مبارک ناگوری نے میاں تان سین سے کہا، ہم نے سنا ہے کہ تم بھی کچھ گا لیتے ہو، اور جب اس نے اپنا گانا سنایا تو اس کے گانے کو جانوروں کے چلانے سے تشبیہ دے کر اس کی کوئی اہمیت نہیں دی، (ج ۳ ص ۲۶۵)، ملا صاحب کے اس فن لطیفہ کے ذوق کے بعد یہ لکھنا نامناسب نہیں کہ ان کو غالباً حسن و جمال کا بھی غیر معمولی احساس رہا، اپنے عاشق و دلگیر ہونے کا حال خود بیان کیا ہے، اور منتخب التواریخ میں نوخاں زماں اور شاہم بیگ (ج ۲ ص ۲۰) سید موسی اور موہنی (ج ۲ ص ۱۱۸-۱۰۹) ایک شیخ زادہ اور ایک طوائف (ج ۲ ص ۱۱۹) وغیرہ کے معاشقہ کی تفصیل بڑے لطف ولذت کے ساتھ قلمبند کی ہے، سید موسی اور موہنی کے عشق و عاشقی کا حال لکھنے میں تو انکا قلم بہت بے قابو ہو گیا ہے، لکھتے ہیں

الحمد للہ علی نعمۃ الایمان والاسلام، بر اذکیا معروض می دارد کہ اگرچہ مقتضائے
وعدۂ اختصار، حاشیہ اطناب دریں واقعہ نبود اما چون توان کرد کہ سخن عشق

بے اختیار عنان قلم از قبضۂ اقتدار بیروں بردہ و در از نفسی واقع شد

(ج ۲ ص ۱۱۸)

یہ لکھکر اپنے عشقیہ جذبات و احساسات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

بشنو اے گوش بر فسانۂ عشق		از صریر قلم ترانۂ عشق

کار من عشق و یار من عشق است		حاصلِ روزگار من عشق است

چہ کنم در سرشت من این ست		وز ازل سرنوشت من این است

بہر این آفریدہ اند مرا		جانب این کشیدہ اند مرا

لیکن وہ کبھی کبھی عشق الٰہی میں سرشار ہو کر بدمست بھی ہو جاتے، ۹۸۹ھ (۱۵۸۱ء)

میں ان کو ایک بندۂ خدا مظہر سے تعلق خاطر ہو گیا،

تعلق خاطری عظیم بمظہری نام از مظاہر الٰہی و آزادی و وارستگی ..... " (ج ۲ ص ۲۹۶)

اس لگاؤ کی وجہ سے ان پر بڑی مستی طاری رہی، اس سلسلہ میں لکھتے ہیں (ج ۳ ص ۹۸-۹۷)

" میں اس عالم میں مست تھا کہ مجھے اس کا ایک ایک لمحہ عمر جاودانی سے اعلیٰ

وار فع معلوم ہوتا تھا، عاقبت اندیشی نفع اور نقصان کی بالکل فکر نہیں رہی اور

افوض امری الی اللہ (میں اپنا معاملہ اللہ کے حوالہ کرتا ہوں) میرے لیے پورا ہوتا نظر آتا،

تو با خدائے خود انداز کار و خوشدل باش

کہ رحم اگر نکند مدعی خدا بکند

میں اس عالم میں نیند میں اشعار کہتا، ایک رات نیند ہی میں یہ شعر کہا اور بیدار

ہونے کے بعد اس کو یاد کر کے بیقرار اور روتا رہا،

آئینۂ ما روئے ترا عکس پذیر است		گر تو نہ نمائی گنہ از جانب ما نیست

رب العزت کی قسم اس واقعہ کو سترہ سال گزر گئے لیکن دل سے اس کی لذت ابتک نہیں گئی ہے، جب بھی میں اس کو یاد کرتا ہوں تو رونے لگتا ہوں، کاش میں اسی وقت دنیا سے بالکل خالی ہو کر چلا جاتا، تو سارے جھگڑے سے پاک ہو جاتا۔

خوش آنکہ دیدہ روئے ترا و سپرد جاں   آگہ نشد کہ ہجر کدام و وصال چیست

ان دنوں مجھکو کوئی چیز معلوم ہوئی یعنی معرفت حاصل ہو گئی تھی، اور میرے دل تک ایسا فیض پہنچ گیا تھا کہ اگر میں ساری عمر اس کا ذکر کرتا رہوں اور شکر بجا لاؤں تو بھی اس کا عشر عشیر حق ادا نہ ہو سکے گا۔

درگوش دلم بخواند یک زمزمۂ عشق   زاں زمزمہ زپائی تا سر ہمہ عشق
حقا کہ بعہدہا نیایم بیروں   از عہدۂ حق گزارئی یک دمۂ عشق

ان سطروں سے ظاہر ہے کہ وہ راہ سلوک پر بھی گامزن رہے۔ شیخ داؤد جہنی وال کے ذکر کے سلسلہ میں ایک جگہ انھوں نے ان کے نام کے آگے غوث الانامی مرشدی ملاذی بھی لکھا ہے (ج ۲ ص ۳۹۴)، پھر تیسری جلد میں ان کا ذکر جس والہانہ انداز میں کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے بیعت بھی ہو گئے تھے، جہنی لاہور کے مضافات میں ایک قصبہ ہے، شیخ داؤد کے آبا و اجداد عرب سے آکر وہاں سکونت پذیر ہو گئے تھے، شیخ داؤد کو حضرت غلام الثقلین سے ایک باطنی مناسبت ہو گئی تھی، جب سلوک و ارشاد کی طرف مائل ہوئے تو بیس سال تک صحرا نوردی میں گذاردی، پھر شیرگڈھ میں آکر رشد و ہدایت میں مشغول ہو گئے، حضرت غوث اعظم کے یوم ولادت اور عرس کے موقع پر ان کی خانقاہ میں ایک لاکھ آدمی جمع ہو جاتے اور وہ ان کی میزبانی کرتے، لیکن خود ان کے حجرے میں مٹی کے ایک پیالہ اور ایک بوریا کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ ملا صاحب نے ان سے اپنے تعلقات

کا تذکرہ اس طرح کیا ہے۔

"بیرم خاں کا عہد بہترین تھا، اس وقت ہندوستان حجلۂ عروسی بنا ہوا تھا۔ میں آگرہ میں تعلیم پا رہا تھا، اس وقت میں نے ان (یعنی شیخ داؤد جہنی وال) کی عظمت وجلالت کا حال بعض درویشوں کی زبانی سنا تھا، ان کی عقیدت و محبت کا بیج میرے دل میں پڑ گیا تھا، اور غائبانہ طور پر ان سے ملنے کی ہوس پیدا ہوئی،

آری آری گوش پیش از چشم عاشق می شود

ان دنوں میں نے چند بار شیر گڈھ ان کی خدمت میں حاضر ہوکر ان کے آستان ملایک مطاف کا طواف کرنے کا ارادہ کیا لیکن کبھی والد مرحوم مغفور مانع ہوئے اور راستے سے لوٹا لیا، بعض اوقات کچھ اور موانع ہوئے کہ وہاں پہنچکر دولت حاصل کرنے سے محروم رہا، اس انتظار میں بارہ[۱۲] سال گذر گئے، ان ایک مرید شیخ کا لو میری غائبانہ عقیدت سے واقف تھا، ایک روز اس نے ہما کی طرح اپنا سایہ مدا اُن میں ڈالا، اور اس نے مجھ سے کہا کہ کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہے کہ حضرت میاں زندہ ہیں اور تم وہاں تک پہنچکر ان کے دیدار سے ابتک محروم ہو، یہ بات میرے اشتیاق کے لیے چنگاری بن گئی، اس کے بعد حق تعالیٰ نے ایک اچھا سبب پیدا کر دیا، ان دنوں میں محمد حسین خاں کا ملازم تھا، وہ میرزا حسین کے تعاقب میں کانت گولہ (ضلع سہارنپور) سے پنجاب کی طرف گیا، تو مجھکو اس سعادت کے حاصل کرنے کا موقع مل گیا، میں لاہور سے شیر گڈھ پہنچا، میں نے ان جمال میں ایسی چیز پائی جو کسی اور صاحب حسن میں نہیں پائی جا سکتی تھی، وہ باتیں کرتے یا مسکراتے تو ان کے دانتوں سے نور برستا جس سے دل کی تاریکی

دور ہو جاتی اور وہ منور ہو جاتا ہے اور معرفت کا راز عیاں ہوتا نظر آتا، میں نے
اپنی فانی زندگی کے تین چار دن وہاں گذارے، کوئی دن ایسا نہ ہوتا کہ سو سو اور
پچاس پچاس ہندو اپنے خاندان کے ساتھ آکر مشرف بہ اسلام نہ ہوتے، اور
ان کی تلقین نہ ہوتی، اس شہر کے در و دیوار، شجر و حجر تک تسبیح و ذکر کرتے
ہوئے معلوم ہوتے انھوں نے مجھکو ایک کلاہ مبارک عنایت کی اور حکم دیا کہ میری طرف
سے اپنے اہل و عیال میں تم نائب بن کر رہو، میرا بھی یہی طریقہ ہے، اور اپنی اہلیہ کی
طرف سے میرے متعلقین اور لڑکوں کے لیے دوپٹہ اور رومال بھجوائے، میں نے عرض
کیا کہ اگر ایک کرتہ بھی عطا ہو تو میرے لیے نور علی نور ہے، بڑے تامل کے بعد فرمایا
کہ وہ بھی وقت پر مل جائے گا، میں نے ان سے اپنی پوشیدہ باتیں اور دلی مقاصد
بیان کیے، اور ان کے جوابات سنے، میں نے رخصت ہونے کے لیے اجازت چاہی،
اس اثنا میں وہ بھی کمزوری کی وجہ سے ایک محافہ میں بیٹھکر مسجد سے گھر کی طرف
روانہ ہوئے، میں نے ان کے محافہ کے پایہ کو اپنے کاندھے پر اٹھا لیا، اور چند قدم چلا،
اس وقت مجھ پر بڑا گریہ طاری ہوگیا، وہ رک گئے اور محافہ سے اتر کر بیٹھ گئے،
اور خدا تعالیٰ کی معرفت و محبت کی ایسی باتیں سنائیں کہ میرے دل کی کیفیت
اور بھی تیز ہوگئی .... میں لاہور پہنچکر حسین خاں کے لشکریوں کے ساتھ
ہندوستان کی طرف روانہ ہوگیا، ایک روز میں سہارنپور میں ایک باغ میں
بیٹھا تھا کہ میرا دل حضرت کی جدائی سے کباب ہو رہا تھا کہ ایک مسافر تازی
پیرہن ہاتھ میں لیے ہوئے میرے پاس آیا، اور کہنے لگا یہ لو، یہ مجھکو ایک بڑے
بزرگ سے ملا ہے، اور مجھکو راستہ کا خرچ دے دو، میں نے اس سے حقیقت حال

دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ "میرزا ابراہیم حسین کو شکست ہوئی، تو اس کے لشکریوں پر بھی مصیبت آئی، میں بھی ان لشکریوں میں تھا، یہ لشکری لٹ لٹا کر ننگے اور بھوکے پیر گدہ حضرت پیر دستگیر کی خدمت میں پہنچے، انھوں نے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ عطا کیا جب میری باری آئی تو یہ کرتہ اپنے بدن مبارک سے اتار کر مجھکو مرحمت کیا، میں نے اس کو پہننا بے ادبی جانا، اور اس کو تحفہ کے طور پر امانت رکھ چھوڑا تھا، اب میں تم کو دے رہا ہوں"۔ میں نے اس کو بدیۂ غیبی تصور کیا، ایسا معلوم ہوا کہ ہوا نے ایک خزانہ لاکر دیدیا ہے، اور میں نے اس کو تبرک سمجھ کر لے لیا۔

نکہت پیراہنت آمد بہ من　　　لذت جاں یافتم زاں رانجہ
خواندہ بودم فاتحہ وصل ترا　　　شد قبول الحمد للہ فاتحہ

مجھکو ان کی وہ بات یاد آگئی کہ انھوں نے فرمایا تھا کہ پیراہن بھی وقت پر مل جائیگا، اس کو میں نے ان کی کرامت تصور کیا، اور اب اس پیراہنِ یوسف کو اپنی جان کے برابر حفاظت سے رکھے ہوئے ہوں۔ (ج ۳ ص ۲۸-۷۸)

ان تفصیلات کے معلوم ہونے کے بعد کیا عجب کہ ملا صاحب کے دل میں آتش عشق الٰہی بھی فروزاں رہتی ہو، اسی لیے اس زمانہ کے علما و صلحا بھی ان کی طرف مائل رہے، مثلاً ملا صاحب کے معاصر بزرگوں میں میاں کمال الدین حسین شیرازی اپنی عبادت، ریاضت ذکر الٰہی کے لیے مشہور تھے، ان سے ملا صاحب کے روابط چالیس[۱] برس تک رہے اور ان کو اعتراف ہے کہ وہ ان سے اپنی مہربانیوں کے ساتھ ملتے رہے کہ ان سے زیادہ کی گنجائش نہ تھی۔ ان کے لیے یہ شعر لکھا ہے:

بس عشق کہ آں کم نشد و بس حسن کہ آں کاست　　　عشق من و حسن تو ہماں بلکہ فزوں ہم

میاں کمال الدین حسین شیرازی بھی ان سے بڑی محبت رکھتے اور ان کے خطوط کو بڑے شوق سے پڑھتے۔ وہ ملا صاحب کو لکھتے ہیں کہ آپ کے متعدد خطوط یکے بعد دیگرے پہنچے، خدا گواہ ہے کہ ان سے بڑی تسلی اور تسکین ہوئی، کئی روز تک ان خطوط کو برابر پڑھتا رہا، اور صبح و شام ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعائیں کیں۔

الٰہی تا قیامت زندہ باشی (ج ۳ ص ۱۴۲-۱۴۴)

بزم صوفیہ

(طبع ثانی)

اس میں تیموری عہد سے پہلے کے صاحب تصانیف اکابر صوفیہ مثلاً شیخ ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ بختیار کاکی، قاضی حمید الدین ناگوری، شیخ بہاء الدین زکریا، خواجہ فرید الدین گنج شکر، خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی، شیخ بو علی قلندر، خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی، حضرت شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری، مخدوم جہانیاں جہاں گشت، حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی، سید محمد گیسو دراز، حضرت شیخ احمد عبد الحق توشہ ردولوی وغیرہ رحہم اللہ تعالیٰ کے حالات و تعلیمات و ارشادات کی تفصیل ان کے ملفوظات و تصنیفات کی روشنی میں بیان کی گئی ہے، اس اڈیشن میں، ان تمام بزرگوں کے حالات میں بکثرت اضافوں کے ساتھ، شیخ احمد عبد الحق توشہ ردولوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کا مستقل اضافہ ہے۔ قیمت للعہ/ ۱۴ م

مزید افادہ کے لیے حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و تعلیمات و ملفوظات الگ رسالہ کی صورت میں بھی چھپ گئے ہیں۔ قیمت ۸/

مصنفہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن

"منیجر"

کل مولود یولد علی الفطرۃ (الحدیث) کا مفہوم

(علامہ ابن عبدالبر کی کتاب التمہید کا ایک ورق)

از ضیاءالدین اصلاحی

علامہ ابن عبدالبر قرطبی مالکی (متوفی ۴۶۳ھ) نامور محدث و فقیہ اور جامع کمالات علمائے اسلام میں تھے، احادیث کی شرح و توجیہ میں وہ زیادہ ممتاز تھے، غالباً مالکیہ میں اس پایہ کا شارح حدیث نہیں گذرا ہے، اس حیثیت سے مالکیہ میں ان کو وہی درجہ اور مزیت حاصل ہے جو شافعیہ میں امام خطابی صاحب معالم السنن، حافظ نووی اور محی السنۃ بغوی کو اور حنفیہ میں امام ابوجعفر طحاوی کو حاصل ہے، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں:

وابن عبدالبر از مالکیہ مقدم آں جماعت	مالکیہ میں اس جماعت (شارحین حدیث)
(عجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ ص۱۰)	میں ان کو سب پر تقدم حاصل ہے

حافظ ابن عبدالبر کی مختلف فنون میں بلند پایہ کتابیں ہیں، ان کی زیادہ مایہ ناز اور اہم کتاب "تمہید" ہے، جو مؤطا امام مالکؒ کی ایک مبسوط اور ضخیم شرح ہے۔

انھوں نے مؤطا کی شرح میں استذکار، التقصی اور تجرید کے نام سے بھی کتابیں لکھی تھیں، ان کی اہمیت بھی مسلم ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے تمہید اور استذکار، دونوں کو خاص اور یادگار تصنیف قرار دیا ہے، لیکن یہ سب شرحیں تمہید کا خلاصہ یا مقدمہ ہیں۔

علامہ ابن حزمؒ کا بیان ہے:

"میں نے ایسی عمدہ اور بے نظیر شرح نہیں دیکھی، اس میں حدیث و فقہ کے مباحث پر جس طرح بحث و کلام کیا گیا ہے، اس کی مثال نہیں مل سکتی، اس سے عمدہ اور بہتر کا کیا سوال؟" (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۵ و نفح الطیب ج ۲ ص ۱۳۱)

علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں :-

"ابن عبد البر سے پہلے کسی نے ایسی عمدہ اور عظیم الشان کتاب نہیں لکھی" (تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۳۸۸)

شاہ عبد العزیز صاحب لکھتے ہیں :-

"یہ کتاب فقہ حدیث میں نادرۂ روزگار اور روشن ضمیر مجتہدوں کے لیے سرمۂ بصیرت ہے"

(بستان المحدثین ص ۶۹)

مولانا محمد سورتی مرحوم اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں :-

"یہ شروح حدیث میں ابن عبد البر کی قابل قدر اور بہترین کتاب ہے جس کی نظیر آج تک کوئی شرح نہیں دیکھی گئی۔ ابن حزم نے اس کتاب کی بید تعریف کی ہے، اور یہ اس کا استحقاق بھی رکھتی ہے ...... یہ کتاب اپنے فن میں لاجواب اور اعلیٰ ترین علمی کارنامہ ہے اس کا انتخاب ازبس ضروری ہے۔" (معارف فروری ۱۹۳۳ء)

افسوس ہے کہ یہ عظیم الشان اور گرانمایہ کتاب ابھی تک طبع نہیں ہوئی ہے، یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا مکمل نسخہ کہیں موجود ہے یا نہیں؟ حجاز، مصر اور ہندوستان کے بعض کتب خانوں میں جو قلمی نسخے ہیں وہ غالباً ناقص ہیں۔

۱۳۵۰ھ میں ان کی تصنیف "تجرید" قاہرہ سے شائع ہوئی تو اس کے آخر میں مصری نسخے سے تمہید کے چند صفحے بھی شامل کر دیے گئے جو مؤطا کی بعض حدیثوں کی شرح و توجیہ پر مشتمل ہیں، ان ہی متفرق صفحات میں مشہور حدیث "کل مولود یولد علی الفطرۃ" کی مفصل

شرح و توجیہ بھی بیان کی گئی ہے۔ اور اس کے آخر میں ان تمام حدیثوں کو جمع کیا گیا ہے جو صغر سنی میں مرنے والے بچوں کے متعلق وارد ہیں۔

علامہ ابن عبد البر نے اس بحث میں اپنی جو رائے ظاہر کی ہے اس سے کسی کو اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اس موضوع پر ان کی بحث بڑی جامع اور پر مغز ہونے کے علاوہ بعض حیثیتوں سے نہایت اہم اور منفرد نوعیت کی ہے، اس حدیث پر ایسی بسیط بحث اور کہیں نہیں ملتی، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس کے حوالے دیے ہیں۔ علامہ ابن قیمؒ نے قضا و قدر کے مسائل پر شفاء العلیل کے نام سے ایک بڑی اہم اور عمدہ کتاب لکھی ہے، اس کے آخر میں اس حدیث پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے، لیکن اولاً تو اس کا موضوع ہی دوسرا ہے اور مصنف کا اصل مقصد قدریہ وغیرہ منکرین تقدیر کا رد و ابطال ہے، دوسرے علامہ ابن عبد البر کی بحث و تشریح اس سے زیادہ مبسوط اور جامع ہے، اسی بنا پر علامہ ابن قیم نے اس کا بڑا حصہ نقل کر دیا ہے۔ اس مضمون میں اسی پر از معلومات شرح کا ملخص درج کیا جاتا ہے۔ اور حواشی میں بعض ضروری باتوں کا اضافہ اور حوالوں وغیرہ کی تخریج کر دی گئی ہے۔

امام مالکؒ نے اس حدیث کی تخریج اس طرح کی ہے۔

مالک عن ابی الزناد عن الاعرج	امام مالکؒ ابو الزناد سے وہ اعرج سے
عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ	اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے
صلی اللہ علیہ وسلم قال کل مولود	ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ	کہ "ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے
او ینصرانہ کما تناتج الابل	والدین اسے یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں،
من بھیمۃ جمعاء ھل تحس من جدعاء	جس طرح کہ اونٹنی کے پیٹ سے کامل الخلقت

قالوا یارسول اللہ ارأیت الذی یموت وھو صغیر قال اللہ اعلم بما کانوا عاملین[1]

اور سالم جانور پیدا ہوتا ہے، کیا تم اس میں کوئی ایسا جانور دیکھتے ہو جس کے ناک یا کان کٹے ہوئے (ناقص الاعضاء) ہوں صحابہ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! آپ اسکے متعلق کیا فرماتے ہیں جو بچپن ہی میں فوت ہو جاتا ہے، آپ نے فرمایا، اللہ زیادہ جانتا ہے اس کو جو وہ کرنے والے تھے۔

یہ حدیث جس کو حضرت ابو ہریرہؓ کے علاوہ دوسرے صحابہ نے بھی روایت کیا ہے[2]، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد صحیح و ثابت طرق سے مروی ہے، حضرت ابو ہریرہؓ سے اس کی روایت کرنے والے اصحاب کے نام یہ ہیں:

عبد الرحمٰن اعرج، سعید بن مسیب، ابو سلمہ، حمید (یہ دونوں حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کے صاحبزادے ہیں)، ابو صالح سمان، سعید بن ابی سعید، محمد بن سیرین[3]

---

[1] موطا امام مالک کتاب الجنائز ص ۸۵ بعینہٖ اسی سند سے امام ابو داؤد نے بھی اس حدیث کی اپنی سنن میں تخریج کی ہے، انکے اور امام مالک کے درمیان صرف ایک راوی قعنبی کا واسطہ ہے لیکن انکے یہاں ارأیت الذی یموت کی جگہ افرأیت من یموت ہے (ج ۲ ص ۲۹۲ باب فی ذراری المشرکین [2] غالباً صحاح میں یہ صرف حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے مروی ہے، البتہ امام احمد نے انکے علاوہ حضرت جابر بن عبد اللہ اور حضرت اسود بن سریع سے بھی اسکی روایت کی ہے،

(ملاحظہ ہو مسند احمد ج ۳ ص ۳۵۳، ۴۳۵ و ج ۴ ص ۲۴) [3] حمید بن عبد الرحمٰن بن عوف، سعید بن ابی سعید اور محمد بن سیرین کے علاوہ سب کی حدیثیں صحاح، مسند احمد و مسند طیالسی میں مذکور ہیں، حمید کی روایت کی تخریج ابن عبد البر نے بھی کی ہے اور سعید و محمد کی روایات آگے نقل کی ہیں، اس فہرست میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرنے والے چند لوگوں کے نام رہ گئے ہیں جو یہ ہیں: ہمام بن منبہ، عبد الرحمٰن بن یعقوب حرقی، طاؤس اور ذکوان، ہمام کی روایت صحیحین اور مسند احمد میں، عبد الرحمٰن حرقی کی صرف صحیح مسلم میں اور طاؤس و ذکوان کی صرف مسند احمد میں ہے۔

ابن شہاب[1] نے بھی اس کی روایت کی ہے۔ لیکن ان کے تلامذہ کا اسناد میں اختلاف ہے چنانچہ معمر اور زبیدی نے زہری سے جو روایت کی ہے اس کو ان سے سعید بن مسیب نے حضرت ابوہریرہؓ سے بیان کیا ہے، اور یونس بن ابی ذئب کی زہری سے جو روایت ہے اس کو ان سے ابو سلمہ نے حضرت ابوہریرہؓ کے واسطہ سے روایت کیا ہے[2]، امام اوزاعی نے امام زہری سے جو حدیث بیان کی ہے اس کو ان سے حمید بن عبدالرحمٰن نے حضرت ابوہریرہؓ سے بیان کیا ہے،

محمد بن یحییٰ ذہلی نے ان سب طرق کو صحیح اور محفوظ قرار دیا ہے لیکن امام مالکؒ نے ابن شہاب زہری کے بجائے یہ حدیث ابوالزناد کے واسطے سے مؤطا میں درج کی ہے، ان کے شیخ عبداللہ بن فضل ہاشمی نے امام مالک کی مذکورۂ بالا سند ہی سے اس حدیث کو اس طرح بیان کیا ہے،

کل مولود یولد علی الفطرۃ	ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے بعد ازاں
فابواہ یھودانہ و ینصرانہ	اسکے ماں باپ اس کو یہودی، نصرانی
و یمجسانہ کالبھیمۃ تنتج البھیمۃ	اور مجوسی بنا دیتے ہیں جانور کی طرح
ھل تحس فیھا من جدعاء	جو (سالم اور تام الاعضاء) جانور

[1] یعنی محمد بن مسلم زہری جو نامور تابعی عالم ہیں، انھوں نے اگرچہ بعض صحابہ سے روایتیں کی ہیں لیکن حضرت ابوہریرہؓ سے ان کے روایت کرنے کی صراحت نہیں ملتی، حافظ ابن حجر نے حضرت ابوہریرہؓ سے ان کے ارسال کی تصریح کی ہے (تہذیب ج ۹ ص ۴۴۹) یہ حدیث بھی جیسا کہ آگے متن کی تفصیل سے ظاہر ہے، انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے براہ راست نہیں بیان کیا ہے بلکہ بالواسطہ[2] معمر بن راشد ازدی اور محمد بن ولید بن عامر زبیدی کی حدیثیں صحیح مسلم اور مسند احمد میں اور ابن ابی ذئب کی صحیحین، مسند احمد اور مسند طیالسی میں ہیں

حتی یکونوا ھم یجدعونھا | جنتا ہے، کیا تم کو اس میں کوئی ناک یا کان کٹا (ناقص الاعضاء) جانور نظر آتا ہے یہاں تک کہ لوگ خود ہی اسکے ناک اور کان (کاٹتے ہیں)

اس میں صحابہ کے سوال اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا جو امام مالکؒ کی روایت کے آخر میں ہے، ذکر نہیں ہے، اور یمجسانہ کا اضافہ ہے جو امام مالکؒ کی روایت میں نہیں ہے، ابن شہاب کی روایتوں میں بھی یہ سوال وجواب مذکور نہیں ہے، لیکن انھوں نے عطاء بن یزید کے واسطہ سے اس حدیث کی جو روایت کی ہے، اس میں سوال وجواب کا اس طرح ذکر ہے :۔

انہ سئل عن اولاد المشرکین فقال اللہ اعلم بما کانوا عاملین[1] | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین کی اولاد کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ زیادہ جانتا ہے اسکو جو وہ کرنے (والے تھے)

اس حدیث کے مفہوم میں اہل علم کا اختلاف ہے، ایک جماعت کے نزدیک یہاں "کل" کے لفظ میں عموم نہیں ہے اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ بچہ جو فطرت پر غیر مسلم والدین کے یہاں پیدا ہوتا ہے، اس کو اس کے والدین یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں، اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ بنی آدم کے تمام بچے فطرت پر پیدا ہوتے ہیں، بلکہ صرف کافر والدین کے یہاں جو بچے فطرت پر پیدا ہوتے ہیں ان کو وہ کافر بنا دیتے ہیں، درحقیقت بچوں کا حکم انکے

---

[1] جن بزرگوں سے یہ حدیث مروی ہے ان سب کے یہاں الفاظ وغیرہ کا معمولی فرق ہے، علامہ ابن عبد البر نے گو تمام روایات کا استقصاء نہیں کیا ہے، تاہم آگے کچھ حدیثیں نقل کی ہیں، ان سے اس فرق و اختلاف کا پتہ چلتا ہے۔

والدین کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر وہ مسلمان ہیں تو بچوں کا حکم بھی مسلمانوں جیسا ہوگا، اور اگر وہ یہودی ہیں تو بچہ بھی یہودی سمجھا جائے گا، اور اسی اعتبار سے وہ اپنے والدین کا وارث ہوگا، اسی طرح اگر والدین نصرانی یا مجوسی ہیں تو بچے کا حال بھی ان ہی جیسا ہوگا، تا آنکہ وہ سن رشد وتمیز کو پہنچ کر اپنے متعلق خود کوئی فیصلہ کرنے کے قابل ہو جائے، کیونکہ جب وہ اپنی عمر کے اس مرحلہ میں داخل ہو جائے گا تو اس کو خود ذمہ دار سمجھا جائے گا، اور اس وقت اس کے ساتھ وہ حکم اور معاملہ کیا جائیگا، جو وہ خود اپنے لیے پسند اور تجویز کرے گا، اور بچپن میں والدین کی رعایت اور اعتبار سے جو معاملہ اس کے ساتھ کیا جاتا تھا، وہ اب نہیں کیا جائے گا۔

ان لوگوں نے اپنے مفہوم کی تائید میں حضرت ابی بن کعبؓ کی یہ حدیث پیش کی ہے:

ان الغلام الذی قتلہ الخضر	بیشک اس غلام کو جسے حضرت خضرؑ نے
طبعہ اللہ یوم طبعہ کافرا[1]	قتل کیا اس کو خدا نے اس کی پیدائش ہی کے روز کافر بنایا تھا۔

ان لوگوں کا دوسرا استدلال اس روایت سے ہے:۔

الا ان بنی آدم خلقوا طبقات	بنی آدم کو مختلف حالتوں میں پیدا کیا گیا ہے
فمنھم من یولد مومنا ویحیا	ان میں سے بعض لوگ مومن پیدا ہوتے ہیں
مومنا ویموت مومنا ومنھم	اور مومن ہی جیتے اور مرتے ہیں، اور بعض
من یولد کافرا ویحیی کافرا و	لوگ کافر پیدا ہو کر کافر ہی زندہ رہتے

---

[1] یہ حدیث مختلف کتابوں میں الفاظ کے فرق کے ساتھ ملتی ہے، صحیح مسلم (کتاب القدر ج ۲ ص ۳۱۳) اور سنن ابی داؤد (ج ۲ ص ۲۹۱) کے الفاظ تقریباً یکساں ہیں، صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں (ان الغلام الذی قتلہ الخضر طبع کافرا ولو عاش لارھق ابویہ طغیانا وکفرا)

یموت کافرا و منھم من یولد	اور مرتے ہیں بعض لوگ پیدا تو مومن ہوتے
مومنا و یحیا مومنا و یموت کافرا	ہیں اور مومن ہی ہو کر زندہ بھی رہتے ہیں
و منھم من یولد کافرا و یحیا کافرا	لیکن کافر ہو کر مرتے ہیں، اور بعض لوگ
و یموت مومنا[1]	کافر پیدا ہوتے اور زندہ رہتے ہیں، مگر
	مومن ہو کر مرتے ہیں۔

ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے ارشاد مبارک "کل مولود یولد الخ" میں عموم نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور اس کے والدین یہودی یا نصرانی ہوتے ہیں، اس کو اس کے والدین یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں لیکن یہ صورت سن بلوغ سے پہلے کی ہے، سن بلوغ کے بعد تو وہ خود اپنے لیے جس راہِ عمل کو چاہیگا اسے اختیار کریگا۔

عام محدثین کے الفاظ قریب قریب امام مالک کی حدیث کے مطابق ہیں، جن لوگوں نے کل بنی آدم الخ کے الفاظ کی روایت کی ہے وہ اولاً تو ثابت اور مسلم نہیں ہیں، ثانیاً اگر انکا ثابت ہونا مسلم بھی ہو جائے تو اس سے اس مفہوم پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا، کیونکہ "کل" کا خصوص کے لیے آنا کلام عرب میں روا ہے، قرآن مجید میں ہے:

تدمر کل شیء بامر ربھا (احقاف ۲۵) — وہ ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے اکھاڑ پھینکے گی۔

یہاں ہوا کے ہر چیز کو اکھیڑ دینے کا ذکر ہے، مگر یہ مطلق نہیں ہے، کیونکہ اس نے آسمان اور زمین کو نہیں اکھاڑ پھینکا تھا، دوسری جگہ ہے:

فتحنا علیھم ابواب کل شیء (انعام ۴۴) — ہم نے کھول دیے ان پر ہر چیز کے دروازے

---

[1] یہ ایک طویل حدیث کا جز ہے جو حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے ٹکڑا ہے، امام احمدؒ نے مسند ابی سعید میں دو جگہ اس کی تخریج کی ہے (ج ۳ ص ۱۹ و ۶۱)

یہاں بھی موقع کلام سے ظاہر ہے کہ خدا نے ان پر اپنی رحمت کے دروازے بند نہیں کیے تھے۔

اوپر گذر چکا ہے کہ اس حدیث کے الفاظ تقریباً وہی ہیں جو امام مالکؒ کے ہیں، چنانچہ امام اوزاعیؒ کے الفاظ یہ ہیں:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ

او ینصرانہ او یمجسانہ

اسی قسم کے الفاظ معمر کی حدیث کے بھی ہیں، ملاحظہ ہو،

کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ

کما تنتج البھیمۃ بجماء ھل تحسون من جدعاء ثم یقول ابوھریرۃ

اقرؤا ان شئتم (فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا)

یہ حدیث عبد الرزاق سے بھی مروی ہے اور جہاں تک ہم کو علم ہے، ان کا معمر سے ان الفاظ (کل مولود الخ) میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ان الفاظ کے متعلق ابن ابی ذئب کی روایت کا بھی یہی حال ہے، البتہ اس میں حضرت ابوہریرہؓ کا قول (اقرؤا ان شئتم) مذکور نہیں ہے۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ "کل" کے لفظ میں عموم ہے، اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تمام بچے فطرت پر پیدا کیے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود سن رشد و بلوغ کو پہنچنے سے پہلے ان کے معاملہ میں ان کے والدین کا اعتبار کیا جائے گا، اور ان ہی کے مطابق ان پر احکام بھی لگائے جائیں گے، البتہ سن رشد و تمیز کے بعد وہ خود مختار ہوں گے اور اپنے متعلق فیصلے کریں گے۔

ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ اس نوعیت کے کلام کا حق و اقتضا یہی ہے کہ اس کو عموم پر محمول کیا جائے، علاوہ ازیں کئی حدیثوں میں اس قسم کے الفاظ آئے ہیں، جن سے اس کو خصوص پر محمول کرنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی، مثلاً عبد الرحمن بن ہرمز سے جعفر بن ربیعہ

نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ :-

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ او ینصرانہ کما تنتج الابل من بھیمۃ جمعاء ھل تحس من جدعاء قال افرأیت من یموت صغیراً یا رسول اللہ قال اللہ اعلم بما کانوا عاملین۔

ابو الزناد نے اعرج سے اور وہ ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کل بنی آدم یولد علی الفطرۃ الخ

ابن وہب نے یونس بن یزید سے، وہ ابن شہاب سے، وہ ابو سلمہ سے اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا :-

مامن مولود الا یولد علی الفطرۃ ثم یقول "فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ"۔

عبد اللہ بن صالح یونس سے، وہ ابن شہاب سے، روایت کرتے ہیں کہ انکو ابو سلمہ ابن عبد الرحمن نے بتایا کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مامن مولود الا یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ وینصرانہ ویمجسانہ کما تنتج البھیمۃ جمعاء ھل تحسون فیھا من جدعاء ثم قال ابو ھریرۃ اقرؤا (فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ ذالک الدین القیم)

سمرہ بن جندبؓ کی حدیث میں جو حدیث رؤیا کے نام سے مشہور ہے، مروی ہے کہ

---

[1] حضرت ابن ربیعہ کی حدیث میں "کل مولود الخ" کے بجائے "کل بنی آدم" کا لفظ آیا ہے، یہ نقل و کتابت کی غلطی ہے ورنہ یہاں اس کا نقل کرنا ہی بے موقع ہے، آگے اس کی مزید توضیح کیجائے گی۔

واذا الشیخ الذی فی اصل الشجرۃ	اور جس ضیف اور بوڑھے شخص کو تم نے
ابراھیم والولدان حولہ اولاد	درخت کی جڑ میں دیکھا وہ حضرت ابراہیمؑ
الناس[1]	تھے اور ان کے ارد گرد لوگوں کے بچے تھے۔

ان حدیثوں کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ امام مالکؒ کی حدیث اور اسکے ہم معنی حدیثوں کی وہ تاویل درست نہیں ہوسکتی، جو فریقِ اول نے بیان کی ہے کہ والدین صرف اپنے فطرت پر پیدا ہونے والے بچوں ہی کو یہودی اور نصرانی وغیرہ بناتے ہیں، کیونکہ بچے تو سبھی سب فطرت ہی پر پیدا ہوتے ہیں[2]۔

امام ابو حنیفہؒ کے نامور شاگرد اور مشہور فقیہ امام محمد بن حسنؒ شیبانی سے ابو عبید نے اس حدیث کا مفہوم دریافت کیا تو انھوں نے اس سے زیادہ کچھ جواب نہیں دیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو جہاد کا حکم دیے جانے سے پہلے یہ فرمایا تھا۔ ابو عبید کا بیان ہے کہ عبد اللہ ابن مبارک نے فرمایا کہ اس کی تفسیر حدیث کے آخری حصہ میں "اللہ اعلم بما کانوا عاملین" کہکر کی گئی ہے[3]۔ اس سلسلہ میں تقریباً امام مالکؒ کی رائے بھی یہی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ تاویل کافی و واضح نہیں ہے، اس سے تو محض یہ ثابت ہوتا ہے کہ بچوں کے باب میں توقف کرنا چاہیے، اور جب تک وہ عاقل و بالغ نہ ہو جائیں، ان کے کفر و ایمان کے بارہ میں کوئی فیصلہ کرنے سے

---

[1] یہ بخاری کی طویل حدیث کا ٹکڑا ہے جو کتاب الجنائز میں ہے لیکن اس میں والولدان کے بجائے والصبیان کا لفظ ہے۔

[2] اس میں استدلال کا پہلو یہ ہے کہ چونکہ تمام بچے فطرت پر پیدا کیے گئے ہیں، اس لیے وہ بچپن میں مرجانے کی صورت میں حضرت ابراہیمؑ کے پاس جنت میں ہوں گے۔ حافظ ابن حجرؒ نے اسی مفہوم کو مرجح قرار دیا ہے (فتح الباری ج ۳ ص ۱۹۵)

[3] امام خطابی اور علامہ نووی نے ابن مبارکؒ کے قول کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے نزدیک بچہ سعادت و شقاوت پر پیدا کیا جاتا ہے۔

ریز کرنا چاہیے۔

امام محمدؒ کے متعلق ہمارا خیال یہ ہے کہ یا تو انھوں نے مسئلہ کی نزاکت اور اشکال کی بنا پر جواب دینے سے گریز کیا ہے، یا ان کو اس سے واقفیت ہی نہ رہی ہو یا پھر یہ وجہ رہی ہو کہ وہ اس طرح کے مسئلہ میں غور و خوض کو ناپسند کرتے اور خلاف احتیاط سمجھتے رہے ہوں، ان میں سے جو وجہ بھی رہی ہو لیکن درحقیقت ان کا یہ کہنا خلاف واقعہ ہے[1] کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کے

---

[1] نووی اور ابن حجر نے امام محمدؒ کے قول کی ابو عبیدہ ہی کے حوالہ سے وضاحت کی ہے کہ اگر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوا ہوتا تو بچپن ہی میں مر جانے کے بعد اس کے والدین اس کے وارث نہیں ہو سکتے تھے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اس کے وارث ہوتے ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بات احکام کے باقاعدہ نازل ہونے اور فرض کیے جانے سے پہلے آپ نے فرمائی تھی، اور احکام کی فرضیت کے بعد یہ صورت تبدیل ہو گئی، اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ بچے اپنے آباء کے دین پر پیدا ہوتے ہیں، ورنہ وارث ہونے کے کیا معنی ہوں گے (نووی شرح مسلم ج ۱ ص ۲۰۸ و فتح الباری ج ۳ ص ۱۹۰)۔

اس سلسلہ میں علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ امام محمدؒ کے قول کا مقصد یہ ہے کہ شریعت میں یہ طے ہے کہ یہودی و نصرانی کے بچے دنیا کے احکام میں اپنے والدین کے دین کے تابع ہیں، اس لیے ان کے بارہ میں کفر کا حکم لگایا جائے گا اور انکے جنازہ کی نماز وغیرہ نہیں پڑھی جائے گی اور نہ مسلمان ان کے وارث ہو سکیں گے، تا آنکہ وہ سن رشد و بلوغ کو نہ پہنچ جائیں، اور یہ بالکل حق ہے، لیکن ان کا خیال یہ ہے کہ اس حدیث کا اقتضا یہ ہے کہ بچوں کے لیے دنیا میں مسلمانوں کے احکام ہوں گے، اس لیے انھوں نے فرمایا کہ یہ منسوخ اور جہاد کے حکم سے پہلے کی حدیث ہے، کیونکہ جہاد کا حکم آجانے کے بعد بچوں کا استرقاق مباح ہو گیا، جب کہ مسلمان کا استرقاق نہیں ہوتا۔ حالانکہ بچے کا دنیوی احکام میں اپنے والدین کے دین کا تابع ہونا ایک ایسا امر شرعی ہے جو دائمی ہے، رہی یہ حدیث تو اس کا مقصد انکے متعلق اس طرح کے احکام بیان کرنے کے بجائے اس فطرت کا بیان ہے جس پر بچے پیدا کیے جاتے ہیں۔ (شفاء العلیل ص ۲۸۸)

حکم سے پہلے یہ فرمایا تھا، کیونکہ اسود بن سریع کی درج ذیل روایت سے بداہتہً ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ نے جہاد کا حکم دیئے جانے کے بعد یہ فرمایا تھا،

ما بال قوم بلغوا فی القتل حتی	جو لوگ قتل و خونریزی میں اس قدر تجاوز
قتلوا الولدان فقال رجل اولیس	کر جائیں کہ بچوں تک کو قتل کر ڈالیں،
انما هم اولاد المشرکین انه	ان کا انجام کیا ہوگا، ایک شخص نے کہا کہ
لیس من مولود الا وهو یولد	کیا یہ مشرکین کے بیٹے نہیں تھے، آپؐ نے فرمایا!
علی الفطرۃ [1]	کوئی بچہ ایسا نہیں ہے جو فطرت پر پیدا

یہ حدیث صحیح ہے اور اس کو متعدد لوگوں نے بیان کیا ہے، اور سمرۃؓ بن جندب سے ابو رجاء عطاردی نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: [کل مولود یولد علی الفطرۃ فناداہ الناس یارسول اللہ واولاد المشرکین قال واولاد الناس] [2]

---

[1] امام احمدؒ نے مسند میں کئی جگہ اس کی تخریج کی ہے (ج ۳ ص ۴۳۵ و جلد ۴ ص ۲۴) لیکن الفاظ قدرے مختلف ہیں بعض حدیثوں میں تصریح ہے کہ یہ بات آپ نے غزوۂ حنین کے موقع پر فرمائی تھی، ایسی صورت میں ابن عبدالبر کے نقد کی قوت مزید ثابت ہوتی

ہے [2] یہ حدیث بھی اسی موقع اور سلسلہ کی ہے، دوسرے اس کے راوی سمرہ بن جندبؓ ہیں جو اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنی والدہ کے ہمراہ جب مدینہ تشریف لائے تو اس قدر کمسن تھے کہ ایک غزوہ میں شرکت کے لیے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا، تو آپ نے ان کی کمسنی کی وجہ سے ان کا انتخاب نہیں کیا، گو اس کے بعد وہ دوسرے غزوات میں شریک ہوئے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی روایت جہاد کا حکم آجانے کے بعد ہی کی ہوسکتی ہے، کیونکہ اس سے پہلے وہ روایت کرنے کے قابل ہی نہیں تھے،

لفظ فطرت کے مفہوم میں علماء کا شدید اختلاف ہے۔ اب ہم علماء کے اختلافات اور ان کے دلائل کی تفصیل نقل کرتے ہیں:۔

اہل فقہ و نظر کی ایک جماعت کے نزدیک فطرت سے خلقت مراد ہے، اور مطلب یہ ہے کہ بچہ کی خلقت کے اندر اللہ کی معرفت کی صلاحیت و استعداد ودیعت کی گئی ہے، گویا آپ کا مقصد یہ بتانا ہے کہ چونکہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے اس لیے جب وہ سن رشد کو پہنچ جائے گا اور اس کے اندر علم و معرفت کی استعداد پیدا ہو جائے گی تو وہ اپنے رب کی معرفت حاصل کر سکتا ہے، کیونکہ اللہ نے اس کی خلقت ان بہائم سے مختلف بنائی ہے جن کی معرفت رب انی تک رسائی ہی نہیں ہو سکتی۔ فطرت کے خلقت اور فاطر کے خالق کے معنی میں ہونے کی دلیل ان آیات سے ملتی ہے۔

الحمد للہ فاطر السموات والارض	سارا شکر اللہ کو ہے جس نے بنا نکالے
(فاطر-۱)	آسمانوں اور زمین کو

یہاں آسمانوں اور زمین کے فاطر سے ان کا خالق مراد ہے، دوسری آیت میں ہے:۔

ومالی لا اعبد الذی فطرنی	اور مجھکو کیا ہوا کہ میں بندگی نہ کروں
(یس - ۲۲)	اس کی جس نے مجھکو پیدا کیا۔

اس میں "فطرنی" "خلقنی" کے معنی میں ہے۔ اس قسم کی آیتیں اور بھی ہیں۔

ان لوگوں نے بچوں کے کفر و انکار یا معرفت و ایمان پر پیدا کیے جانے کی تردید کی ہے، اور یہ کہا ہے کہ ان کی خلقت اور بناوٹ صحت و سلامتی پر کی گئی ہے، کسی شخص کو طبعی اور پیدائشی طور پر ایمان و کفر یا معرفت و

انکار سے کوئی اضافت اور نسبت نہیں ہوتی، البتہ جب سن بلوغ وتمیز کو پہنچ جاتا ہے تب اس کے اندر کفر وایمان کا عقیدہ اور معرفت وانکار سے تعلق پیدا ہوتا ہے، جیسا کہ خود اسی حدیث میں کہا گیا ہے کہ [کما تنتج البهیمة بهیمة جمعاء یعنی سالمة هل تحسون فیها من جدعاء یعنی مقطوعة الاذن] یعنی بچہ اسی طرح صحیح وسالم اور بے داغ پیدا ہوتا ہے، جس طرح کہ جانور سالم اور بلا کان کٹا ہوا پیدا ہوتا ہے، پس اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی آدم کے قلوب کو بہائم کے مماثل ومشابہ قرار دیا ہے، کیونکہ وہ کامل الخلقت، بلا عیب اور ہر نقص وکمی سے پاک پیدا ہوتے ہیں، لیکن جب لوگ ان کے ناک اور کان کاٹ دیتے ہیں تو وہ بحائر وسوائب وغیرہ کہلاتے ہیں، انسان کی پیدائش کے وقت اس کے قلوب کا حال بھی ان ہی صحیح وسالم پیدا ہونے والے چوپایوں کی طرح ہوتا ہے، وہ کفر وایمان اور انکار ومعرفت وغیرہ کی نسبت سے بالکل خالی ہوتے ہیں لیکن سن بلوغ کے بعد ان پر شیاطین حاوی اور غالب ہو جاتے ہیں، اس لیے اکثر لوگ تو کفر وانکار کا رویہ اختیار کر لیتے ہیں اور کم لوگ اس سے محفوظ رہتے ہیں، ورنہ اگر ابتدا ہی میں بچے کفر وایمان پر پیدا کیے جاتے تو وہ اپنی اس اولین حالت کو چھوڑ کر کسی اور حالت میں کبھی منتقل نہیں ہو سکتے تھے، حالانکہ اس کے بالکل برعکس ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ لوگ ایمان کے بعد کفر اور کفر کے بعد ایمان کو اختیار کرتے رہتے ہیں، اس لیے پیدائش کے وقت بچوں میں کفر وایمان کی فہم وتمیز یا معرفت وانکار کا شعور وادراک ہونا بالکل عقلاً محال ہے، کیونکہ اس وقت تو وہ اللہ کی طرف سے ایک ایسے حال میں ہوتے ہیں جس میں نہ کچھ سمجھ سکتے ہیں اور نہ کوئی بات ہی جان سکتے ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:۔

واللہ اخرجکم من بطون امہاتکم — اور اللہ نے تم لوگوں کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے

لا تعلمون شیئا (نحل - ۷۸) اسی حال میں نکالا کہ تم کسی چیز کو جانتے نہیں تھے،

اور جب وہ اس وقت کچھ جانتے ہی نہیں تو ان کو کفر و ایمان کی تمیز یا معرفت و انکار کا شعور کس طرح ہو جائے گا۔[۱]

ہمارے نزدیک حدیث میں لوگوں کے جس فطرت پر پیدا کیے جانے کا ذکر ہے، اس کی تاویل کے سلسلہ میں سب سے زیادہ صحیح و صائب مفہوم یہی ہے[۲]، اس کی تفصیل یہ ہے کہ فطرت

---

[۱] علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ "حدیث کا یہ مطلب نہیں ہو کہ بچہ پیدائش کے وقت ہی دین کو جانتا اور سمجھتا ہو کیونکہ اللہ نے تو خود فرمایا ہے (و اللہ اخرجکم من بطون امھاتکم الخ) بلکہ یہ مراد ہے کہ اسکی فطرت دین اسلام کی معرفت و محبت کی مقتضی ہوتی ہے، پس نفس فطرت دین کے اقرار و محبت کو مستلزم ہے نہ کہ قبولیت دین کو، کیونکہ اگر یہ ہوتا تو والدین کے یہودی و نصرانی بنانے سے اس میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا، اور نہ ان کی تلقین و ترغیب فطرت کی قبولیت دین کے لیے مانع بن سکتی تھی پس حدیث کا سیدھا سادہ مفہوم یہ ہوگا کہ ہر بچہ اقرار ربوبیت کے تقاضا پر پیدا کیا جاتا ہے اس لیے اگر وہ اسی حال پر چھوڑ دیا گیا اور اس کے مخالف عوارض سے اس کا سابقہ نہ ہوا تو وہ اس سے منحرف نہیں ہوگا جس طرح کہ بچہ کے اندر اپنے جسم و بدن کے لائق غذا یعنی دودھ سے فطرۃً رغبت و محبت ہوتی ہے، اور جب تک اس سے اسکو منحرف کرنے والی کوئی اور خاص چیز نہ ہو وہ دودھ سے بیزار نہیں ہوتا، اسی لیے حدیث میں فطرت کو لبن (دودھ) کے مشابہ بتایا گیا ہو (شفاء العلیل ص ۲۸۹)

[۲] امام نووی اور شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی اسی مفہوم کو ترجیح دیا ہے، شاہ صاحب لکھتے ہیں: "اس حدیث کا سب سے زیادہ صحیح مفہوم یہ ہے کہ فطرت سلیم دین حق کا سبب و وسیلہ ہے، بچہ اس سلیم طبیعت اور جبلت پر پیدا ہوتا ہے جس میں دین حق کو قبول کرنے کی فطری استعداد ہوتی ہے پس اگر بچہ کو اسی حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اس پر قائم رہے گا اور اس کو ترک کر کے کوئی اور راہ اختیار نہیں کریگا جو لوگ اس فطری راہ عمل کو چھوڑ دیتے ہیں وہ دراصل ماحول کے بگاڑ، نشو و نما کی خرابی اور تقلید وغیرہ کا نتیجہ ہوتا ہے، اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بچہ کے اندر

[illegible]

دہ اصل سلامت و استقامت کا نام ہے، جیسا کہ عیاض بن حماد نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا تعالیٰ سے حکایت کرتے ہوئے فرمایا کہ :۔

انی خلقت عبادی حنفاء[1] — بیشک میں نے اپنے بندوں کو حنیف

(یعنی علی استقامۃ وسلامۃ) — یعنی استقامت اور سلامتی پر پیدا کیا ہے،

کلام عرب میں حنیف مستقیم و سالم کے معنی میں آتا ہے۔ اعرج (لنگڑا) کو بطور شگون احنف کہا جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا منشا یہ بتانا ہے کہ لوگ پیدائش کے وقت تمام آفات و عوارض سے پاک اور معاصی و طاعات کے کاموں سے خالی ہوتے ہیں، اس لیے اس وقت نہ ان سے کسی معصیت کا ظہور ہوتا ہے اور نہ طاعت کا، کیونکہ اس وقت تو ان کو اس کا کوئی علم و شعور ہی نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے اس غلام کے بارہ میں جس کو حضرت خضر نے قتل کیا تھا، یہ فرمایا کہ

أقتلت نفسا زكية بغير — کیا تونے ایک ستھری جان کو بغیر کسی

نفس (کہف) — جان کے عوض مار ڈالا۔

کیونکہ یہ ابھی عمر کے اس مرحلہ میں داخل نہیں ہوا تھا جس میں عمل کی استعداد و صلاحیت پیدا ہوتی ہے، اس کی تائید مندرجہ ذیل آیتوں سے بھی ہوتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۲۰۳) لازمی طور پر ایمان موجود رہتا ہے، اور نہ ہی یہ پتہ چلتا ہے کہ دین حق کو قبول کرنے کے لیے فطرت کوئی واقعی علت ہے، اس حدیث کی غرض و غایت دین کی تعریف اور یہ بتانا ہے کہ طبائع میں فی الواقع اس کی جگہ ہوتی ہے اور نفوس اس کو واقعۃً پسند کرتے ہیں۔ (مصنف ج ۴ ص ۲۴۲) نووی نے بھی قریب قریب یہی بات لکھی ہے۔

[1] رواہ مسلم فی صحیحہ

انما تجزون ما کنتم تعملون (تحریم - ۷) — تم کو وہی بدلہ دیا جائے گا جو کرتے تھے۔

دوسری جگہ ہے :-

کل نفس بما کسبت رهينة (مدثر - ۳۸) — ہر ایک جی اپنے کیے کاموں میں پھنسا ہوا ہے۔

غور کرو ایک بچہ جس سے نہ کوئی عمل سرزد ہوا اور نہ جس کے اندر ابھی اس کی استعداد ہی ہے، وہ کسی چیز کا مکلف اور ذمہ دار کیسے ہو جائیگا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

وما كنا معذبين حتى نبعث رسولا (بنی اسرائیل - ۱۵) — اور ہم بلا نہیں ڈالتے جب تک نہ بھیجیں کوئی رسول۔

اور جب دنیوی زندگی میں بچوں پر حدود، قصاص اور عقوبات کے جاری نہ کیے جانے پر علماء کا اتفاق ہے، تو آخرت میں تو وہ اس کے بدرجۂ اولیٰ مستحق ہوں گے۔

اب آپ کے ارشاد [کما تنتج الابل من بهيمة جمعاء هل تحس من جدعاء] پر غور کرو تو ہمارا مدعا پوری طرح واضح ہو جائے گا، "البھیمۃ الجمعاء" سے وہ جامع خلقت اور سالم جسم والا جانور مراد ہے جو بالکل بے عیب اور ہر لحاظ سے کامل و سالم ہو، جدع کے معنی نقصان کے ہیں، یعنی جس وقت جانور پیدا ہوتا ہے، وہ بالکل صحیح و سالم ہوتا ہے، تم کو اس کے اندر کوئی نقص اور عیب نظر نہیں آسکتا، عیوب و نقائص تو بعد میں پیدا ہو جاتے ہیں، ٹھیک یہی حال بچے کا بھی ہے کہ وہ بالکل سالم ہوتا ہے، کفر و ایمان کے عوارض بعد میں اس پر طاری ہوتے ہیں۔

(باقی)

ہندوستان کی عربی شاعری میں عجمیت

از جناب ڈاکٹر حامد علی خاں صاحب لکچرار عربی ڈپارٹمنٹ مسلم یونیورسٹی

اس مضمون کی پہلی قسطیں جو "ہندوستان کے عربی شعرا" پر تھیں، بہت پہلے شائع ہو چکی تھیں، آخری قسط اب شائع ہو رہی ہے۔ ہر زبان کی شاعری اپنے گرد وپیش کے حالات کا آئینہ ہوتی ہے جس میں اس کے ماحول اور اس دور کے خیالات ورجحانات اور تہذیب وتمدن کا عکس نظر آتا ہے، اس لیے ایک ہی زبان کی شاعری کا رنگ مختلف زمانوں میں بدلتا رہتا ہے، اور دوسرے ملکوں میں جاکر تو اور بھی بدل جاتا ہے۔ ہندوستان کے بہت سے فارسی شعرا ایرانی شعراء کے ٹکر کے تھے۔ اس کے باوجود ان کے طرز نے سبک ہندی کا نام پایا، عربی شاعری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے، وہ بھی عرب سے نکلنے کے بعد دوسرے ملکوں کے اثرات سے متاثر ہوئی، بلکہ عباسی دور ہی میں جب عربوں کی حکومت تھی، حکومت کی زبان عربی تھی، عراق، عرب سے بالکل متصل تھا، عربی شاعری بہت بدل گئی تھی، اور اس میں عجمی اثرات اتنے غالب ہوگئے تھے کہ بعض شعراء فارسی کے الفاظ اور اصطلاحیں تک استعمال کرنے لگے تھے، اور عرب جاہلی کی شاعری پر تنقیدیں کرتے تھے، اس لیے ہندوستان کی عربی شاعری میں عجمیت حالات کا قدرتی نتیجہ ہے، جس کا اعتراف خود مضمون نگار نے بھی کیا ہے، اور مضمون کا عنوان "ہندوستان کی عربی شاعری میں عجمیت" رکھا ہے، انھوں نے انکے کلام میں جس قسم کی خامیاں دکھائی ہیں ان سے عرب شعرا کا کلام بھی خالی نہیں ہے، اس سے

ان کے کمال میں فرق نہیں آتا۔ اور آزاد بلگرامی، قاضی عبدالمقتدر، شاہ ولی اللہ کا
کلام کسی عربی شاعر کے کلام سے کم نہیں ہے،

(۴)

ہندوستانی باشندوں کی مختلف علاقوں میں مختلف مادری زبانیں تھیں، مسلمان حکمرانوں
کے زمانہ میں طالبان علم کو فارسی زبان کی تحصیل و تعلیم کی طرف متوجہ ہونا پڑا، کیونکہ ان کی
دفتری اور کاروباری زبان فارسی تھی، اس لیے عربی علوم کی تحصیل کے شائقین کو بھی پہلے فارسی
میں عمدہ استعداد و لیاقت بہم پہنچانا ضروری تھا، فارسی میں استعداد پیدا کرنے کے بعد ہی طلبہ
عربی زبان اور عربی علوم کی تحصیل کی طرف توجہ کرتے تھے۔ ان کی سہولت کے پیش نظر
عربی صرف، نحو، فلسفہ اور منطق وغیرہ کی مختصر اور ابتدائی کتابیں فارسی میں لکھی گئی تھیں۔
اور اساتذہ و طلبہ کی علمی رہنمائی کے لیے سیکڑوں عربی کتابوں کے حواشی، شروح اور تلخیصات
وغیرہ کا کام فارسی زبان میں انجام دیا گیا، اس کے علاوہ لاتعداد عربی کتابوں کے فارسی
میں ترجمے کیے گئے۔ اور مسلم تعلیم و تہذیب کے تمام پہلوؤں پر فارسی زبان میں خامہ فرسائی
کی گئی۔ فارسی کی تعلیم سے لغت فارسی کے محاورے، کہاوتیں، قصص اور تلمیحات وغیرہ
ذہنوں پر گہرے نقوش چھوڑتے تھے، جن کا اثر قدرتی طور پر ہندوستان کے عربی گو شعرا
کے کلام میں بھی نمایاں ہونا چاہیے تھا، اسی طرح مادری اور مقامی ہندی اثرات سے
بھی یہاں کی عربی شاعری کا متاثر ہونا ناگزیر تھا، ہندوستان کی عربی شاعری میں یہ
بھی اثرات کچھ تو ہندی یا فارسی محاوروں کے ترجمے ہیں اور کچھ قواعد کی غلطیاں، اس
مضمون میں ہندوستان کے عربی شعراء کے کچھ اشعار نقل کرکے انہی غیر عربی اثرات دکھانے
کی کوشش کی گئی ہے۔

سمندر توحید

لولا سھول جمالکم فی ذاتی ما کنت ارضی ساعۃ بحیاتی[1]

(اگر آپکے جمال کی بے پایاں وسعتیں میری ذات میں موجود نہ ہوتیں، تو میں اپنی زندگی سے ایک گھڑی کے لیے بھی راضی نہ ہوتا)

عربی میں جمال اور ذات کا استعمال ایک ساتھ نہیں ہوتا، نیز ذات کے ساتھ جمال کا استعمال بمعنی خوبصورتی درست نہیں ہے، عربی میں ایسے مقام پر لفظ حسن بولا جاتا ہے، لغت عربی میں لفظ 'ذات' کے معنی 'والی' و 'صاحبہ' ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں "ذات الجنب" اور "ذات الشمال" مذکور ہے، یونانی منطق و فلسفہ جب عربی میں منتقل ہوا تو "نفس شے، ذات شے، فی نفسہ، فی ذاتہ، فی حد ذاتہ" وغیرہ الفاظ عربی زبان میں رائج ہوئے اور فارسی زبان میں لفظ ذات بمعنی حقیقت استعمال ہوا، اس شعر میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

امیر خسرو

یدعو البرایا مد ظل محمد وعدا ہ تعدم مثل ظل محمد[2]

(تمام مخلوق دعا کیا کرتی ہے کہ "سلطان محمد کا سایۂ عاطفت ان پر دراز رہے، اور حضرت محمد کے سایہ کے مانند اس کے دشمن نیست و نابود ہو جائیں"!)

اس شعر میں امیر خسرو نے اگرچہ ذو معنی لفظ 'محمد' کا استعمال کرکے فن بدیع کی صنعت دکھائی ہے، مگر 'مد ظل محمد' فارسی محاورہ ہے، عربی میں سایے کی درازی کے لیے 'اظل' بمعنی 'صار ذا ظل' رائج ہے، فارسی دانوں نے بھی 'مد الظل' 'مد ظلکم'، 'دام الظل'

---

[1] مکتوب سید تقی حسن نجفی [2] اعجاز خسروی ۱۴۰:۱

دام ظلکم، دامت اظلالکم" وغیرہ کو عربی مرکبات بنا کر استعمال کیا ہے،

حتی علا فوق السماء سریرہ ۔۔۔ ورؤسہم غابت بہ تحت الثری[1]

(اس کا تخت شاہی رتبے میں آسمان سے بلند ہے، اور اسکے اعداکے سر زمین کے اندر غائب ہوگئے)

پہلے مصرعے میں فارسی خیال ہے، دوسرے مصرعے میں "رؤوس" کے ساتھ "غابت" کا استعمال عربی لغت کے مطابق نہیں ہے، عربی میں ایسے موقع پر باب مفاعلہ "واری، یواری، مواراۃ" کا استعمال کیا جاتا ہے۔

شیخ رکن الدین ملتانی

ثم الصلوٰۃ علی المختار من مضر ۔۔۔ خیر البریۃ من باک ومتبسم

(پھر قبیلہ مضر کی برگزیدہ ہستی پر رحمت کاملہ نازل ہو، وہ ہر خنداں اور گریاں مخلوق سے بہتر ہیں)

مخلوق کو "باک ومتبسم" میں منحصر کرنا لغت عربی کے موافق نہیں ہے، ہاں فارسی زبان میں "خنداں وگریاں" رائج ہے، بظاہر اسی فارسی ترکیب کا عربی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

قاضی عبد المقتدر شریحی

ثم اغتنم فرصۃ من قبل ان ضعفت ۔۔۔ قواک من سطوۃ الامراض والعلل[3]

(امراض وعلل کے غلبے کے باعث اپنے قویٰ کمزور ہو جانے سے پہلے ہی اس فرصت کو غنیمت سمجھو)

"من قبل ان ضعفت" میں "اَنْ" مصدریہ کے بعد فعل مضارع کی جگہ فعل ماضی لایا گیا ہے، جو عربی قواعد کی صریح خلاف ورزی ہے، اور تاویل کی کوئی گنجایش نہیں ہے، کیونکہ یہاں "اَنْ" نہ مخففہ ہو سکتا ہے، اور نہ حرف تفسیر، البتہ "اَنْ" زائدہ قرار دیا جا سکتا

---

[1] اعجاز خسروی ۱: ۵ ا [2] القصیدۃ الشوقیہ (قلمی) : ۲ [3] نزہۃ الخواطر ج ۱ ۔ ۳ : ۵

دیا جا سکتا ہے، اہل عرب نے حروف زوائد میں 'اُن' کو بھی بتایا ہے، اس صورت میں اگرچہ عجمیت کا اعتراض رفع ہو جاتا ہے، لیکن کم از کم شاعر حرف زائد کے استعمال پر مجبور ہوا ہے، جو قادر الکلامی اور زبان پر عبور کے خلاف ہے،

لا تغترر بزمانٍ کان شیمته ان غَرَّ غِرّاً بعثّ منه منتقل[1]

(زمانہ سے دھوکا نہ کھانا، اس کی ریت یہی ہے کہ ناتجربہ کار جوان کو ناپائدار عزت کے غرور میں مبتلا کر دیتا ہے)

اس شعر میں صنائع کا تو ضرور استعمال ہوا ہے لیکن دوسرے مصرعے میں جن الفاظ اور تراکیب سے مفہوم ادا کیا گیا ہے، وہ محاورۂ عرب کے خلاف ہے۔

له المکارم ابهیٰ من نجوم دجیً له العزائم امضیٰ من قنا البطل[2]

(آپ کے فضائل ظلمتوں اور تاریکیوں کے تاروں سے زیادہ روشن ہیں اور آپ کے عزائم بہادر کے نیزوں سے بھی زیادہ تیز و موثر ہیں)

عربی میں 'رمح' اور 'قناۃ' کی صفت 'ذبول' ہے اور 'ذابلہ' کی جمع 'ذوابل' رماح (نیزوں) کے لیے صفت غالبہ کے طور پر مستعمل ہے، اس لیے 'قنا' کی اضافت 'بطل' کی طرف عربی زبان کے خلاف ہے، غالباً 'بطل' کا استعمال ضرورت قافیہ کے ماتحت کیا گیا ہے۔

له الفضائل أجدیٰ من عصا کسرت له الشمائل احلیٰ من جنی العسل[3]

(آپ کی خوبیاں ٹوٹی لاٹھی سے زیادہ منفعت بخش ہیں اور آپ کے خصائل چنے ہوئے شہد سے زیادہ شیریں ہیں)

اہل عرب کی مشہور مثل "انك خیر من تفاریق العصا" ہے جو غنیہ اعرابیہ نے اپنے

---

[1] ثقافۃ الہند، جلد اول، عدد ثالث: ۵ [2] ایضاً: ۷ [3] ایضاً: ۷

بیٹے کو خطاب کرتے ہوئے اس شعر میں استعمال کی تھی ،

احلف بالمروۃ حقا والصفا　　　انك خیر من تفاریق العصا

اس مثل کا مطلب یہ ہے کہ لاٹھی سے بہت سے فائدے حاصل کیے جاتے ہیں، کمزور انسانوں کا لاٹھی کے ذریعے سہارا لینا، مویشی کے لیے درختوں سے پتے جھاڑنا اور معمولی لڑائی میں ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا وغیرہ لیکن لکڑی کو توڑ دینے کے بعد اس کے فوائد میں زیادہ اضافہ ہوجاتا ہے، اس سے میخیں اور کھونٹیاں وغیرہ بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزیں بنا کر فائدہ اٹھایا جاتا ہے، اس شعر میں شاعر نے اپنے الفاظ میں عربی مثل کا ترجمہ کرکے نہ صرف ناجائز تصرف کیا ہے بلکہ عربی اسلوب کی بھی مخالفت کی ہے، اور مدح نبوی کو بھی بھونڈا بنادیا۔

یا اعظم الناس من حاج ومعتمر　　　واکرم الخلق من حاف ومنتعل[1]

(اے سارے حاجیوں اور عمرہ کرنے والوں سے بڑے، اور تمام ننگے پاؤں پھرنے والے اور جوتہ پہننے والوں سے زیادہ بزرگ!)

"من حاج ومعتمر" میں "الحاج" کی مشدد جیم کو ضرورت شعری کی وجہ سے مخفف کردیا گیا ہے، جو ناپسندیدہ ہے، اس کے علاوہ "الناس" کو حج کرنے والوں اور عمرہ ادا کرنے والوں میں منحصر کرنا اور مخلوق کو "برہنہ پا و جوتہ پوش" میں محدود کردینا اگرچہ عقلاً درست ہے مگر عربی محاورے کے خلاف ہے۔

بعثت بالملۃ البیضاء راسخۃ　　　عفا بھا سائر الادیان والملل[2]

(آپ محکم اور واضح و روشن مذہب کے ساتھ مبعوث کیے گئے ہیں، آپ نے اس مذہب کے ذریعے تمام ادیان و مذاہب کو مٹا دیا)

---

[1] ثقافۃ الہند، جلد اول، عدد ثالث : ۸　[2] ایضاً : ۸

لغت عربی میں 'عفا' کا صلہ 'عن' اور 'لام' آتا ہے، چنانچہ "عفی عنہ" اور "عفی لہ" بولا جاتا ہے، یہاں 'عفا' کا صلہ 'ب' لایا گیا ہے، عربی زبان کے مطابق صحیح ترکیب "عفت علی سائر الادیان والملل" ہے۔ اگر صیغہ 'عفا' مونث استعمال ہوتا تو یہ جملہ ملت کی صفت قرار پاتا اور معنویت میں زیادہ حسن پیدا ہو جاتا۔

ندالک الکثر لامنتھی ابداً   لکن ادناہ اندی من ندی الوابل[1]

(آپ کی سخاوت کبھی بھی ختم نہیں ہوتی، بلکہ آپ کی ادنی بخشش بارش کی سخاوت سے کہیں زیادہ ہے)

"ندی الوابل" نہ تو محاورۂ عرب ہے اور نہ اس میں کوئی بلند پروازی ہے۔

شیخ احمد تھانیسری

ما زار طرفی غمض بعد بعدکم   ولا خیال سرور دار فی خلدی[2]

(تم لوگوں کے فراق اور جدائی کے بعد میری آنکھ نے نیند کا لطف نہیں اٹھایا، اور نہ میرے دل میں مسرت کا کوئی خیال بھٹکا)

دوسرے مصرعے میں 'خیال سرور' فارسی کا اثر ہے، عربی میں 'خیال' محبوبہ کی اس تصویر کو کہتے ہیں جو خواب میں نظر آئے۔

فیضی بن جلال کالپوی

عجیب غریب معجز اھل عالم   صنیع بدیع ما تحداہ ذوالفم[3]

(فیضی کی تفسیر "سواطع الالہام" عجیب و غریب اور اہل عالم کو عاجز بنا دینے والی ہے، تفسیر ایسی انوکھی اور نرالی ہے کہ کوئی انسان بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا)

'اہل عالم' فارسی ترکیب ہے۔ اسی طرح انسان کے لیے "ذوالفم" محاورۂ عرب کے

---

[1] ثقافۃ الہند، جلد اول، عدد ثالث: ۹ [2] ایضاً، جلد ثالث عدد اول: ۱۸ [3] سواطع الالہام ص ۴۳۸،

خلاف، اور محض قافیہ پیمائی ہے۔

لہ الجود طبع والسخاوۃ عادۃ　　　لہ الحلم شان بالجلال المکرم[۱]

(جود و سخاوت اس کی طبیعت و عادت ہیں، اس کے حلم کی ایسی شان ہے کہ اس میں قابل احترام جلال بھی ہے)

'الجلال المکرم' عربی ترکیب نہیں ہے،

شیخ یعقوب صرفی

یا من بفیض کامل خصصت من　　　علمتہ مالم یکن ھو یعلم[۲]

(اے وہ ذات جس نے کامل فیض سے اس ہستی کو مخصوص کیا جسے نامعلوم اشیا کی تعلیم دی ہے)

'فیض کامل' کی ترکیب بھی فارسی ہے اور اس کا مفہوم بھی فارسی ہے۔

فیضی

لاح دار الحمل، دحال الحول　　　دار کاس المدام راس العام[۳]

(برج حمل چمکتا تھا اور ایک سال ختم ہوگیا اور سال کی ابتدا پر جام مے گردش میں آگیا۔)

'دار' اور 'کاس' مونث سماعی ہیں، اس لیے ان فاعلوں کے فعل عربی قواعد کے مطابق 'لاحت' اور 'دارت' ہونا چاہئیں، فیضی نے صرف صنعت مہملہ کی وجہ سے اس غلطی کا ارتکاب کیا ہے، 'حال الحول' کے 'لام' کو بھی فارسی اثر کے تحت ساکن کیا گیا ہے، جب کہ عربی زبان میں دو ساکن حرف متصل نہیں ہوا کرتے۔

خواجہ حبیب اللہ نوشہری

مذھب لعشق مذھب واحد　　　اذھب علیہ یا زاھد[۴]

---

[۱] سواطع الالہام: ۳۸، [۲] ایضاً: ۳۹، [۳] موارد الکلم: ۸، [۴] الانصاف فی بیان طرق النجاۃ (قلمی): ۹

(عشق کا راستہ صرف ایک ہے، زاہد! اُس راستے پر چلا چل)

یہ مصنف کی مثنوی کا شعر ہے، پوری مثنوی کا اسلوب، تعبیر، وزن اور ترکیبیں وغیرہ سب فارسی ہیں، صرف خیالات کو عربی الفاظ کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔

غلام نقشبند لکھنوی

اربع الحبیبۃ صار للوحش موطنا   فیا عجبا من صنع دار محوّل [1]

(محبوبہ کی منزل وحشی جانوروں کا مسکن بن چکی ہے، سامعین! جائے تعجب ہے کہ مکان ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف کس طرح منتقل ہو گیا ہے)

پہلے مصرعے میں 'الحبیبۃ' سے وزن میں انکسار پیدا ہوتا ہے، اگر 'الحبیب' پڑھا جائے تو وزن درست ہو جائے گا، مگر وہ سیاق و سباق کے مناسب نہیں ہے، دوسرے مصرعے میں نحوی قوانین کے خلاف 'دار' کی صفت 'محول' مذکر لائی گئی ہے، اگر صفت کو مونث قرار دیا جائے تو قصیدے کا وزن اور یکسانیتِ قافیہ دونوں فوت ہو جاتے ہیں۔

لھا عارض تبریقہ غیر عارض   اسیل صقیل حسنہ کالسجنجل [2]

(محبوبہ کے رخسار کی چمک عارضی نہیں ہے، نیز اس کا رخسار نرم و نازک ہے اور اس کا حسن آئینے کے مانند چمکدار ہے)

اس شعر کا پہلا مصرعہ محتاج تشریح ہے، نیز 'عارض' کی صفت 'اسیل' مصرعۂ دوم میں واقع ہے، اس لیے صفت و موصوف کے درمیان فاصلہ ہو جانے کے باعث تعقید لفظی کا عیب پیدا ہو گیا ہے، پھر 'صقیل' کا فاعل 'حسنہ' ہے، اور اس ترکیب کے ماتحت یہ معنی ہو گئے کہ محبوبہ کے رخسار کی خوبصورتی آئینے کی طرح پالش کی ہوئی ہے، حالانکہ پہلے مصرعہ میں صراحت ہو کہ

---

[1] نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر ۶: ۲۱۳ [2] ایضاً ۶: ۲۱۴

محبوب کا حسن ذاتی ہے، اور دوسرے مصرعے سے واضح ہوتا ہے کہ تصنع کو بھی دخل ہے، علاوہ ازیں حسن بضاعۃ کا یہ انداز بیان بھی عربی نہیں،

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

هنالك رسول اللّٰه ينجو لربه شفيعاً وفتاحاً لباب المواهب[1]

(اس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب سے مناجات کر رہے ہیں، دراں حالے کہ وہ خود شفیع اور بخششوں کا دروازہ کھولنے والے ہیں)

مصرعہ اول میں 'ینجو' کا صلہ 'ل' لغت عرب کے خلاف ہے، البتہ یہ توجیہ ممکن ہے کہ تصحیف کی وجہ سے 'یدعو' کی جگہ 'ینجو' تحریر ہو گیا۔

وعندی علوم لا یکاد یحیطها سماء ولا بر و بحر و ساحل[2]

(میرے پاس علوم و فنون کا اتنا عظیم خزانہ ہے کہ ارض و سما اور سمندر و ساحل ان کا احاطہ نہیں کر سکتے)

'یحیط' کے بعد 'ب' صلہ نہ لانا محاورۂ عرب کے خلاف ہے، کیونکہ اس فعل کا مفعول براہ راست نہیں آتا۔ کلام مجید میں بھی "ولا یحیطون بشیء" ہے۔

میر عبد الجلیل بلگرامی

حبيبي قوس حاجبه كنون وصاد يد ابن مقلة شكل عينه[3]

(میرے محبوب کے ابرو کی کمان حرف 'ن' کی طرح ہے اور مشہور خوشنویس ابن مقلہ کا تحریر کردہ حرف 'ص' اس کی آنکھ کی شکل ہے)

لعمری انه نص جلی على ان الرماية حق عينه

(اپنی زندگی کی قسم! معشوق اس امر کی نص صریح ہے کہ تیر اندازی اسی کی چشم کا حق ہے)

---

[1] اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم: ۹ [2] دیوان شاہ ولی اللہ (قلمی): ۱،۲ [3] سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان: ۸۱

حبیبی ثغرہ کالسین شکلا   وکالمیم المدور شکل فیہ

(میرے معشوق کے دانت اپنی ترتیب وصفائی میں حرف 'س' کے دندانوں کے مانند ہیں

اور اس کے دہن کی شکل ٹھیک ٹھیک گول 'م' کی طرح ہے)

هما سم ویا عجباً حیاتی   اذا ما ذقتہ. لاشك فیہ

(معشوق کے دانت اور دہن دونوں زہر ہیں جس میں ذرا شک کی گنجائش نہیں،

بس مجھے تعجب ہے کہ اسے دیکھ کر میں زندہ کیسے رہا؟)

مذکورۂ بالا اشعار کا انداز فکر عربی نہیں ہے، ان کو پڑھنے سے خیال ہوتا ہے کہ یہ اشعار کسی ماہر فن خطاط یا فقیہ کے ہیں،

آزاد بلگرامی

اضفیرتان علی بیاض خدودها   اوفی کتاب الحسن سلسلتان [1]

(آیا محبوبہ کے سفید رخساروں پر دو گیسو ہیں یا کتاب حسن میں دو سلسلے (مسلسل روایتیں) ہیں)

کتاب حسن خالص فارسی ترکیب ہے، عربی میں اس کا وجود نہیں،

ابصر حواجبها وادرك کنهها   غصنان منحنیان وسط البان [2]

(محبوبہ کے ابروؤں کو دیکھو اور ان کی حقیقت سمجھو، بید کے (ملائم، لچکدار اور چھریرے تنے کے) درمیان میں دو پتلی پتلی ٹہنیاں سی نظر آتی ہیں)

پہلے مصرعے میں 'حاجب' کی جمع 'حواجب' استعمال کیا گیا ہے، حالانکہ تثنیہ ہونا چاہئے، پھر دوسرے مصرعے میں ابروؤں کو 'غصنان' بصیغۂ تثنیہ استعمال کیا گیا ہے جو صحیح ہے، مگر اس سے ایک ہی شعر کے دو مصرعوں میں یکسانیت مفقود ہو گئی۔

---

[1] نشوۃ السکران من صہباء تذکار الغزلان: ۹۷ [2] ایضاً: ۹۸

اوکا فرات یشاوردان لبرقعا ۔۔۔ آمالنا فی موقع الحرمان[1]

(یا وہ کافر ہیں جنھوں نے باہم مشورہ کیا ہے کہ وہ ہماری تمام آرزوؤں کو خاک میں ملا دیں گے)

ابروؤں کو کافروں سے تشبیہ دینا اور ان دونوں کا امیدوں پر پانی پھیرنے کے لیے باہم مشورہ کرنا عجمی انداز فکر ہے۔

طال التجنب فاسمحی بنظیرۃ ۔۔۔ وعلیك واجبۃ زکوۃ جمال[2]

(بے رخی اور بے التفاتی تو بہت ہو چکی، اب ذرا نظر کرم کیجئے، آپ پر تو حسن وجمال کی زکوٰۃ بھی واجب ہے)

اس شعر میں فارسی زبان کے مفہوم کو عربی نظم کے سانچے میں ڈھالا گیا ہے۔

فن الصبابۃ ما ادق بیانہ ۔۔۔ تحیر فیہ الامام الرازی[3]

(عشق کے فن کا بیان کس قدر دقیق ہے کہ امام رازی بھی اس میں حیران وششدر رہیں)

اہل عرب عشق کے لیے لفظ 'فن' نہیں بولتے۔ فارسی اثر کے ماتحت 'فن' استعمال کیا گیا ہے۔

باقر آگاہ

یامن خیال خدودھا فی مھجتی ۔۔۔ حرالجحیم وفی عیونی الماء[4]

(اے محبوبہ، تیرے رخساروں کے تصور سے میرے دل میں جہنم کی گرمی بھر گئی ہے اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں)

---

[1] نشوۃ السکران : ۹۸ [2] حدیقۃ الافراح لازاحۃ الاتراح : ۳۴۴ [3] ایضاً : ۳۴۲ [4] النفحۃ العنبریۃ فی مدح خیر البریۃ (قلمی) : ۴۵

شیخ احمد تھانیسری کی طرح باقر آگاہ نے بھی 'خیال' کو فارسی معنی کے مطابق استعمال کیا ہے،

وسریت نحوی کالنسیم تلطفاً　　　　فهتفت من طرب: أفاح ذکاء[1]

(اے محبوب! تو جو میری طرف از راہ لطف وکرم بادِ نسیم کی مانند چل کر آئی تو میں نے فرطِ شوق سے بآوازِ بلند کہا: کیا آفتاب طلوع ہوا؟)

'ذکاء' عربی زبان میں مؤنث ہے، اس لیے 'فاح ذکاء' کی جگہ 'فاحت ذکاء' ہونا چاہیے مگر اس سے عروض کے قواعد کی خلاف ورزی ہوتی، اس کے علاوہ "فاح، یفوح، فوحاً" کے معنی خوشبو دینا ہے، اور آفتاب وخوشبو میں دور کی بھی مناسبت نہیں ہے، محبوب کو چمک دمک اور آب وتاب کے لحاظ سے ہی آفتاب سے تشبیہ دی جاتی ہے، اس لیے 'فاح' کا استعمال غلط طور پر کیا گیا ہے۔

هو روح کل الکائنات فکیف لا　　　　یصبوالیٰ امداده الاشیاء[2]

(محمدؐ ہی ساری کائناتِ عالم کی روحِ رواں ہیں، اس لیے کائنات کی تمام اشیاء کا آپ کی امداد واعانت کی طرف مائل نہ ہونا کس طرح ممکن ہے؟)

یہاں فارسی کے زیر اثر 'کائنات' کو استعمال کیا گیا ہے، عربی میں اس مفہوم کو 'عالم' اور 'عالمین' سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسی طرح 'امداد' کو بھی نصرت واعانت کے معنی میں استعمال کرنا فارسی کا اثر ہے، عربی میں امداد کے معنی دراز کرنا ہیں،[3]

لقد قامت الرسل فی بابه　　　　یرومون من فیضه منصباً[4]

---

[1] النفحۃ العنبریہ فی مدح خیر البریہ (قلمی): ۲۵ [2] ایضاً: ۴۶ [3] معارف: یہ اعتراض صحیح نہیں ہے، خود کلام مجید میں امداد نصرت کے معنی میں آیا ہے: "الن یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلثة آلاف من الملٰئکة"

[4] النفحۃ العنبریہ: ۶۲

(تمام انبیاء و رسل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانے پر حاضر ہیں، اور سب ہی آپ کے فیض سے منصب کے خواہاں ہیں)۔

مصرعۂ دوم میں 'فیض' اور 'منصب' عربی لفظوں کو فارسی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔[1]

یلوح فی فرعها قلبی الاسیر کما ۔۔۔ یبدو الحباحب بین السنبل النجم

(میرا اسیر دل معشوقہ کی چوٹی میں اس طرح چمکتا ہے جیسا کہ سرسبز خوشۂ گندم میں جگنو)

پہلے مصرعے میں فارسی خیال کو عربی الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔

وزیر علی سندیلوی

القیت علی انواع البلاء ۔۔۔ اذا القیت نفسی فی الھواء[2]

(جب میں نے اپنے دل میں عشق کو جگہ دی تو انواع و اقسام کے مصائب سے دوچار ہونا پڑا)

اس شعر میں 'الھواء' کے ہمزہ مقصورہ کو ممدودہ بنا دیا گیا ہے، اہل عرب 'الھویٰ' ہمزہ مقصورہ کے ساتھ بولتے ہیں۔

قاضی عمر بلنکوتی

جفتنی، فذبتنی، فغلظت بغیلة ۔۔۔ فذ یت بشجن بین جنبی یشفق[3]

(محبوبہ بدسلوکی کے ساتھ مجھ سے پیش آئی، اور مجھے دھکے دیے، پھر سخت غیظ و غضب کا اظہار کیا، بعد ازاں ایسا غم و اندوہ دیکر نکالدیا، جو میرے پہلوؤں کے درمیان کسک پیدا کرتا رہتا ہے)

عربی میں جھنڈوں اور ستاروں وغیرہ کے اضطراب کے لیے 'خفق' استعمال ہوتا ہے 'شجن' کی صفت عربی محاورے کے مطابق نہیں ہے۔

---

[1] دیوان غزلیات آگاہ (مخطوطہ) [2] دیوان وزیر علی سندیلوی (قلمی) [3] جواہر الاسفار فی غرائب الحکایات والاخبار: ۲۸۲

آثار تاریخیہ

مکاتیب شبلیؒ

بنام

مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی

مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم نے اپنے نام مولانا شبلی کے وہ خطوط جو ندوہ کے اختلافات سے متعلق تھے، مکاتیب شبلی میں اشاعت کے لیے نہیں دیے تھے اس لیے وہ اس میں شامل نہیں ہو سکے، اس کی نقل ان کے پوتے ڈاکٹر ریاض الرحمن خاں شروانی نے عرصہ ہوا ہمارے پاس بھیجی تھی، ان میں بہت سے خطوط ایسے ہیں جن میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جن کی اشاعت نامناسب ہو، مولانا شروانی نے محض اپنی محتاط طبیعت کی بنا پر ان کو روک لیا تھا، مولانا شبلی کے قلم کی ایک ایک سطر تبرک کی حیثیت رکھتی ہے، اور ان خطوط سے ندوہ سے ان کی شیفتگی کا پتہ چلتا ہے، اور اس دور کے بعض واقعات پر روشنی پڑتی ہے، اس لیے ان تاریخی خطوط کو شائع کر دینا مناسب معلوم ہوا۔ "م"

(۱)

مکرمی!

آج کی ڈاک میں آپ کے خط کے ساتھ ناظم صاحب کا بھی خط آیا، اسکے الفاظ یہ ہیں:

"جلسۂ انتظامیہ میں آپ کی اڈیٹری اور مولوی حبیب الرحمن صاحب کی اڈیٹری اور مولوی سید عبد الحیٔ صاحب کی منتی طے ہوگئی، چنانچہ اول منشی صاحب ہی سے رائے لی گئی، ان کو بجز اقبال کے کوئی چارہ نہ تھا، عہد کو باتفاق پاس ہوا، اب فقط سرکار سے اجازت طلب کرنا چاہیے، میرے نزدیک جلسے سے قبل اشتہارات شائع ہو جائیں اور جلسہ میں رسالہ تیار ہو کر موجود رہے تو اور بھی بہتر ہوگا، ورنہ اشتہار تو ضرور اس وقت تک طبع ہو جائیں۔"

اب فوراً ٹائٹل پیج بھیجئے اور مولوی عبد الحیٔ صاحب کو لکھئے، گورنمنٹ میں درخواست دیدیں۔

کیا اشتہار بھی بغیر وصولی حکم اجازت نہیں چھاپا جا سکتا۔ پہلے پرچہ میں آپ کا کوئی مضمون بھی ضروری ہے، ورنہ ایک دو پرچہ کے لیے تو خود میرے مضامین ہی موجود ہیں، جلدی فرمائیں۔

شبلی ۔ ۱۵ر نومبر ۱۹۰۳ء

(۲)

مکرمی!

براہ کرم مولانا خلیل الرحمن صاحب کو راضی کر دیجئے کہ مولوی فضل حق مدرس مدرسۂ عالیہ رامپور کی پرنسپلی پر راضی ہو جائیں، ٹونکی صاحب کو مفصل اور نہایت عاجزانہ خط لکھے گئے، جواب ندارد، مولوی فضل حق صاحب، مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پروفیسر رہ چکے ہیں، شاہ سلیمان صاحب، مولوی عبد الحیٔ صاحب ان کے معترف اور اس عہدہ کے لیے ان کو موزوں تر سمجھتے ہیں، صرف منشی احتشام علی اور مولوی خلیل الرحمن صاحب، مولوی

حفیظ اللہ صاحب کو دوبارہ بلانے کے . . . . . مخالف ہیں، پورے پچ بیٹھے ہوئے کہ عہدہ خالی اور تمام پڑھائی غارت ہے، اب فرمائیں میں کیا کروں، آپ بطور خود لکھئے اور اس مرحلہ کو سر کیجئے، پرنسپل لائق آ جاتا تو میں اور کاموں کی طرف متوجہ ہوتا،

شبلی - ۳۰ر اپریل ۱۹۱۰ء

(۳)

جناب من! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کو معلوم ہوگا کہ ارکان انتظامیہ ندوہ کی میعاد ممبری ختم ہوگئی، اور ۸۰ ارکان کے انتخاب کی ضرورت ہے، میرا خیال ہے کہ آپ نے ابتک لوگوں کے نام انتخاب کرکے دفتر میں نہیں بھیجے ہیں، اس لیے امور ذیل گذارش ہیں:-

(۱) آپ ۸۰ آدمیوں کے نام پیش کر سکتے ہیں،

(۲) فہرست ارکان سابق مرسلہ مولوی عبد الحئی صاحب آپ کے پاس موجود ہوگی، اس کو پیش نظر رکھکر، جو بزرگ قابل انتخاب ہوں، ان کے نام انتخاب کیجئے، یہ انتخاب یا ان بزرگوں کی قابلیت علمی اور وجاہت دنیوی کے لحاظ سے ہو، یا اس لحاظ سے ہو کہ اُن لوگوں نے زمانہ ممبری میں عمدہ کارگزاری اور ہمدردی کا اظہار کیا،

(۳) جدید ارکان انتخاب کیجئے، یعنی ہر صوبہ کے مشاہیر اور ذی اثر اشخاص کو لیجئے، مثلاً مدراس میں مولانا عبد السبحان، نواب غلام احمد خاں، ممبئی میں قاضی کبیر الدین، مولوی رفیع الدین بیرسٹر، حاجی یوسف قعبانی، کلکتہ میں مولوی شمس الہدیٰ، مولوی یوسف، پنجاب میں مسٹر محمد شفیع، شیخ غلام صادق، بابو نظام الدین، ممالک متحدہ میں بہت سے لوگ ہیں، جنکو آپ خود جانتے ہیں،

(۴) آپ خود اپنا نام بھی پیش کر سکتے ہیں،

(۵) مدت نامزدگی کم رہ گئی ہے، اس لیے فوراً دفتر میں منتخب اشخاص کے نام بھیج دینے چاہئیں،

(۶) دستور العمل کی رو سے انتخاب ارکان کا جو جلسہ ہوگا، اس میں صرف زبانی ووٹ (رائے) لیجائے گی، تحریری ووٹ کافی نہیں، اس لیے جب جلسہ کی تاریخ کی اطلاع دیجائے، تو جلسہ میں آپ کو خود تکلیف فرمانا چاہیے، یا بصورت مجبوری وہاں کے کسی معزز صاحب کو بھیجنا چاہیے،

(۷) انتخاب ارکان کے لیے ووٹ دینا ارکان انتظامی پر محدود نہیں، بلکہ ہر ممتاز شخص ووٹ دے سکتا ہے، صرف یہ شرط ہے کہ عہ بھیجکر ندوہ کا ممبر بنجائے اور موقعۂ انتخاب پر موجود ہو،

شبلی۔ ۱۰ر جنوری ۱۹۱۱ء

علما میں حضرات ذیل قابل انتخاب ہیں:

مولانا لطف اللہ مفتی عدالت العالیہ حیدرآباد دکن، مولانا عبد الجبار غزنوی، مولوی عبد اللہ غازیپوری، مولوی ثناء اللہ امرتسری، ابوبکر شہاب عرب حیدرآباد، مولوی حمید الدین پروفیسر عربی یونیورسٹی الہ آباد۔

(۴)

مکرمی!

وہ کارڈ سرسری تھا، آپ غور اور سنجیدگی کے ساتھ سنیے کہ کام کیونکر چل سکتا ہے، ایک ایک امر کو لیجئے۔

عمارت (۱) عمارت کا کام یوں شروع ہو سکتا ہے کہ تعمیر اور جدا گانہ کمروں کیلئے جو روپے آئے تھے، جن کی تعداد دس ہزار سے زائد ہے، پہلے ان سے کام شروع کیا جائے

اور دوسرے لوگوں کو ترغیب دیجائے، آٹھ سات ہزار کے مستحکم وعدے ہیں، وہ فوراً مل سکتے ہیں، اگر ان کو یقین ہو کہ کام شروع ہو رہا ہے، لیکن یہ اس پر موقوف ہے کہ جمع شدہ رقم کا پہلے ٹھکانا لگے، میں نے چند دفعہ کہا کوئی جواب نہیں ملا، تعمیرات کا کوئی بجٹ نہ شائع ہوا نہ جلسہ میں کبھی پیش ہوا، کچھ معلوم نہیں کہ وہ رقمیں موجودہ تعمیر میں صرف ہوگئیں یا جمع ہیں، اور جمع ہیں تو ان سے کام کیوں نہیں شروع ہوتا، ان حالات کے سوا کیا میں لوگوں سے چندہ مانگ سکتا ہوں، اور کیا موعودہ رقمیں مل سکتی ہیں،

(۲) دو دفعہ جلسۂ انتظامیہ مدرسہ وغیرہ میں یہ طے ہو چکا کہ موجودہ عمارت فروخت کر دیجائے، میں نے خریدار ٹھہرایا اور بہت زیادہ قیمت پر، لیکن منشی صاحب نے انکار کیا کہ مجلس انتظامیہ کو بھی جائداد کے فروخت کرنے کا اختیار ہی نہیں،

تین چار مراسلات کے بعد میں چپ ہوگیا، وہ رقم ملتی تو موجودہ عمارت پوری ہو جاتی اور طلبہ کی بھی بقدر حالت گنجائش نکل آتی،

(۳) راجہ جہانگیر آباد کو ہر طرح منہ جوڑ کر کہہ چکے، ان سے کچھ ملنے والا نہیں محمود آباد سے قوی امید ہے لیکن ان کو کوئی عہدہ دیا جائے، دستور العمل میں سرپرست ہر شخص ہو سکتا ہے لیکن مولوی خلیل الرحمن صاحب نے انکار کیا کہ وہ شیعہ ہیں......(دونوں کو بنا سکتے ہیں لیکن یہ بھی منظور نہیں، راجہ صاحب محمود آباد بورڈنگ کا یا بڑا حصہ بنوا دیتے،

اب جب ہر طرف سے ہاتھ پاؤں باندھ دیے جائیں تو یہ اعجاز صرف آپ کر سکتے ہیں کہ کام ہی کریں، باقی یہ کہ عام چندہ کھولو، تو کہنا آسان ہے لیکن کامیابی کرنا آسان نہیں،

تعلیم کا بھی یہی حال ہے لیکن کون اس داستان کو سنائے۔

شبلی - ۱۴ مئی ۱۹۱۱ء

(۵)

مکرمی! تسلیم

خط اور ترجمہ پہنچا، اس میں تو کہیں کہیں چوٹیں ہیں، ارگیولس کا تو ایک حرف بھی خالی نہیں،

ندوہ کا معاملہ اس قدر مشکل نہیں جتنا آپ کے خیال میں ہے، آپ اپنی آمادگی تو ہمیشہ ظاہر کرتے ہیں، لیکن آپ کو کبھی یاد ہے کہ آپ ایک ہفتہ ٹھہرے، آپ ہر دفعہ کی مجموعی تعداد کو ملا کر دیکھتے ہیں، اور میں ایک دفعہ چاہتا ہوں، تہ کی بات تو صرف اس قدر ہے کہ ایک صرف مولوی خلیل الرحمٰن صاحب بیچ میں نہ ہوں تو کچھ دشواری نہیں، منشی احتشام علی دو فقرے میں رام ہوتے ہیں، آخر میرا بھی تو ان سے سابقہ رہا، خیر ضابطہ کی یہ بات ہے کہ صرف دو تین امور ہیں،

(۱) پرنسپل کو وہ اختیار کامل دیدیے جائیں جو عموماً پرنسپل اور ہیڈ ماسٹر کو ہوتے ہیں، اب تو یہ حالت ہے کہ وہ ایک آنہ کا جرمانہ تک نہیں کر سکتے یا کسی مدرس کے متعلق کوئی حکم ان کا نافذ نہیں،

(۲) انگریزی اسٹاف کی حالت نہایت خراب ہے، ہیڈ ماسٹر بہرے اور سخت کاہل ہیں، لیکن چونکہ دوسری پارٹی ان کی حمایت میں ہے، وہ کچھ نہیں سنتے، تین دفعہ تین شخصوں نے ان کے کلاسوں کا معائنہ کیا، یعنی مولوی ظہور احمد وکیل، مولوی عزیز، ڈاکٹر ناظر الدین حسن، تینوں نے سخت شکایت کی پہلی دو شخصیتوں کی تحریری رپورٹ

موجود ہے، مجلس دار العلوم میں یہ مسئلہ پیش ہوا، اور ان کے ایما سے دونوں رپورٹیں ہیڈ ماسٹر کے پاس بھیجی گئیں، تین مہینے ہوئے جواب ندارد،

اس کا انتظام ہونا چاہیے، ورنہ جو کچھ انگریزی پر خرچ ہو رہا ہے، سب بیکار جاتا ہے، اور ایک دن ایڈ بند ہو جائے گی،

(۳) باقی میرا اور معتمد مال کا معاملہ ہے، وہ صرف اس قدر ہے کہ دونوں کے اختیارات کی تعیین ہو جائے، وہ ہر مہینہ میں جس کی تنخواہ یا وظیفہ چاہتے ہیں روک دیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ علاوہ اور نقصانات کے، مدرسین پر ڈسپلن قائم نہیں رہا، اور دو گروہ ہو گئے،

یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ کچھ آشتی اور کچھ، پابندی قاعدہ طے ہو جائیں گی، آپ اور مولوی عبد الحیٔ صاحب اور ڈاکٹر ناظر الدین حسن صاحب قدوائی، تین شخص حکم بن جایئے، سب باتیں سنیے، کچھ فیصلہ کر کے دونوں فریق کو سنائیں، دونوں کے عذرات سنیے، غور تو کیجئے، ہزاروں لاکھوں روپے کی بربادی، کام کی ابتری، عام بدنامی، ترقی کی روک، ان سب کاموں کی قیمت آپ کا ایک ہفتہ بھی نہیں ہے، کام کرنے سے ہوتا ہے نہ ہمت ہارنے سے۔

شبلی۔ ۱۲ر ستمبر ۱۹۱۲ء
بمبئی

(۹)

مکرمی! تسلیم

ترکی کے واقعات نے تو اس قدر دل بجھا دیا ہے کہ کسی کام کو جی نہیں چاہتا،

تاہم آخر جینا مرنا، کھانا پینا تو نہیں چھوٹ سکتا، ندوہ کا ایک مقصد ہے جس کو گوش گذار کرنا ہو
آپ کا اور ہم سب لوگوں کا ندوہ سے ایک معمولی مدرسہ مقصود نہ تھا، مگر خانہ جنگیوں
نے وہ سب منصوبے غلط کر دیے۔

میرے سامنے جو خاکہ ہے اس کو بہ تفصیل آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں کہ معقول
مشورہ اور تدبیر قائم ہو سکیں، اس کے لیے یا تو کانفرنس سے ۵ دن پہلے یہاں آئیے، میں نے
اپنے کمرہ کے برابر کا کمرہ بھی لے لیا ہے، نہایت آرام اور سکون سے آپ رہ سکیں گے۔
جو خاکہ ہے اس کی کامیابی اس پر موقوف ہے کہ تمام ہندوستان کو ندوہ میں عملاً شریک
کیا جائے، اس کے لیے ضرورت ہے:

(۱) ارکان کے دائرہ کی وسعت، اس کے ساتھ شعبۂ دینی وغیرہ کی قید سے سبکدوشی
جیسا کہ ندوہ کے پچھلے سالوں میں تھی۔

(۲) تعلیم کے مختلف شعبے قائم کرنے، جیسا کہ آپ نے وقار الملک کی مجوزہ نیشنل یونیورسٹی
کے پروگرام میں دیکھا ہوگا، یعنی جس کی بدولت وہ امراء و تجار بھی مذہبی اور دنیوی علوم
پاسکیں، جو یونیورسٹی کے امتحانات کے شایق نہیں۔

(۳) اشاعت اسلام کا عملی کام۔

اس بات سے آپ مطمئن رہیں کہ کوئی چیز عسیر الحصول نہیں، اور نہ میری کوشش کی
دستگاہ سے باہر ہے، آپ سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ اچھا خاکہ مرتب ہو جائے اور نیز یہ کہ
دو صاحب خلل انداز نہ ہوں، اصل مصیبت یہی ہے۔

آپ نہ آسکیں تو میں آؤں، ۲۰ کو ہز آنر نے ملنے کا وقت مقرر کیا ہے، ورنہ میں ابھی
سے آجاتا، بہر حال تسلی بخش جواب دیجئے۔

شبلی - ۹ دسمبر ۱۹۱۲ء

(۷)

مکرمی!

اگرچہ تین چار دن کی متصل محنت اور ہنگامہ کے بعد دماغ تھک چکا ہوگا، تاہم خیر آپ آئیں تو سہی اور دو چار دن قیام کریں، لیکن جو امور فیصلہ کن ہیں ان کے صرف اتفاق رائے سے کچھ فائدہ نہیں، بلکہ استواری اور پامردی کی ضرورت ہے، امور فیصلہ کن یہ ہیں:

(۱) عمارت کی تکمیل، اس میں تمام تر دقت یہ ہے کہ سکریٹری تعمیرات کا دفتر ایسا ہے کہ نہ کوئی حساب شائع ہوتا ہے، نہ کچھ پتہ لگتا ہے، نہ پوچھنے سے جواب ملتا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ مقامی اشخاص اپنا چندہ ادا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے، اور سلسلہ بہ سلسلہ باہر تک یہ اثر جاتا ہے، ماسٹر شاہد حسین نے ڈائرکٹر سے کہا کہ گورنمنٹ نے مدد دی ہے، انھوں نے اسٹمنٹ اور حساب مانگا، معتمد صاحب تعمیرات نے جو جواب لکھا ہے اور میرے پاس آیا ہے، اس کو دیکھئے گا، انکار اور پہلو تہی ہے، فروخت مکانات کا معاملہ بھی اسی میں ہے۔

(۲) آیندہ۔۔۔۔ کام مجلس تعمیرات کا آج تک کوئی اجلاس نہیں ہوا، نہ کبھی ہوگا۔

(۳) ندوہ کی طرف عام ملک کا رجحان اس پر موقوف ہے کہ ہر حصہ کے لوگ ممبر بنائے جائیں، یہ اس لیے نہیں ہوتا کہ پرائیویٹ کوششوں سے ممبری انہی پچھلے اشخاص میں محدود رکھی جاتی ہے۔

(۴) غرض تمام اسکیم میں مقدم یہ ہے کہ کچھ پامردی اور استقلال دکھایئے، صرف ایک ہفتہ کافی ہوگا، پھر برسوں کے لیے کام چل پڑے گا۔

شبلی - ۲۱ دسمبر ۱۹۱۲ء

(۸)

مکرمی!

ابھی آپ کے نام ایک خط لکھ چکا تھا، کہ آپ کا خط ملا، افسوس ہے کہ آپ اس حیثیت سے

کام کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں کہ اصل کارکن کوئی اور ہے اور آپ صرف مامور ہیں، یہی چیز ہے جس نے آج تک ندوہ کو عضو معطل رکھا ہے،

اجازت اس میں لیجاتی ہے جو ناطے شدہ مسئلہ ہو، رسالہ کا نکلنا، روپیہ کی منظوری، آپ کی اڈیٹری یہ سب طے شدہ اجلاس سابق ہے، دوبارہ اجازت نہیں لیجاتی، البتہ میرا اڈیٹر ہونا طے شدہ نہیں ہے، اس کو جانے دیجئے، یوں ہی سہی، آپ کو خود ہی اختیار ہے کہ کسی اور کو شریک اڈیٹری کرلیں، اس کے لیے عام اجازت مانگیے تو سب دیدینگے، ہاں خاص میرا نام لیجئے گا تو روڑے اٹکائینگے، اچھا تو کیا اس غلامی سے ندوہ کا کام چلے گا۔

مکرمی! اب مداہنت اور جھوٹی رعایت کا وقت نہیں ہے، انگریزی تعلیم چھائی جاتی ہے، اس دفعہ یہاں یہ تجربہ ہوا کہ کانفرنس کے آگے لوگ ندوہ کا نام لینے والوں کو دشمن سمجھنے لگے، حیدرآباد میں کالج کی ایک بڑی پارٹی ہے، ان لوگوں کا منشا یہ تھا کہ دونوں کے ڈپوٹیشن کی موجودگی میں میں ندوہ سے بالکل الگ رہوں، دو عام جلسوں میں مجھے اس مسئلے پر بولنا پڑا، لوگ ناراض بھی ہوئے اور میری مقبولیت میں فرق آیا، لیکن بیدریغ اور بے جھجک سچ کہا گیا، میں نے صاف کہدیا کہ کالج اگر یہ دعوی کرتا ہے کہ وہ ہماری مذہبی ضرورتوں کو بھی پورا کردیگا تو محض جھوٹ ہے، سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کے سامنے یہ الفاظ کہے گئے، ندوہ کی بیکاری جس قدر ثابت ہوتی جاتی ہے، اسی قدر مخالفوں کو صریح شہادت ہاتھ آتی جاتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ندوہ قوتوں کو پراگندہ کرتا ہے، اس لیے صرف ایک کالج کو مرکز بنانا چاہیے،

ایسی حالت میں آپ ایسے کمزوروں سے کام لیتے ہیں اور ایسا پست ہات آپ کا اٹھتا ہے؟! نصاب کی متفق علیہ کتب کو فوراً جاری کردیجئے، مختلف فیہ کو رہنے دیجئے، تو کچھ حرج نہیں، رسالہ بالکل اختیاری ہے، اس میں بھی دفتر کا منہ دیکھنا کیا معنی، آپ اگر گرتے پڑتے ہیں تو کون ثابت قدم رہے گا۔

شبلی - ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۳ء

باب التقریظ والانتقاد

"تاریخ بنگالۂ مہابت جنگی"

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

مذکورۂ بالا تاریخ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے شائع ہوئی ہے، اس سے پہلے اس سوسائٹی نے بہت سی فارسی اور عربی کتابیں شائع کرکے بڑی مفید خدمات انجام دی ہیں، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی بہت سی فارسی تاریخیں اس سوسائٹی کی وجہ سے اہل علم کے ہاتھوں تک پہنچیں، جن میں تاریخ بیہقی، طبقاتِ ناصری، تاریخ فیروز شاہی (برنی) تاریخ فیروز شاہی (عفیف)، ظفرنامہ، تاریخ مبارک شاہی، اکبرنامہ، طبقات اکبری، منتخب التواریخ، مآثر رحیمی، شاہجہاں نامہ، عالمگیر نامہ، مآثر عالمگیری، منتخب اللباب مآثر الامراء، اور ریاض السلاطین وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، ان میں سے بعض کتابوں کے انگریزی ترجمے بھی مفید حواشی کے ساتھ شائع ہوئے، دو چار کو چھوڑکر یہ کتابیں ایشیاٹک سوسائٹی میں بھی نہیں رہ گئی ہیں، ان کے نہ ملنے کی وجہ سے ان مطبوعات کی حیثیت مخطوطات کی ہوگئی ہے، اور جہاں ہیں وہاں انکے اوراق ایسے بوسیدہ اور خستہ ہوگئے ہیں کہ ان کا الٹنا بھی مشکل ہوگیا ہے، یہ ایشیاٹک سوسائٹی ہی کی ملکیت ہیں، اگر اسکی طرف سے ان کا نیا اڈیشن شائع ہو، تو یہ نئی کتابوں کی اشاعت سے کم مفید علمی خدمت نہ ہوگی، امید کہ سوسائٹی کے ارکان اس کی طرف توجہ کریں گے۔

"تاریخ بنگالۂ مہابت جنگی" مصنفہ یوسف علی خاں کو ڈاکٹر عبد السبحان استاد زبان و

وادبیاتِ فارسی، مولانا آزاد کالج کلکتہ نے ایڈٹ کیا ہے، اور وہ اس کا انگریزی ترجمہ بھی غالباً کرچکے ہیں، اس محنت کے صلہ میں ان کو کلکتہ یونیورسٹی سے ڈی۔فل کی ڈگری بھی ملی ہے، انھوں نے اس پر انگریزی میں ۴۰ صفحے کی ایک تمہید لکھی ہے، جس میں اس کتاب کی اہمیت دکھائی گئی ہے، شروع میں کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر اے، جے، آربری کا ایک مختصر پیش لفظ بھی ہے،

اس کتاب میں بنگال کے نواب مہابت جنگ علی وردی خاں (۱۷۵۶-۱۷۴۰) اور نواب سراج الدولہ (المتوفی ۱۷۵۷ء) کے تاریخی حالات ہیں، اس کی اہمیت اسلیے ہے کہ اس کا مصنف یوسف علی خاں دونوں نوابوں کا معاصر ہے، اس کا باپ مہابت جنگ علی وردی کا بڑا معتمد اور وفادار ہمجلیس رہا، اس کی شادی علی وردی خاں کے آقا اور پیشرو نواب شجاع الدولہ کے لڑکے نواب سرفراز خاں کی لڑکی سے ہوئی،

یہ کتاب اس لحاظ سے تو ہندوستان کے تاریخی لٹریچر میں ایک مفید اضافہ ہے کہ اس سے اٹھارہویں صدی کے بنگالہ کے بہت کچھ واقعات معلوم ہو جاتے ہیں لیکن یوسف علی خاں کو ایک غیر جانبدار مورخ کہنا صحیح نہیں ہوگا، راقم نے اس کتاب کے اس حصہ کو زیادہ دلچسپی سے پڑھا جس میں سراج الدولہ کے حالات ہیں، بنگال کا یہ جانباز نواب جب ہلاک کیا گیا تو اس وقت اس کی عمر کل ۲۴ سال کی تھی لیکن وہ اپنا نام ہندوستان کی تاریخ میں زریں حروف میں لکھنے کے لیے چھوڑ گیا ہے، اس نے کل ایک سال تین مہینے تک بنگال میں حکومت کی، اس قلیل مدت میں اس کی رزمیہ داستان اچھی خاصی طویل ہے، وہ جاگیر دار شوکت جنگ قاسم بازار اور کلکتہ کے انگریز تاجروں سے لڑا، علی نگر کی صلح کی، پھر پلاسی کی جنگ کی، اس کی جنگی کاروائیوں میں غاصب انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کا قابلِ قدر

خود بھی شامل رہا، جو اس کو ظالم، سفاک، غایت بدزبان کہکر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ہے،
یوسف علی خاں نے اس کی موت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

سراج الدولہ کہ بحکومت عالمی اکتفا نداشت و راضی نمی گشت و از ہیبت
ظلم و کمال سفاکی و غایت بدزبانی او زہرۂ ہر برادر آں دیار آب می گشت
با کلاہی بر سر و آزاری در پا و یک لائی بر دوش و داشتہ در آں حال تمنای
محقر گوشۂ دنیا از اہل دنیا نمود و چون وجود نابود او باعث مفاسد عظیمہ
می شد بآں تمنا نیز ہم آغوش نگشتہ بحکم حاکم شدید الانتقام شمشیر قضا
قطع سر رشتۂ جمیع تمنیات او فرمود، بفرمان میر محمد جعفر خاں بہادر نزد مہابت
جنگ مرحوم مدفون ساختہ۔" (ص ۱۷۰ - ۱۶۹)

مذکورۂ بالا اقتباس میں سراج الدولہ کی ایک بری تصویر پیش کی گئی ہے۔
میر جعفر کو ننگ قوم و ننگ دین و ننگ وطن قرار دیا گیا ہے، وہ اپنے زمانے میں
کلائیو کے گدھے کے نام سے مشہور ہے، اس کی غداری اب ضرب المثل بن گئی ہے۔
اسی نے سراج الدولہ کو پلاسی کے میدان میں شکست دلائی، اور آخر میں اس کو قتل
کرایا، اس کے صلہ میں انگریزوں سے بنگال کی نظامت پائی، لیکن اس کتاب میں ان سب
پر پردہ ڈال دیا گیا ہے، ایک جگہ تو اس کی حرمت و عزت کی پاسداری بھی کی گئی ہے۔
(ص ۱۴۲)، اس کے مقابلہ میں کلکتہ میں سراج الدولہ کی حرکت مذبوحی، نہب و تاراج،
غارت گری، آتش زنی، سو انگریزوں کو ایک تنگ و تاریک کمرے میں محبوس
کرنے کا ذکر بہت طمطراق سے کیا گیا ہے (ص ۱۸۵)۔ یہ تمام باتیں شہادت دے رہی
ہیں کہ یہ کتاب انگریزوں کے زیر اثر لکھی گئی۔ ڈاکٹر عبدالسبحان نے تمہید میں لکھا ہے کہ

اس کے مصنف کے تعلقات یورپین حکام سے دوستانہ تھے (ص ۷۵)، غالباً اسی دوستی کا حق یہ کتاب لکھ کر ادا کیا۔ ڈاکٹر عبدالسبحان کو بھی مصنف کی غیر جانبداری پر زیادہ اعتماد نہیں ہے، جیسا کہ انھوں نے اپنی تمہید (ص ۳۰) میں اجمالی طور پر اشارہ کیا ہے مگر اس اجمال کو تفصیل سے لکھنے کی ضرورت تھی، انھوں نے معلوم نہیں اس کتاب کے متعلق یہ کیسے لکھدیا ہے کہ

It helps us to broaden our estimate of the Nawab's (Siraj-ud Dawlah's) Character (p. 8)

حالانکہ اس کتاب کے مطالعہ سے نواب سراج الدولہ کی بہت بری تصویر سامنے آتی ہے مثلاً

"سراج الدولہ کہ چشم طمع بر اموال و ذخائر کلکتہ دوختہ بود" (ص ۱۵۰)

دریں چند روز کہ حرکت المذبوحی می کرد تمامی شہر کلکتہ بباد غارات و تاراج رفتہ ... و امتعۂ اطراف و اکناف بلاد و امصار ہزارہا دلکہا کہ از قریب صد سال در آن شہر از حوادث روزگار مصون و محروس بود۔ بہ نہب و تاراج آمد (ص ۱۵۸)

و قریب صد نفر فرنگان کہ دراں روز اسیر پنجۂ تقدیر شدہ بودند ہمہ انہا را در حجرہ محبوس نمود و ضبط و نسق کوتہی را بہ بعضی از سرداران رجوع کردہ و از کوٹھی بر آمدہ در یکے از خانہ ہای فرنگان قرار گرفت از قضا در حجرہ کہ فرنگان رفتہ بودند، تمامی آنہا مخنوق گشتہ رو بوادی عدم آوردند و قریب بیست و سی نفر دیگر کہ در ایام محاصرہ بضرب بندوق وغیرہ کشتہ شدہ بودند نعشہای آنہا را بر روی یکدیگر در خندق کوٹھی انداختند (ص ۱۵۸)

سراج الدولہ کہ از فتوح سابق مخمور بادۂ غرور بود اصلاً التفات و
اعتناء با نجاح مطالب فرنگان نکردہ (ص ۱۶۲)
و از رقدۂ جہالت و نوم غفلت متنبہ نگشتہ بر صفات ذمیمہ خود کہ باعث
تنفر خاص و عام می شد اصرار نمود .... در خشونت مزاج و اذیت خاص
و عام از طبقہ سپاہ و ارباب کرام ولیام بیشتر از بیشتر افزود ... (ص ۱۶۴)
(ص ۱۶۶)
سراج الدولہ حواس باختہ و دست و پا گم کردہ در فکر ایں بلیۂ نازلہ افتاد
و از کردار ناہنجار خویش کہ در طی ایں حالات نسبت بجان مشار الیہ یعنی
میر محمد جعفر خاں بعمل آوردہ بود اظہار ندامت و انفعال کردہ (ص ۱۶۶)
گر نہ توپی بہ میر مدن کہ بخشی دوم سراج الدولہ و محل اعتمادش بود رسید
از کشتہ شدن او سراسیمگی سراج الدولہ اضعاف مضاعف گشتہ سر تکبر را کہ بر فلک
افلاک می سود در گریبان خمول نسید (ص ۱۶۷)
سراج الدولہ کی موت کے ذکر کے سلسلہ میں مصنف کی رائے کا اقتباس اوپر گذر چکا
ہے۔ اس کے مقابلہ میں انگریز تاجروں کے کمال جرأت، پایداری (ص ۱۶۲) جلادت
(ص ۱۶۵) بلکہ ان کی مظلومیت و معصومیت (۱۴۴، ۱۵۰) کا ذکر جا بجا آیا ہے،
ڈاکٹر عبد السبحان لکھتے ہیں کہ انھوں نے یہ کتاب چھ نسخوں کے موازنہ کے بعد اڈیٹ کی ہے
ان میں سے برٹش میوزیم ہی کے نسخہ میں سراج الدولہ کا باب ہے کسی اور نسخہ میں نہیں، اس سے
یہ کھٹک پیدا ہوتی ہے کہ برٹش میوزیم کے نسخہ کا یہ باب الحاقی تو نہیں؟ اس کھٹک کو مفصل بحث
کے ذریعہ سے دور کرنے کی ضرورت ہے، اس سے قطع نظر سراج الدولہ کے ہلاک کیے جانے کا ذکر ریاض
السلاطین میں کچھ مختلف ہے، ظاہر ہے کہ پلاسی کی جنگ کے بعد ہندوستان کا نقشہ بدل گیا تھا،

اسکے بعد جو بھی تاریخ لکھی گئی اس میں انگریزوں کی مزاجداری ضرور کی گئی، پھر بھی ریاض السلاطین میں ہے کہ میر محمد جعفر خاں نے انگریزوں اور جگت سیٹھ کے اشارے سے قتل کیا، اور اسکی لاش کو ہودج میں لٹکا کر شہر میں گشت کرایا، پھر اس کے چھوٹے بھائی کو بھی سولی پر چڑھا دیا گیا،

سراج الدولہ را از خانۂ دانشاہ گرفتار کردہ باکبر نگر بردند، و ازاں جا کسان داؤد علی خاں و میر محمد قاسم خاں ہمراہ خود گرفتہ بہ مرشد آباد بردند، میر محمد جعفر خاں او را آں روز محبوس داشتہ روز دیگر بہ صوابدید سرداران انگریز و امراء و استبداد جگت سیٹھ مقتولش ساختہ، لاش آں مظلوم را از ہودج آویزاں کردہ در شہر گردانیدہ، در خوش باغ بمقبرۂ نواب مہابت جنگ مدفون ساختند و بعد چندے مرزا مہدی علی خاں برادر خورد سراج الدولہ را نیز در تختہ کشیدہ از جان کشتند و بہ پہلوی برادرش بخاک سپردند (ص ۶۴-۳۶۳)

سیر المتاخرین کے مصنف نے بھی انگریزوں سے متاثر ہو کر اپنی تاریخ لکھی ہے، اس نے تو سراج الدولہ کے قتل کا ذکر کرنے ہی سے گریز کیا ہے، بعض انگریز اہل قلم نے سراج الدولہ کی جو تصویر کھینچی ہے وہ یوسف علی خاں سے مختلف ہے، مثلاً کرنل میلسن نے لکھا ہے،

"سراج الدولہ کا قصور کچھ بھی رہا ہو، لیکن اس نے اپنے آقا سے غداری نہیں کی، اپنے ملک کو فروخت نہیں کیا، جو بھی غیر جانبدار انگریز ہوگا، وہ انصاف کرنے کے لیے بیٹھے گا تو وہ اس سے انکار نہیں کرسکتا ہے کہ ۹ر فروری سے ۲۳ر جون تک جو واقعات ہوئے ان میں سراج الدولہ کا نام عزت کے ترازو کے پلڑے میں کلائیو کے نام سے زیادہ بھاری ہے، اس المناک ڈرامہ کے تمام اہم کرداروں میں وہ نمایاں ہے، کہ اس نے فریب دینے کی کوشش نہیں کی، (بحوالہ رائیز آف دی کرسچین پاور ان انڈیا از باسو جلد اول، ص ۲۰۶)

یہ خراج ایک دشمن قوم کے مورخ کی طرف سے ادا کیا گیا ہے، لیکن یوسف علی خاں سراج الدولہ کا نہ صرف ہم وطن تھا بلکہ اس سے خاندانی لگاؤ بھی رکھتا تھا، وہ اس کے وجود نابود کو باعث مفاسد عظیمہ قرار دیتا ہے، مورخ کے قلم میں بھی عجیب بوقلمونی ہوتی ہے، جو اس کی تاریخ کے پڑھنے والے کے ذہن کو آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے۔

زیر نظر کتاب کی جانبدارانہ نوعیت کا سوال الگ ہے، اس کے لائق مرتب ڈاکٹر عبد السبحان کی محنت پر حرف نہیں آتا، انھوں نے مختلف نسخوں سے اس کو پوری مشقت سے ایڈٹ کیا ہے۔ وہ اس کا انگریزی ترجمہ بھی غالباً کر چکے ہیں، اس کی زبان اکبرنامہ، شاہجہاں نامہ اور عالمگیر نامہ کی طرح مشکل نہیں، اس لیے اس کا ترجمہ کرنا زیادہ مشکل نہیں، اگر انھوں نے اس کے ترجمہ کرنے اور اسی کے ساتھ اسکے حواشی لکھنے میں وہی عرق ریزی کی جو ایشیاٹک سوسائٹی کی گذشتہ مطبوعات کے انگریزی ترجموں میں کی گئی ہے تو یہ ان کا ایک علمی کارنامہ ہوگا،

کتاب کی ضخامت تقریباً ۲۵۲ صفحے ہے، قیمت ۲۵ روپے رکھی گئی ہے، ایشیاٹک سوسائٹی، ۱۔ پارک اسٹریٹ کلکتہ سے مل سکتی ہے۔

مطبوعاتِ جدیدہ

مرزا غالب مرحوم کی صد سالہ یادگار کے موقع پر شائع ہونے والے اردو رسالوں کے خاص نمبروں اور کتابوں کا ان صفحات میں پہلے ذکر ہو چکا ہے، اس کے بعد جو کتابیں اور خاص نمبر آئے ہیں، ان کا اس اشاعت میں تعارف کرایا جاتا ہے، ان میں سے بعض بہت پہلے کے آئے ہوئے ہیں لیکن بعض وجوہ کی بنا پر ان پر ریویو میں تاخیر ہو گئی۔

العلم غالب نمبر۔ مرتبہ جناب سید الطاف علی صاحب بریلوی تقطیع کلاں کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر صفحات ۲۳۲ قیمت عہ ناشر اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی ۱۸

یہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی کے سہ ماہی رسالہ العلم کا غالب نمبر ہے، اس ضخامت اور حجم کے چند ہی غالب نمبر شائع ہوئے ہیں، اس میں غالب کی زندگی، حالات فضل وکمال، شاعری انشا پردازی، طرز بیان، جدت ادا، تلامذہ، احباب ومعاصرین اور دیوان وغیرہ کے متعلق مختلف عنوانات کے تحت ہندوستان وپاکستان کے ممتاز اہل قلم کے مضامین ہیں، غالب کی عظمت اور شاعرانہ کمالات کے بارہ میں پرانی تحریروں کے اقتباسات اور بعض قدیم کمیاب مضامین بھی درج کیے گئے ہیں، ڈاکٹر ممتاز حسن، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، پیر حسام الدین راشدی اور سید ہاشم رضا کے انٹرویو کو ایوب قادری صاحب نے مضامین کا جامہ پہنایا ہے، اتنے ضخیم نمبر میں ناہمواری کا ہونا تعجب انگیز نہیں ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے مرزا کو قومی شاعر

ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ اس زمانہ میں قومیت کا کوئی تصور ہی نہ تھا، اس سے قطع نظر یہ نمبر کیفیت و کمیت دونوں حیثیتوں سے اہم اور غالب کے بارہ میں متنوع معلومات کا عمدہ ذخیرہ ہے۔

اردوئے معلیٰ غالب نمبر حصہ سوم ۔ مرتبہ جناب خواجہ احمد فاروقی صاحب

تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت نفیس، صفحات ۴۰۰، قیمت صر، ناشر: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی ۷۔

دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے شش ماہی "رسالہ اردوئے معلیٰ" نے یکے بعد دیگرے تین غالب نمبر نکالے تھے، زیر نظر تیسرا نمبر غالب صدی کی تقریبات کے سلسلہ میں بڑے اہتمام سے شائع کیا گیا ہے جو دوسرے رسالوں کے غالب نمبروں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے، اس میں غالب کے عہد، شخصیت، شاعری، دیوان و معاصرین وغیرہ کے متعلق ہندوستان کے متعدد نامور اہل قلم اور یورپ و امریکہ کے کئی دانشوروں کے بلند پایہ محققانہ مضامین ہیں، ابتدا ہی میں قاری کو پروفیسر رشید احمد صدیقی کے خطبے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں، جو انھوں نے دلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں دیے تھے، یہ خطبے نہایت متوازن، دلکش اور بصیرت افروز ہیں، ان میں غالب کی سیرت و شخصیت اور شاعری کا بڑی بالغ نظری اور حقیقت پسندی سے جائزہ لیا ہے، اور ان کی بعض لغزشوں کا اس انداز سے تذکرہ کیا ہے جس سے ان کی فنی عظمت میں کوئی فرق نہیں آنے پایا ہے، اور ان نقادوں سے اختلاف بھی کیا ہے جو مرزا کو "رندانِ قدح خوار" کے بجائے "طبقۂ زہاد" میں شامل کرتے اور ان کی شاعری کو ہر قسم کے حقائق اور ہر عہد کے واقعات کا مخزن قرار دیتے ہیں، خواجہ غلام السیدین کا مضمون بھی خصوصیت کے ساتھ پڑھنے کے لائق ہے، پروفیسر ضیاء احمد بدایونی کے تینوں مضامین

ان کے پختہ قلم اور اردو و فارسی شعر و ادب میں انکی بصیرت کے شاہد ہیں، "مسائل تصوف" (میکش اکبرآبادی) اور "غالب کے نظریۂ وحدۃ الوجود کے مآخذ" (شبیر احمد خاں غوری) فاضلانہ اور محققانہ مضامین ہیں، پروفیسر آغا حیدر حسن دہلوی کا دلچسپ مضمون لطف زبان کا نمونہ ہے، فاضل مرتب نے بڑے دلآویز طرز میں غالب کی شخصیت و شاعری میں ترکی و ایرانی عناصر کا ذکر کیا ہے، "غالب کی مابعد الطبیعاتی شاعری" (ڈاکٹر نریش چندر) گو اپنی نوعیت کا نرالا مضمون ہے، مگر وہ خود ماورائی بن گیا ہے، آخر میں غالب کے متعلق غیر مطبوعہ و کمیاب مطبوعہ کتابوں کے چند اقتباسات اور خود غالب کے تصحیح کیے ہوئے دیوان کے چند صفحے کا عکس ہے، یہ نمبر مواد و معلومات کے لحاظ سے غالبیات میں قابل قدر اضافہ ہے۔

سب رس غالب نمبر۔ مرتبہ جناب محمد اکبرالدین صاحب صدیقی، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۲۸، قیمت عہ، پتہ ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد ۱۲ -

یہ دکن کے مشہور ماہنامہ رسالہ "سب رس" کا غالب نمبر ہے، اسکے حصۂ نثر میں دو مزاحیہ اور غالب کے بعض دکنی تلامذہ کے متعلق بھی مضامین ہیں، صاحبزادے شوکت علی خاں نے اپنے مضمون میں دکھایا ہے کہ غالب اردو شعرا میں سب سے زیادہ میر ممنون سے متاثر تھے، "خطوط نگاری میں غالب کا ایک پیش رو" (اظہر علی فاروقی) میں خواجہ غلام غوث بیخبر کا جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے غالب سے بھی پہلے اردو خطوط لکھنا شروع کر دیے تھے، تذکرہ اور انکی خطوط نگاری کی خصوصیات تحریر کی گئی ہیں، "لغات غالب" (احمد علی خاں) میں غالب کے چند مخصوص الفاظ محاورات اور ترکیبوں کا خاکہ دیا گیا ہے، ان کے علاوہ "گنجینۂ معنی کا طلسم اور مافی الضمیر" (ڈاکٹر ابو محمد سحر) "سید ہاشمی اور نسخۂ حمیدیہ" (عبدالقوی دسنوی) "حیات غالب" (محی الدین قادری زور) کا

مرحوم وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں، "غالب کی ایک سعی لاحاصل" (حامد اللہ ندوی) میں غالب کی فارسی شا
کو لا حاصل قرار دینے کی سعی لا حاصل کی گئی ہے، آخر میں حصہ نظم اور رسالوں کے بعض غالب نمبروا
اور غالب سے متعلق کتابوں پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔ اور شروع میں غالب، ان کے مزار، دیو
کے سرورق، اندرونی صفحے اور بعض تحریروں کا عکس اور چند تلامذہ کے فوٹو ہیں، یہ نمبر محنت
کاوش کا نتیجہ اور لائق مطالعہ ہے۔

غالب فکر و فن ۔ مرتبہ شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی تقطیع خورد، کاغذ کتا
و طباعت عمدہ، صفحات ۱۶۰ قیمت تحریر نہیں، ناشر شعبہ اردو گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپو

گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام دسمبر ۱۹۶۹ء میں غالب پر ایک سیمنار منع
ہوا تھا، اس میں یونیورسٹی کے ملحقہ ڈگری کالجوں کے اردو اساتذہ کے علاوہ حیدرآباد
علی گڑھ، لکھنو، بنارس اور الہ آباد کی یونیورسٹیوں کے مختلف شعبوں کے اسات
نے شرکت کی تھی، زیر نظر کتاب میں اس سیمنار میں پڑھے جانے والے مضامین کا انتخا
شائع کیا گیا ہے، اس میں بالترتیب خواجہ احمد فاروقی، احتشام حسین، ڈاکٹر مسعود حسین
اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر مغنی تبسم اور ڈاکٹر محمود ال
کے مقالات ہیں، یہ سب مضامین غالب کے بارہ میں مفید معلومات پر مشتمل ہیں، پروفی
اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر مغنی تبسم کے مضامین زیادہ مبسوط ہیں، خو
احمد فاروقی کا افتتاحی خطبہ بھی مضمون ہو گیا اردو کے معلی رسوم، میں ہے، شروع میں مجاہد حسین
رضوی نے دلچسپ انداز میں سیمنار کی روداد سنائی ہے، اس مجموعہ کی اشاعت پر شعبہ
اردو گورکھپور یونیورسٹی خصوصاً اس کے لائق صدر قابل مبارک باد ہیں۔

"ض"

ہماری بعض نئی مطبوعات

مقالات سلیمان جلد اول تاریخی

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے ان اہم تاریخی مضامین کا مجموعہ جو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، قیمت: للعہ

مقالات سلیمان جلد دوم تحقیقی

سید صاحب کے علمی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں ہندوستان میں علم حدیث، محمد بن عمر الواقدی، عرب و امریکہ، اسلامی رصد خانے کے علاوہ اور بھی بہت سے محققانہ مضامین ہیں۔ قیمت: لغہ

مقالات سلیمان جلد سوم قرآنی

مولانا سید سلیمان ندوی کے مقالات کا تیسرا مجموعہ جو صرف قرآن کے مختلف پہلوؤں اور اس کی بعض آیات کی تفسیر و تعبیر سے متعلق ہیں، (زیر طبع)

مقالات عبد السلام

مولانا عبد السلام ندوی کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور تقریروں کا مجموعہ، قیمت: غہ

تذکرۃ المحدثین (جلد اول)

دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک صحاح ستہ کے مصنفین کے علاوہ دوسرے ۱۲ مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام وغیرہ کے حالات و سوانح، اور ان کے خدمات حدیث کی تفصیل مرتبہ مولوی ضیاء الدین اصلاحی رفیق دار المصنفین، قیمت: بجہ

صاحب المثنوی،

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری حضرت شمس تبریز کی ملاقات کی روداد، اور ان کی زندگی کے بہت سے واقعات کی تفصیل، مؤلفہ قاضی تلمذ حسین صاحب مرحوم، قیمت:- غہ

کشمیر سلاطین کے عہد میں

جنت نظیر کشمیر میں مغل فرمانرواؤں سے پہلے جن مسلمان فرمانرواؤں کی حکومت رہی ہے اور جنھوں نے اس کو ترقی دیکر رشک جہاں بنا دیا، ان کی بہت ہی مستند اور مفصل سیاسی و تمدنی تاریخ، مترجمہ علی حماد عباسی ایم اے قیمت: للعہ

(منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ)

مصنفات سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے

۱- بزمِ تیموریہ: تیموری بادشاہوں شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے شعراء و فضلاء کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل ۴۰۴ صفحے قیمت: عہ

۲- بزمِ مملوکیہ: ہندوستان کے غلام سلاطین کی علم نوازی، علم پروری، اور اس دور کے علماء و فضلاء و ادباء کے علمی کمالات و ادبی و شعری کارنامے ۴۵۰ صفحے قیمت: عہ

۳- بزمِ صوفیہ: عہدِ تیموریہ سے پہلے کے اہلِ قلم و صاحبِ ملفوظات صوفیائے کرام کے حالات و تعلیمات و ارشادات بکثرت اضافوں کے ساتھ نیا اڈیشن قیمت

۴- ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک ایک جھلک

تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی سیاسی تمدنی و معاشرتی تاریخ، ہندو مسلمان مورخوں کے قلم سے، ۵۰۶ صفحے، قیمت: عہ ۲۵

۵- ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے فوجی اور حربی نظام کی تفصیل ملیگی، ۵۰۰ صفحے قیمت: عہ

۶- ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے مختلف تمدنی جلوے پیش کئے گئے ہیں، ۵۰۰ صفحے، قیمت: عہ

۷- ہندوستان کے سلاطین علماء و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

ضخامت: ۲۲۰ صفحے، قیمت: صہ

۸- ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں

ہندوستان سے متعلق امیر خسرو کے جذبات و تاثرات قیمت: عہ

۹- ہندوستان کے بزمِ رفتہ کی سچی کہانیاں

(جلد اول) ۲۴۲ صفحے، قیمت: صہ

۱۰- عہدِ مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں

مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارنامے مغلیہ عہد اور جدید عہد کے مسلمان اور ہندو مورخین کی اصلی تحریروں اور کتابوں کی روشنی میں، ۵۲۶ صفحے، قیمت: عہ

منیجر دار المصنفین اعظم گڑھ

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰) اکتوبر ۱۹۷۱ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کتابت سید اقبال احمد)

مجلسِ ادارت

۱۔ جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی،

۲۔ جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی الٰہ آبادی،

۳۔ شاہ معین الدین احمد ندوی،

۴۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارمِ اخلاق کے اعتبار سے تمام
کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات و احکام و قوا
لحاظ سے بلا تفریق مذہب ملت، نسل و رنگ زاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے، ا
کو اختیار کرنے اور اسی کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے یہا
اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسانوں
میں اہلِ کتاب اور مشرکینِ عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب داخل ہیں، اور حیوانات کے حقوق،
سب کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات ا
علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں اُن کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا۔

......(مرتبہ)......

شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت :- ۳۲۰ صفحے قیمت :- [illegible]

جلد ۱۰۸ ماہ شعبان المعظم ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۷۱ء عدد ۴

مضامین

شذرات

افسوس ہے کہ ملک وملت کی وہ شمع جو ایک عرصہ سے جھلملا رہی تھی، ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی اور ڈاکٹر سید محمود صاحب نے ۲۸ ستمبر کی صبح کو اس جہان فانی کو الوداع کہا۔ ڈاکٹر صاحب جیسی جامع اوصاف شخصیتیں کم پیدا ہوتی ہیں، ان میں مذہب وسیاست، علم وفن اور تہذیب وشرافت کا نہایت متناسب اجتماع تھا، شرافت اور وضعداری کا تو مجسم پیکر تھے، آخر کے چند برسوں کو چھوڑ کر جب وہ بالکل معذور ہوگئے تھے، ان کی پوری زندگی ملک ووطن اور قوم وملت کی خدمت میں گذری، وہ ابتدا سے کانگریسی اور پنڈت جواہرلال نہرو کے پرانے رفیق تھے، ان دونوں کے تعلقات اتنے عزیزانہ تھے کہ ڈاکٹر صاحب پنڈت جی کے گھر کے ایک فرد سمجھے جاتے تھے، جنگ آزادی میں ان کے دوش بدوش حصہ لیا، اور ان کے ساتھ قید وبند کی مصیبتیں جھیلیں، آزادی کے بعد صوبہ بہار کے وزیر تعلیم، پھر مرکزی حکومت میں وزیر مملکت برائے امور خارجہ ہوئے، چند سال پہلے تک راجیہ سبھا کے ممبر تھے، پھر اپنی معذوریوں کی وجہ سے اس سے بھی الگ ہوگئے تھے، ان کا آخری کارنامہ مجلس مشاورت کا قیام ہے، اس کو انھوں نے ہندو مسلم اتحاد، ان دونوں کے درمیان غلط فہمیوں کے ازالہ اور ملک وملت کی مشترک خدمت کے لیے قائم کیا تھا، اور ابتدا میں بڑی سرگرمی سے اس کے کاموں میں حصہ لیا، اور ضعف پیری کے باوجود ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کیا، جس کا ملک کی فضا پر بہت اچھا اثر پڑا، لیکن پھر مجلس مشاورت کی پالیسی میں بعض ارکان سے اختلاف کی بنا پر اس سے الگ ہوگئے، اور چند دنوں سے شیعہ سنی اتحاد کی کوشش میں تھے۔

وہ اگرچہ ابتدا سے کانگریسی اور اس کے نہایت ممتاز رہنما تھے، اور آخر تک اس پر قائم رہے، لیکن اس سے ان کے مذہبی وملی جذبہ میں فرق نہیں آیا تھا، ان کے دل میں مذہب وملت کے لیے بھی وہی تڑپ تھی جو ہندوستان کی آزادی کے لیے تھی، مگر ان کی رائے میں مسلمانوں

کے مسائل کا حل اکثریت سے مل کر اور ان کی مدد ہی سے ہوسکتا تھا، مجلس مشاورت کے قیام کا مقصد بھی یہی تھا، جو پورا نہ ہوسکا۔ وہ عملاً پابند مذہب تھے، ان کو مولانا آسی سکندرپوری سے عقیدت تھی، بلکہ شاید ان سے بیعت بھی تھے، اس لیے ابتدا سے ان پر مذہب کا اثر اور تصوف کا ذوق تھا، اور آخر میں یہ رنگ اور گہرا ہوگیا تھا، مولانا آسی کا عارفانہ کلام بڑے تاثر سے پڑھا کرتے تھے، بزرگوں سے عقیدت رکھتے اور ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔

اس مختصر تحریر میں ان کے اوصاف و کمالات اور سیاسی و قومی خدمات کی تفصیل کی گنجایش نہیں، اس پر بہت سے لکھنے والے لکھیں گے، معارف میں بھی انشاءاللہ مستقل مضمون لکھا جائے گا۔ اس وقت دارالمصنفین سے ان کا تعلق دکھانا مقصود ہے۔ ان کے اور سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے گہرے دوستانہ تعلقات تھے، وہ علمی ذوق بھی رکھتے تھے، اس لیے دارالمصنفین سے بھی ان کو بڑا لگاؤ تھا، وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے پرانے رکن تھے، پھر اس کے صدر ہوگئے تھے، اور پابندی سے اس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے، سوکھرپور ضلع اعظم گڑھ میں ان کی قرابت اور جائداد تھی، اس سلسلہ میں بھی ان کا اعظم گڑھ آنا ہوتا رہتا تھا اور قیام دارالمصنفین میں رہتا تھا، جب تک رہتے بڑی پرلطف صحبت رہتی، سیاسی، علمی، مذہبی ہر قسم کے مسائل پر گفتگو ہوتی، ان میں ان کے بعض تفردات بھی تھے، ان کا حافظہ بڑا قوی تھا، ان کا دماغ پرانی یادوں کا خزانہ تھا، اس سے ہم لوگوں کے معلومات میں بھی اضافہ ہوتا تھا، سید صاحب اور مولانا مسعود علی صاحب کے بعد ان کی حیثیت دارالمصنفین کے بزرگ خاندان کی ہوگئی تھی، اور وہ ہم لوگوں سے اپنے عزیزوں ہی کی طرح محبت کرتے تھے۔

ان کی ذات سے دارالمصنفین کو بڑے فوائد پہنچے، انھوں نے اپنے اثر سے ایک مرتبہ دس ہزار اور دوسری مرتبہ پچاس ہزار سعودی عرب سے دلوائے، وہ کہا کرتے تھے کہ میں چاہتا ہوں کہ دارالمصنفین مالی حیثیت سے اس قدر مضبوط ہوجائے کہ پھر اس کو کسی کی

امداد کی احتیاج باقی نہ رہی، اس کے لیے انھوں نے کویت جانے کا پروگرام بنایا تھا، ہم لوگوں نے عرض کیا کہ اس عمر میں آپ سے اتنا لمبا سفر کیسے ہو سکے گا، فرمایا تبدیلی آب و ہوا سے میری صحت زیادہ ٹھیک رہتی ہے، اور زیادہ تر و تازہ رہتا ہوں، ان کا یہ بھی ارادہ تھا کہ دارالمصنفین میں قیام کر کے اپنے پیش نظر علمی کاموں کو پورا کریں گے، دارالمصنفین کے متعلق اور بھی منصوبے تھے، مگر یہ سارے منصوبے دل ہی میں رہ گئے، اور ان کا وقت آخر ہو گیا، وہ پرانی یادگاروں میں تھے، اس لیے کانگریس اور مرکزی حکومت کے ارکان دونوں ان کا احترام کرتے اور ان کی باتوں کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ مسز اندرا گاندھی خاص طور سے ان کو اپنا بزرگ سمجھتی تھیں، اس اثر سے انھوں نے دارالمصنفین کو بڑا فائدہ پہنچایا، افسوس کہ یہ سہارا ختم ہو گیا، لیکن اصلی اور حقیقی سہارا تو ایک ہی ہے۔ وعلیہ التکلان۔

اس ضعف پیری میں بھی جب کہ ان کے قوی جواب دے چکے تھے، ان کا دماغ پورا کام کام کرتا تھا، اور ان کی ہمت، حوصلے اور قوت عمل کو دیکھکر حیرت ہوتی تھی، مگر ان کے سارے ہم نوا و ہم صفیر اٹھ چکے تھے اور وہ اس انجمن میں اپنے کو تنہا محسوس کرتے تھے، ہندوستان کے حالات سے بھی بہت شکستہ خاطر تھے اور حسرت و افسوس کے ساتھ ان کا ذکر کیا کرتے تھے، ادھر کئی مہینوں سے ان کی حالت خراب تھی، جولائی میں تو زندگی سے بالکل مایوسی ہو گئی تھی، ان کی حالت سنکر راقم اور صباح الدین صاحب ان کو دیکھنے کے لیے دلی گئے تھے، مگر ہمارے دوران قیام میں برابر بیہوش رہے، اور ہوش میں ان سے ملاقات نہ ہو سکی، مگر اس کے بعد پھر حالت سنبھل گئی تھی، لوگوں کو پہچاننے اور باتیں کرنے لگے تھے، شروع اکتوبر میں بعض ضرورتوں سے پھر ہم دونوں کا دلی سفر ہونے والا تھا، خیال تھا کہ اس مرتبہ ہوش میں ملاقات ہوگی کہ ۲۸ ستمبر کی صبح کو دلی ریڈیو اسٹیشن نے ان کی وفات کی غمناک خبر سنائی اور یہ آرزو دل ہی میں رہ گئی، البتہ ان کے مزار پر حاضری ہوگی، انکی وفات دارالمصنفین کے لیے تنہا قومی نہیں بلکہ ذاتی حادثہ بھی ہے، اللہ تعالیٰ ملک و وطن کے اس خادم اور قوم و ملت کے اس غمخوار کی مغفرت اور عالم آخرت میں مقام محمود عطا فرمائے

والبقاء للہ وحدہٗ

مقالات

اقبال کی تعلیمات پر ایک نظر

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

اقبال مفکر اور فلسفی بھی تھے اور راسخ العقیدہ مسلمان بھی، ارکان اسلام کے بارہ میں ان کے عقائد بالکل ایک ٹھیٹھ مسلمان کے تھے، چنانچہ انھوں نے اپنے کلام میں جا بجا حکمائے اسلام پر طنز و تعریض کی ہے، لیکن ان کے مخاطب عوام و خواص دونوں تھے انکا مقصد تہذیب کے متعلق مغربی افکار و تصورات کے طلسم کو توڑنا اور مسلمانوں کی مغرب زدہ نئی نسل میں خصوصیت کے ساتھ اسلامی روح پیدا کرنا تھا، اس لیے انھوں نے دونوں کی زبان میں گفتگو کی ہے ٹھیٹھ اسلام بھی پیش کیا ہے اور اس کی تعلیمات کی حکیمانہ تعبیریں بھی کی ہیں، ان کی حکیمانہ تعلیمات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن ٹھیٹھ اسلامی تعلیمات پر کم لکھا گیا ہے، اس لیے اس مقالہ میں ان کی دوسری تعلیمات کے ساتھ اسلام کے بنیادی ارکان توحید، رسالت، وحی قرآن اور اسلامی شریعت وغیرہ کے متعلق ان کے خیالات خصوصیت کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں، یہ مقالہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے توسیعی خطبات کے سلسلہ

میں مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کی صدارت میں آخر ستمبر ۱۹۷۳ء میں پڑھا گیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کے ساتھ اُن پر دینی و اخلاقی انحطاط بھی طاری ہو گیا تھا، آخری دور کے تیموری سلاطین میں کوئی دم باقی نہ رہ گیا تھا، پورے ملک میں بدنظمی اور انقلاب برپا تھا، صوبوں میں نئی نئی طاقتیں ابھر رہی تھیں، اور بعض میں آزاد حکومتیں قائم ہو گئی تھیں، تیموری سطوت دم توڑ چکی تھی، یہی حال مذہب و اخلاق کا بھی تھا، مسلمانوں سے مذہبی روح ختم ہو چکی تھی، مذہب کے نام پر اوہام اور بدعات کا دور دورہ تھا، پوری قوم فکرِ فردا سے غافل تعیشات و تفریحات میں غرق تھی، علماء پر جمود طاری تھا، علم و فن کے وہ سرچشمے جن سے ملت کی کشتِ حیات سیراب ہوتی تھی خشک ہو چکے تھے، اور اس کا پورا شیرازہ برہم ہو رہا تھا، علماء میں سب سے پہلے شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کو اس کا احساس ہوا، انھوں نے اپنی تصانیف کے ذریعہ اصلاح کی کوشش کی، مگر اس کا کوئی فوری نتیجہ نہ نکلا، مگر آیندہ چل کر ان کے لگائے ہوئے پودے نے برگ و بار پیدا کیے، ان کے پوتے مولانا اسماعیل شہیدؒ اور شاہ عبد العزیزؒ کے شاگرد مولانا سید احمد بریلویؒ نے دینی اصلاح و تجدید کے ساتھ مسلمانوں کی کھوئی ہوئی سیاسی عظمت کے قیام کے لیے علم جہاد بلند کیا، اور چند دنوں کے اندر بنگال سے لیکر صوبہ سرحد تک اس کا پورا انتظام قائم کر دیا، اس وقت پنجاب میں سکھوں کا اقتدار تھا جنھوں نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا، اس لیے پہلی ٹکر اُن ہی سے ہوئی، اور کئی سال تک ان سے مقابلہ کا سلسلہ جاری رہا، اور مولانا اسماعیل اور مولانا سید احمد بریلوی نے اس راہ میں شہادت حاصل کی، اس تحریک کا خاتمہ بظاہر ناکامی پر ہوا، مگر دینی حیثیت سے اس کے بڑے مفید نتائج نکلے، مولانا اسماعیل شہید کی تصانیف و مواعظ سے مسلمانوں

کے ایک طبقہ میں بدعات اور مشرکانہ رسوم کا خاتمہ ہوگیا، اور جہاد کی تحریک نے ان میں احیائے دین کے لیے جانبازی کی روح پیدا کردی، جن کو ان کے پیرووں نے عرصۂ دراز تک جاری رکھا، تاآنکہ انگریزوں نے اپنے تسلط کے بعد ظالمانہ طریقہ سے اس کا خاتمہ کیا، اس لیے آج بھی ہندوستان میں توحید اور دین خالص کی جو کرن نظر آتی ہے وہ انہی نفوسِ قدسیہ کا فیض ہے۔

اس زمانہ میں انگریزوں کی قوت ابھر چکی تھی، جو مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ خطرناک تھی، وہ علم و سائنس کے اسلحہ سے مسلح اور اس کے جلو میں مغربی علوم کی فوج اور ایک نظر فریب تہذیب تھی، اس نے محض سیاسی نہیں بلکہ ذہنی اور دماغی حیثیت سے بھی مسلمانوں کو مغلوب کرنے کی کوشش کی، مسلمانوں کے زوال و پستی اور جمود و بے عملی کے باوجود ان میں اپنے مذہب اور اپنی تہذیبی برتری کا پورا احساس باقی تھا، لیکن مغربی علوم اور مغربی تہذیب نے ان میں ایسا احساس کمتری پیدا کردیا کہ ان کا مذہب اور ان کی تہذیب و روایات بھی خطرہ میں پڑ گئے۔ اس کا مقابلہ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا، مولانا شبلی اور علماء کی ایک جماعت نے اپنے اپنے طریقہ پر کیا اور بعض حیثیتوں سے اس میں کامیابی بھی ہوئی، لیکن مغربی علوم کا حملہ مختلف سمتوں سے تھا، اور ہر محاذ پر مقابلہ کی صلاحیت ان میں سے کسی میں نہ تھی اس لیے مغربی علوم اور مغربی تہذیب کی یلغار کا پورا مقابلہ نہ ہوسکا، سرسید احمد خاں اور ان کی جماعت میں اخلاص اور مسلمانوں کی ہواخواہی کے باوجود دینی بصیرت نہ تھی، انھوں نے صرف تعلیم جدید اور جدید خیالات اور مغربی تہذیب سے ہم آہنگی اور انگریزوں سے مفاہمت کو مسلمانوں کے مرض کا مداوا سمجھا، اس سے مسلمانوں کو دنیاوی فوائد تو ضرور حاصل ہوئے،

اور ان کی گرتی ہوئی حالت سنبھل گئی، مگر مذہبی حیثیت سے نقصان پہنچا، علماء نے صرف مروجہ دینی تعلیم کے ذریعہ جو بڑی حد تک بیجان ہو چکی تھی، اور مغربی تعلیم کے اثرات و نتائج کے مقابلے کا صرف تھی، اس سیلاب کو روکنا چاہا، مگر اب دین کی حفاظت جدید علوم اور نئے خیالات و رجحانات سے واقفیت کے بغیر ممکن نہ تھی، جس سے دینی طبقہ تہی دامن تھا، اس لیے ان کی کوششوں سے ایک حلقہ میں تو دین کی حفاظت ہو گئی لیکن جدید تعلیم یافتہ طبقہ پر اس کا اثر نہ ہو سکا، اور اس میں مغربی علوم اور مغربی تہذیب کے اثرات پوری طرح پھیل گئے، علماء کی جماعت میں مولانا شبلی کی تصانیف نے ایک حد تک ان اثرات کو روکا اور مسلمانوں میں ان کی دینی اور تہذیبی برتری کا احساس پیدا کیا۔

مصلحین کے اس سلسلہ کی ایک زریں کڑی اقبال ہیں، وہ راسخ العقیدہ مومن تھے، اگرچہ وہ رسمی طور سے عالم نہ تھے، لیکن مذہب اسلام اور اسلامی تاریخ و تہذیب کے ہر پہلو پر ان کی نظر بہت سے علماء سے زیادہ گہری اور وسیع اور حکیمانہ و فلسفیانہ تھی، وہ مغربی علوم و افکار اور اس کے فلسفوں سے پوری طرح واقف اور ان میں ناقدانہ بصیرت رکھتے تھے، جدید تعلیم و تہذیب کے عیب و ہنر سے پوری طرح آگاہ تھے، اس لیے اس دور میں جتنے مصلحین پیدا ہوئے، اُن میں سب سے زیادہ جامعیت اور مغربی تہذیب کے مقابلہ کی صلاحیت اقبال میں تھی۔

اس جامعیت کے ساتھ ان کو اللہ تعالیٰ نے دین میں رسوخ، مذہب و ملت کی سچی تڑپ اور شاعری کی الہامی زبان عطا فرمائی تھی، اور وہ صحیح معنوں میں "الشعراء تلامذۃ الرحمٰن" اور ان کی شاعری "انّ من الشعر لحکمۃ" کی مصداق تھی، انھوں نے اپنی شاعری سے "عصائے موسیٰ" اور "ید بیضا" دونوں کا کام لیا، اور مغربی تہذیب اور جدید افکار کے جم

پر تیشہ چلایا، اس کے ایک ایک عیب کو بے نقاب کیا، اسلام کو بڑے حکیمانہ انداز میں پیش کیا، دین سے مسلمانوں کا رشتہ جوڑا، ان کی مردہ رگوں میں زندگی کی روح اور دین کی حرارت پیدا کی، ان کے ایک ایک مرض کی نشاندہی کی، اس کا علاج بتایا، ملت اسلامیہ کو اس کے اصل منصب سے آگاہ کیا کہ وہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہے، اس کا کام دوسروں کی تقلید نہیں بلکہ پوری دنیا کی امامت اور ہدایت و رہنمائی ہے، ان میں اولوالعزمی اور حوصلہ مندی پیدا کرنے کی کوشش کی، جس نے ان کو ایک زمانہ میں اقوام عالم کا معلم بنادیا تھا، اور مغربی دنیا کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ عالم انسانیت کا اصل مذہب اسلام ہے، اور اسی پر اس کی فلاح منحصر ہے۔

ان کی حکیمانہ شاعری نے ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات میں بڑا انقلاب پیدا کر دیا، مغربی تہذیب سے مرعوبیت اور اس کے برے اثرات کو روکا، ان میں اپنی دینی و ملی برتری کا احساس پیدا کیا، اور یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ مسلمانوں خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی ذہنی و فکری اصلاح و تجدید میں دورِ جدید کے تمام مصلحین میں سب سے بڑا حصہ اقبال کا ہے۔ یوں تو ہر صنف کے مصلحین نے اپنی اپنی صنف میں مفید اصلاحیں کیں، اور اس کے اچھے نتائج نکلے لیکن جو گیرائی اور جامعیت اقبال میں ہے، اس کی مثال دورِ جدید کے کسی مصلح میں نہیں ملتی، انھوں نے مسلمانوں کے تمام قابلِ اصلاح پہلوؤں اور اسلامی تعلیمات کو ایسے حکیمانہ اور رنگارنگ انداز میں پیش کیا کہ ان کا انتخاب دشوار اور اس کی تفصیل کے لیے ضخیم مجلدات کی ضرورت ہے، اس لیے اس مقالہ میں صرف بنیادی امور و مسائل پر اجمالی گفتگو کی جائے گی، اس سے پہلے چند باتیں پس منظر کے طور پر کہہ دینا ضروری ہے،

دنیا کے تمام الہامی مذاہب کا مقصد، خدا شناسی کی تعلیم اور انسانوں کی ہدایت و رہنمائی تھی، اور ان سب نے اپنے اپنے زمانہ کے حالات و ضروریات کے مطابق اس فرض کو انجام دیا، لیکن ان مذاہب کا دائرہ اور ان کی تعلیمات محدود تھیں، اور امتداد زمانہ سے ان سب کا اثر ختم ہو چکا تھا، ظہور اسلام سے پہلے بھی خدا شناسی کا کہیں وجود رہ گیا تھا، کہیں ستاروں کی پوجا تھی، کہیں دیوی دیوتاؤں کی، کہیں انسانی دولت و قوت کی، حیوانات اور شجر و حجر تک مسجود و ملائک کے معبود بن گئے تھے، اخلاق و روحانیت کا چراغ گل ہو چکا تھا، نفس پرستی اور وحشیانہ طاقتوں کا دور دورہ اور ہر کمزور اور ادنیٰ طبقہ اپنے سے اعلیٰ اور طاقتور طبقہ کا غلام تھا، انسانی شرافت کا بالکل خاتمہ ہو چکا تھا، خالص دنیاوی اور مادی حیثیت سے بھی انسانوں کے لیے کہیں جائے پناہ نہ رہ گئی تھی، اگر کہیں اخلاق و روحانیت کی کوئی کرن نظر آتی بھی تو ترکِ دنیا، نفس کشی اور جسمانی اذیت کی شکل میں جس کا تحمل انسانی طاقت سے باہر ہے

انسانیت کی اس شب تار میں اسلام کا ظہور ہوا، اس کا مقصد بھی خدا شناسی کو زندہ کرنا، خدا سے انسانوں کا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنا اور سیکڑوں آستانوں پر جھکنے والی گردنوں کو ایک خدائے واحد کے سامنے جھکانا اور پورے عالم انسانیت کو ایک رشتہ میں منسلک کرکے اخلاق و روحانیت کے نور سے منور کرنا تھا، اس کی دعوت" کافۃ للناس" یعنی سارے عالمِ انسانیت کے لیے تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بلا امتیاز نسل و رنگ اور ملک و وطن دنیا کی تمام قوموں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے مبعوث ہوئے تھے، "بُعثتُ الی الاسود و الاحمر"، آپ کی ذات رحمۃ للعالمین تھی،" وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعالمین" اس لیے اسلام کی تعلیمات میں بھی وہی آفاقیت اور ہمہ گیری ہے، اس نے ایک ایسی امت پیدا کی

جو اقوام عالم کے لیے نمونہ اور اس کی ہدایت و رہنمائی کی ذمہ داری سے گراں بار تھی،

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس	مسلمانو! تم بہترین امت ہو جو لوگوں
تامرون بالمعروف وتنھون	کی ہدایت و رہنمائی کے لیے پیدا کیے گئے،
عن المنکر و تومنون باللہ	تم اچھی باتوں کا حکم دیتے ہو، بری باتوں
	سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔
وکذالک جعلناکم امۃ وسطاً	اور اسی طرح ہم نے تم کو درمیانی امت
لتکونوا شھداء علی الناس ویکون	بنایا تاکہ تم لوگوں کے (اعمال) کے گواہ ہو
الرسول علیکم شھیداً	اور رسول تمہارے (اعمال) گواہ رہیں۔

اقبال نے اسلام کے اس پیام اور امت اسلامیہ کے عناصر ترکیبی اور اس کے اوصاف وخصوصیات اور منصب و مقام کو بڑے حکیمانہ انداز میں بیان کیا ہے، جن کے بدولت وہ خیر امت کے لقب سے ملقب ہوئی، اور جنھوں نے ایک زمانہ میں اس کو ساری دنیا کا معلم و امام بنا دیا تھا، اور آئندہ بھی اس کو اسی کے ذریعہ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل ہو سکتا ہے۔

ملت اسلامیہ کا سنگ اساس توحید و رسالت ہے

دوسری تمام قوموں اور ملتوں کی بنیاد نسل و وطن پر ہے، اس لیے قومی اور جغرافیائی دائروں میں محدود ہیں، لیکن اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے، وہ ساری دنیا کی ہدایت کے لیے آیا ہے، اس لیے اس نے ملت اسلامیہ کی بنیاد نسل و وطن کے بجائے چند بنیادی صداقتوں پر رکھی، ان میں سب سے مقدم توحید و رسالت ہیں، مسلمان کسی وطن کا پابند نہیں، اس کا وطن ساری دنیا ہے،

جوہر ما با مقامے بستہ نیست   بادۂ تندش بجامے بستہ نیست

ہندی و چینی سفال جام ماست / رومی و شامی گِل اندام ماست
قلب ما از ہند و روم و شام نیست / مرز و بوم او بجز اسلام نیست
عقدۂ قومیتِ مسلم کشود / از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملتِ گیتی نورد / بر اساسِ کلمۂ تعمیر کرد
تا ز بخششہائے آں سلطان دیں / مسجد ما شد ہمہ روئے زمیں
ہر کہ از قید حیات آزاد شد / چوں فلک در شش جہت آباد شد

توحید | ملت اسلامیہ کا سنگ اساس اور اس کی طاقت کا سرچشمہ توحید ہے، اس کی ساری تاب و تواں اسی سے وابستہ ہے. توحید کامل یہ ہے کہ خدا کو ایک مانا جائے، اس کی کسی صفت میں دوسری طاقتوں کو شریک نہ کیا جائے، صرف اسی کو قادر مطلق اور متصرف فی الکائنات یقین کیا جائے، یعنی ہر چیز اسی کے اختیار میں ہے، وہی ساری احتیاجوں کا پورا کرنے والا ہے، اس کے مقابلہ میں دنیا کی ساری طاقتیں ہیچ ہیں، حتی کہ اولیاء و انبیاء تک عاجز و درماندہ ہیں. اس یقین کے بعد انسان کی نگاہ میں دنیا کی کسی طاقت کی وقعت باقی نہیں رہتی، ان کا خوف اس کے دل سے نکل جاتا ہے. اس کی نگاہ بلند ہو جاتی ہے، اور وہ صحیح معنوں میں اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے، اس کی گردن خدا کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکتی، اور اس میں اتنی طاقت اور خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ مافوق الفطرت کارنامے انجام دینے لگتا ہے. اس لیے توحید ملتِ اسلامیہ کی جان اور اس کی شیرازہ بند ہے، اسی سے اس میں وحدت و یکرنگی پیدا ہوتی ہے.

اقبال کے نزدیک عقل کو بھی توحید ہی سے رہنمائی حاصل ہوتی ہے، اس کے بغیر وہ گم کردہ راہ رہتی ہے، اور منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتی، دین و حکمت، آئین و قوانین'

زور، قوت اور غلبہ و اقتدار سب کا سرچشمہ توحید ہے۔ اسی کے بدولت پست، بلند اور حقیر خاک اکسیر کا مرتبہ حاصل کرلیتی ہے۔ اس کی طاقت سے غلام معزز و محترم اور بالکل دوسرا انسان بنجاتا ہے، حق کی راہ میں اس کی جد وجہد تیز اور اس کے خون میں بجلی کی حرارت پیدا ہو جاتی ہے، خوف اور شک و شبہات کافور ہو جاتے ہیں، زندگی سراسر عمل بنجاتی ہے، انسانی نگاہ کائنات کے اسرار کا مشاہدہ کرنے لگتی ہے، جب انسان کی عبدیت کا مقام مستحکم ہو جاتا ہے تو گداگری کا کاسہ بھی جام جم بنجاتا ہے، اس لیے ملت بیضا جسم ہے اور لاالٰہ اس کی جان ہے، مسلمان کے ساز کا مضراب، اس کے اسرار کا سرمایہ اور اس کا شیرازۂ افکار لاالٰہ ہی ہے، جب توحید زبان سے دل میں اترتی ہے، تو طاقت و توانائی بن جاتی ہے، ملت کا وجود دلوں کی وحدت و یکرنگی سے وابستہ اور اس کا سینہ اسی ایک جلوہ سے روشن ہے، اس لیے اس کے افکار و تصورات، جذبات و خیالات مدعا و مقصود اور خوب و زشت کے معیار میں وحدت ضروری ہے، توحید ہی کی نعمت سے مسلمان ایک دوسرے کے بھائی اور ایک دل، ایک زبان اور ایک جان بن گئے،

در جہانِ کیف و کم گردید عقل	پے بمنزل برد از توحید عقل
ورنہ ایں بیچارہ را منزل کجاست	کشتیِ ادراک را ساحل کجاست
دیں ازو، حکمت ازو، آئیں ازو	زور ازو، قوت ازو، تمکیں ازو
پست اندر سایہ اش گردد بلند	خاک چوں اکسیر گردد ارجمند
قدرت او برگزیند بندہ را	نوعِ دیگر آفریند بندہ را
در رہِ حق تیز تر گردد تگش	گرم تر از برق، خون اندر رگش
بیم و شک میرد، عمل گیرد حیات	چشم می بیند ضمیرِ کائنات

چوں مقام عبدہ محکم شود — کاسۂ دریوزہ جام جم شود

ملتِ بیضا تن و جاں لا الہ — ساز ما را پردہ گرداں لا الہ

لا الہ سرمایۂ اسرار ما — پردہ بند از شعلۂ افکار ما

حرفش از لب چوں بدل آید ہمی — زندگی را قوت افزاید ہمی

ملت از یک رنگیٔ دلہاستے — روشن از یک جلوہ ایں سیناستے

ما ز نعمت ہائے او اخواں شدیم

یک زبان و یک دل و یک جاں شدیم (رموز بیخودی)

ایک دوسرے مقام پر توحید اور ملتِ اسلامیہ کی وحدت اور اس کے فوائد کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :۔

چیست ملت اے کہ گوئی لا الہ — با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ

اہل حق را حجت و دعوی یکیست — خیمہ ہائے ما جدا دلہا یکیست

ذرہ ہا از یک نگاہی آفتاب — یک نگر شو تا شود حق بے حجاب

یک نگاہی را بچشم کم مبیں — از تجلی ہائے توحید است ایں

ملتے چوں می شود توحید مست — قوت و جبروت می آید بدست

مردۂ از یک نگاہی زندہ شو — بگذر از بے مرکزی پایندہ شو

وحدتِ افکار و کردار آفریں

تا شوی اندر جہاں صاحب نگیں

یعنی ملت نام ہے لا الہ کے اقرار اور آنکھوں کی کثرت کے باوجود وحدت نگاہ کا، اہل حق کے دعوی اور دلیل میں یکسانیت ہوتی ہے۔ گو ان کے جسم جدا جدا ہوتے ہیں ،

لیکن ان کا دل ایک ہوتا ہے، نگاہ کی وحدت سے ذرے آفتاب بن جاتے ہیں، اسلیے وحدت نگاہ پیدا کرو، اسی سے حق کا چہرہ بھی بے نقاب ہوتا ہے، یک نگاہی کو حقیر اور معمولی چیز نہ سمجھو، یہ توحید کی تجلی کا کرشمہ ہے، جب کوئی ملت بادۂ توحید سے سرشار ہو جاتی ہے تو قوت و جبروت اس کے قبضۂ قدرت میں آجاتے ہیں، تم مردہ ہو یک نگاہی کے آب حیات سے زندگی اور لامرکزیت کو چھوڑ کر مرکز وحدت کے ذریعہ دوام و استحکام حاصل کرو، وحدت افکار ہی کردار آفریں ہے، اسی کے ذریعہ دنیا کو زیر نگیں کر سکتے ہو،

توحید برق جہاں سوز بھی ہے اور باران رحمت بھی، ایک طرف وہ ہر باطل کو پاش پاش اور ہر فتنہ و شر کا قلع و قمع کر دیتی ہے، دوسری طرف عالم انسانیت کو خیر و صلاح سے معمور اور علم و عرفان کی روشنی سے منور کر کے ایک دنیا بساتی ہے۔

نکتہ ای گویم از مردانِ حال — امتاں را "لا" جلال "الا" جمال
تا ز رمزِ لا الٰہ آید بدست — بندِ غیر اللہ را نتواں شکست
در جہاں آغاز کار از حرفِ لاست — ایں نخستیں منزلِ مردِ خداست
ملتے کز سوز او یکدم تپید — از گلِ خود خویش را باز آفرید
پیش غیر اللہ لا گفتن حیات — تازہ از ہنگامۂ او کائنات
ہر کرا ایں سوز باشد در جگر — ہوش از ہولِ قیامت بیشتر
ضرب او ہر بود را سازد نبود — تا بروں آئی ز گرداب وجود

اسی توحید کی بدولت مسلمانوں نے پرانی بوسیدہ دنیا کو زیر و زبر کر کے نیا جہان پیدا کیا تھا،

سینۂ ما از حریفِ اولات و منات — در جہات آزاد از بندِ جہات

ہر قبائے کہنہ چاک از دست او — قیصر و کسریٰ ہلاک اندر دست او
گاہ دشت از برق و بارانش بدرد — گاہ بحر از زور طوفانش بمد
عالمے در آتش او مثل خس — ایں ہمہ ہنگامۂ لا بود و بس
اندریں دیر کہن پیہم تپید — تا جہانے تازہ آمد پدید
بانگ حق از صبح خیزیہائے اوست — ہر چہ ہست از تخم ریزیہائے اوست
لوح دل از نقش غیر اللہ شست — از کف خاکش دو صد ہنگامہ رست

یعنی توحید نے مسلمانوں میں وہ قوت پیدا کردی کہ ان کی ایک ضرب سے لات و مناۃ ریزہ ریزہ ہو گئے، اور وہ دنیا میں رہ کر بند جہات سے آزاد ہو گئے، ہر پرانی اور فرسودہ قبا کو انھوں نے چاک کر دیا اور قیصر و کسریٰ کی شہنشاہی کو مٹا دیا، دشت و صحرا ان کے برق و باران کی ہیبت اور سمندر ان کے زور طوفان سے لرزاٹھے، ایک عالم ان کی آتشِ سوزاں کے مقابلہ میں خس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور یہ سارا انقلاب و ہنگامہ صرف کلمۂ توحید کا نتیجہ تھا، اس دیر کہن میں اپنی جانکاہی اور تڑپ سے ایک نیا عالم پیدا کر دیا، حق کا آوازہ ان کی سحر خیزی اور دعائے صبح گاہی کا اور دنیا میں جو خیر نظر آتا ہے، ان کی تخم ریزی کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے غیر اللہ کا نقش دل سے مٹا دیا، اس سے ان کی کف خاک سے سیکڑوں انقلاب برپا ہو گئے۔

دوسرا رکن رسالت | اللہ تعالیٰ کی ذات تو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی، لیکن انسانوں نے اس کو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ پہچانا، اور جنھوں نے انبیاءؑ کے وسیلہ کے بغیر پہچاننے کی کوشش کی، انھوں نے ٹھوکر کھائی یا متحیر ہو کر خدا کا انکار کر بیٹھے، یا کائنات کی تمام قوتوں کو خدا مان لیا، یا فلسفیانہ خیالات میں الجھ کر رہ گئے۔ اس لیے خداشناسی کا صحیح وسیلہ

رسالت ہے، وہی خدا کے دین کو عملی شکل میں پیش کرتی ہے، اس لیے توحید کے بعد اسلام کا دوسرا رکن رسالت ہے، اسی سے ملت اسلامیہ وجود میں آئی، اور اسی کے پیکر میں جان پڑی، اسی سے اس کا دین آئین بنا، اس کی لائی ہوئی کتاب مومن کی قوت کا سرچشمہ اور اس کی حکمت ملت کے لیے رگ جاں ہے، اسی کے نفسِ گرم کی تاثیر سے اس میں زندگی کی روح اور اس کے افکار و معتقدات اور مقصد و مدعا میں وحدت و یک رنگی پیدا ہوئی، اور ملت نے نبی سے دین فطرت سیکھ کر دنیا کی شبِ تار میں حق کی شمع روشن کی، دنیا کی ہر کثرت وحدت کی بنیاد پر زندہ ہے، ملت اسلامیہ کی وحدت کی بنیاد دین فطرت پر ہے، جب تک یہ وحدت قائم ہے، اس کی ہستی نہیں مٹ سکتی۔

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید — وز رسالت در تنِ ما جاں دمید

از رسالت در جہاں تکوینِ ما — از رسالت دینِ ما آئینِ ما

از رسالت صد ہزار ما یک است — جزوِ ما از جزوِ ما لاینفک است

ما ز حکمِ نسبتِ او ملتیم — اہلِ عالم را پیامِ رحمتیم

قلبِ مومن را کتابش قوت است — حکمتش حبل الورید ملت است

زندگیِ قوم از دمِ او یافت است — ایں سحر از آفتابش روشن است

از رسالت ہم نوا گشتیم ما — ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما

دینِ فطرت از نبی آموختیم — در رہِ حق مشعلے افروختیم

زندہ ہر کثرت ز بندِ وحدت است — وحدتِ مسلم ز دینِ فطرت است

تا ازیں وحدت ز دستِ ما رود
ہستیِ ما تا ابد ہمدم شود (رموز بیخودی)

دعوت کی اہمیت | دنیا کی ہر قوم میں مصلحین مجددین اور مصلحاء و حکماء پیدا ہوتے رہے، جنہوں نے
چند دور میں اپنی قوم کی بعض جزوی اصلاحیں کیں، مگر ان کی حیثیت ایک شعلہ سے
یادہ نہ تھی، جو عارضی چمک دکھا کر بجھ گیا، اور اب ان کا نام صرف تاریخوں میں ملتا ہے،
ن کی اصلاحات کا کہیں وجود باقی نہیں ہے، ہمہ گیر اور دیرپا انقلاب صرف انبیاء
یہم السلام کا حصہ رہا ہے، اور آج دنیا میں اخلاق و روحانیت اور خیر و صلاح کی
روشنی بھی نظر آتی ہے، وہ صرف انہی نفوس قدسیہ کا فیض ہے، نبی خدا کا پیامبر
تا ہے، اس کی نصرت و حمایت اس کے ساتھ ہوتی ہے، اس لیے وہ جیسا ہمہ گیر
ر دیرپا انقلاب برپا کرتا ہے، وہ تنہا طاقت بشری سے ممکن نہیں ہے، اقبال نے
ت کی اس اہمیت کو ان الفاظ میں دکھایا ہے:-

تا نبوت حکم حق جاری کند	پشت پا بر حکم سلطانی زند
پختہ ساز د صحبتش ہر خام را	تازہ غوغائے دہد ایام را
درس او اللہ بس باقی ہوس	تا نیفتد بندِ حق در بندِ کس
حکمتش برتر ز عقلِ ذو فنون	از ضمیرش امتے آید بروں
اندر آہ صبح گاہی او حیات	در نگاہ او پیامِ انقلاب
درس لا خوفٌ علیہم می دہد	تا دلے در سینۂ آدم نہد
من نمی دانم چہ افسوں می کند	روح را در تن دگرگوں می کند
صحبت او ہر خزف را دُر کند	حکمت او ہر تہی را پر کند

(دمسافر)

یعنی نبی جب خدا کا حکم جاری کرتا ہے تو دنیاوی بادشاہوں اور حکمرانوں کو
ں سے مسل ڈالتا ہے، اس کی صحبت ہر خام کو پختہ بنا دیتی ہے، وہ زمانہ میں ایک

نیا انقلاب برپا کرتا ہے، وہ اتنا بس باقی ہوس کا درس دیتا ہے، تاکہ بندہ الٰہ پابند پھر کسی کے دام میں نہ آسکے، اس کی حکمت کا درجہ عقلِ پُرفن سے کہیں بلند ہے، اس کی تعلیم کے اثر سے ایک امت کا ظہور ہوتا ہے، اس کی آہ صبح گاہی سے زندگی پیدا ہوتی ہے، اور اس کی نمود سے کائنات میں جان پڑتی ہے، اس کی نگاہ انقلاب کی پیامبر ہوتی ہے اس کے زور طوفان سے بحر و بر میں زلزلہ پیدا ہوجاتا ہے، وہ "لاخوفٌ علیہم" کے درس سے بنی آدم کے سینہ میں دل زندہ کردیتا ہے، اور ایسا سحر کرتا ہے کہ روح کی حالت دگرگوں ہوجاتی ہے، اس کی صحبت خزف ریزوں کو موتی بنا دیتی ہے، اور اس کی حکمت ہر خلا کو پر کردیتی ہے۔

ملت اسلامیہ کا وجود ایک آئین سے وابستہ ہے اور وہ قرآن مجید ہے

ملت اسلامیہ کی ہستی ایک آئین سے وابستہ ہے، دین کی اصل روح اور دنیا میں مسلمانوں کے استحکام اور ان کی سربلندی کا راز یہی آئین ہے، یہ آئین زندۂ جاوید کتاب قرآن حکیم ہے، اس کی حکمت لازوال ہے، وہ انسانوں کی حیات کا ایک نسخہ ہے، اس کی قوت سے ناامید انسانوں کو زندگی ملتی ہے، وہ پوری نوع انسانی کے لیے خدا کا آخری پیغام ہے اور حامل قرآن کی ذات گرامی سارے عالم کے لیے رحمت ہے، اس کتاب کے ذریعہ پست اور ذلیل انسان بلند و برتر ہوجاتا ہے، وہ خدا کے سجدے سے انسان کو اتنا بلند کردیتا ہے کہ پھر اس کا سر کسی کے سامنے نہیں جھکتا، اس پر عمل کے طفیل میں جو قوم رہزن تھی، دنیا کی رہبر اور ایک کتاب سے صاحب دفتر بن گئی، آج مسلمانوں نے رسم و رواج کو دین بنا لیا ہے، اور کافروں کے طور طریقے اختیار کر لیے ہیں، اگر وہ مسلمان ہو کر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو قرآن پر عمل کیے بغیر ممکن نہیں۔

ہستی مسلم ز آئین است و بس　　باطن دین نبی این است و بس

تو ہمی دانی کہ آئین تو چیست　　زیر گردوں سرِ تمکین تو چیست

آں کتاب زندہ قرآن حکیم　　حکمتِ او لایزال است و قدیم

نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات　　بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

نوعِ انساں را پیامِ آخریں　　حاملِ او رحمۃ للعالمینؐ

ارج می گیرد ازو نا ارجمند　　بندہ را از سجدہ سازد سربلند

رہزناں از حفظِ او رہبر شدند　　از کتابے صاحبِ دفتر شدند

اے گرفتارِ رسوم ایمانِ تو　　شیوہ ہائے کافری زندانِ تو

گر تو می خواہی مسلماں زیستن　　نیست ممکن جز بقرآں زیستن

(رموز بیخودی)

ایک دوسرے مقام پر کہتے ہیں:-

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات　　در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات

می دہد ما را پیامِ لاتخف　　تا رساند بر مقامِ لاتخف

قوتِ سلطان و میر از لا الٰہ　　ہیبتِ مردِ فقیر از لا الٰہ

تا دو تیغ لا و الا داشتیم　　ما سوا اللہ را نشاں نگذاشتیم

اگر دنیا میں ثبات چاہتے ہو تو قرآن سے فائدہ اٹھاؤ، اس میں آبِ حیات پوشیدہ ہے، وہ مسلمانوں کو لاتخف کا پیام دیکر ساری دنیا سے بے خوف کر دیتا ہے، سلاطین و امرا کی قوت اور مرد فقیر دونوں کی ہیبت کا سرچشمہ لا الٰہ ہے، جب تک ہمارے ہاتھ میں لا و الا کی تلواریں رہیں ہم نے ما سوی اللہ کا نام و نشان مٹا دیا

شریعت اسلامیہ | اسلام میں اصل قانون ساز اللہ تعالیٰ ہے اور اسی کو اختیار ہے کہ

حاصل ہے، اسلامی حکومت کا کام صرف قانونِ الٰہی کا نفاذ ہے، اقبال نے اس کی یہ حکیمانہ توجیہ کی ہے، جو حقیقت بھی ہے کہ انسانی عقل محدود اور انسانی فطرت خود غرض واقع ہوئی ہے، وہ انسانوں کی حال و مستقبل کی تمام ضروریات کا ادراک نہیں کر سکتی، اس لیے ایسا جامع قانون نہیں بنا سکتی جو ان کی جملہ دینی و دنیوی اور مادی و روحانی ضروریات کا کفیل ہو، اس لیے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین آئے دن بدلتے رہتے ہیں، اور چوں کہ انسان کی فطرت خود غرض ہے، اس لیے اسکے قوانین بھی خود غرضی پر مبنی ہوتے ہیں، ہر قوم اپنے مفاد کے مطابق قانون بناتی ہے، اس کو دوسرے انسانوں کے فائدے اور نقصان سے کوئی بحث نہیں ہوتی بعض مذاہب میں تو ایک ہی قوم کے مختلف طبقوں کیلیے الگ الگ قوانین ہوتے تھے جس کی زندہ مثال ہندوستان ہے، آزادی اور جمہوریت کے اس دور میں بھی بین الاقوامی معاملات میں قانون کی نہیں، بلکہ طاقت کی حکومت ہے۔ اور طاقتور خود غرض قوموں کے ہاتھوں بین الاقوامی قوانین اور اس کی مجالس کا جو حشر ہو رہا ہے، وہ سب کو معلوم ہے، پھر انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین صرف دنیاوی معاملات تک محدود ہوتے ہیں، ان کو اخلاقی اور روحانی ضروریات سے کوئی بحث نہیں ہوتی،

مگر اللہ تعالیٰ عادل بھی ہے اور سمیع و بصیر بھی، اس کی نظر حال و مستقبل سب پر ہے، اس کی نگاہ میں سارے انسان برابر ہیں، اس لیے وہی ایسا قانون بنا سکتا ہے، جو تمام انسانوں کے لیے منصفانہ بھی ہو اور ان کی جملہ ضروریات پر حاوی بھی، اس قانون کی بنیاد وحی پر ہے، جس کا نام شریعت ہے، اور اس کی قوتِ نافذہ کا نام حکومتِ الٰہیہ ہے۔

بندۂ حق مرد آزاد است و بس — ملک و آئینش خداداد است و بس

رسم و راہ و دین و آئینش ز حق — زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر — سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر

وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ — در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف — وصل و فصلش لایراعی لایخاف

غیرِ حق چوں ناہی و آمر شود — زور ور بر ناتواں قاہر شود
(جاوید نامہ)

ایک دوسرے موقع پر ایک اور حکیمانہ توجیہ کی ہے کہ خود غرضی کی بنا پر انسان میں اپنے حقیقی نفع و نقصان کا احساس بہت کم ہوتا ہے، وہ اچھے برے کاموں میں امتیاز نہیں کر سکتا۔ انقلاب کے ہنگامے سے ڈرتا ہے، آقا غریب مزدور کی روزی پر قبضہ کر لیتا اور اس کی عزت و آبرو تک اتار لیتا ہے، اس کے ظلم و ستم سے غریب مزدور نالاں ہیں، ان کے جام و سبو بادۂ عیش و مسرت سے خالی ہیں، انھوں نے دوسروں کے لیے بڑے بڑے محل تعمیر کیے ہیں، مگر خود گلی گلی کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں،

آدمی اندر جہانِ خیر و شر — کم شناسد نفعِ خود را از ضرر

کس نداند زشت و خوبِ کار چیست — جادۂ ہموار و ناہموار چیست

در نگاہش ناصواب آمد صواب — ترسد از ہنگامہائے انقلاب

خواجہ، نانِ بندۂ مزدور خورد — آبروے دخترِ مزدور برد

در حضورش بندہ می نالد چو نے — بر لبِ او نالہائے پے بہ پے

نے بجامش بادہ و نے در سبو — کاخہا تعمیر کرد و خود بکو

اس کے مقابلہ میں شریعت اسلامیہ دل کی گہرائی سے ابھرتی ہے، اور ایسا

اخلاقی احساس پیدا کر دیتی ہے کہ انسان حلال و حرام میں امتیاز کرنے لگتا ہے۔ اور کائنات شریعت کے نور سے منور ہو جاتی ہے، اگر دنیا کے لوگ اس کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام سمجھ لیں تو قیامت تک اس کا نظام مستحکم ہو جائے، اس کے احکام عدل و انصاف اور تسلیم و رضا پر مبنی ہیں، اور اس کا سرچشمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، اسلئے جہاں تک ہو سکے اس کے حکم سے سرتابی نہ کرو تاکہ دوسرے تمہارے حکم سے سرتابی نہ کریں، شریعت کے ذریعہ احسن التقویم اور حضرت ابراہیم ؑ کے ایمان کے وارث بن جاؤ۔

شرع می خیزد ز اعماقِ حیات | روشن از نورش ظلامِ کائنات
گر جہاں داند حرامش را حرام | تا قیامت پختہ ماند ایں نظام
حکمش از عدل و تسلیم و رضاست | بیخ او اندر ضمیرِ مصطفےٰ است
تا توانی گردن از حکمش مپیچ | تا نہ پیچد گردن از حکم تو ہیچ
از شریعت احسن التقویم شو | وارثِ ایمانِ ابراہیمؑ شو

(مسافر)

ایک مقام پر شریعت اسلامیہ کی حقیقت اور اس کے حکم و مصالح کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے۔

در شریعت معنی دیگر مجو | غیر ضو در باطنِ گوہر مجو
ایں گہر را خود خدا گوہر گراست | ظاہرش گوہر بطونش گوہر است
علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست | اصل سنت جز محبت ہیچ نیست
فرد را شرع است مرقاتِ یقیں | پختہ تر از وے مقاماتِ یقیں
ملت از آئینِ حق گیرد نظام | از نظامِ محکمے خیزد دوام

قدرت اندر علم او پیدا ستے — ہم عصا و ہم یدِ بیضا ستے
با تو گویم سرِّ اسلام است شرع — شرع آغاز است و انجام است شرع
شارعِ آئین شناسِ خوب و زشت — بہرِ تو یک نسخۂ قدرت نوشت
از عمل آہن عصب می سازدت — جائے خوبے در جہاں اندازدت
خستہ باشی استوارت می کند — پختہ مثلِ کہسارت می کند
ہست دینِ مصطفیٰ دینِ حیات — شرعِ او تفسیرِ آئینِ حیات
گر زمینی آسماں سازد ترا — آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا
صیقلش آئینہ سازد سنگ را — از دلِ آہن رباید زنگ را
(رموزِ بیخودی)

یعنی شریعت کا ظاہر و باطن ایک ہے، گوہر کی طرح شریعت کے ظاہر و باطن میں صرف روشنی ہی روشنی ہے۔ اس گوہر کا جوہری خود خدائے قدوس ہے، اس کا ظاہر بھی گوہر تاب ہے اور باطن بھی، علم حق، شریعت کے سوا اور کوئی چیز نہیں، اور سنت رسول صرف آپ کی محبت و اتباع کا نام ہے، شریعت ہی یقین کا ذریعہ ہے، اسی سے ایمان و یقین میں پختگی آتی ہے، ملت اسلامیہ میں اسی آئین حق سے نظام قائم ہوتا ہے، اور ایک محکم نظام ہی سے اس کو استحکام و دوام حاصل ہوتا ہے۔ اس کے علم میں یہ قدرت ہے کہ وہ عصائے موسیٰ بھی ہے اور ید بیضا بھی، اسلام کا راز صرف شریعت میں پوشیدہ ہے، اس کی ابتدا و انتہا سب شریعت ہے، خوب و زشت اور خیر و شر کے آئین شناس نے مسلمانوں کے لیے یہ نسخہ لکھا ہے، اس پر عمل اعصاب کو فولاد بنا دیتا ہے اور دنیا میں سربلند کرتا ہے، کمزور کو طاقتور، اور پہاڑ کی طرح مضبوط کر دیتا ہے، دین مصطفیٰ ایک حیات بخش دین ہے اور اس کی شریعت اس آئین حیات کی تفسیر ہے،

جو گرے ہوئے پست دپامال کو آسمان کا ہم دوش اور اپنی جلا سے لوہے میں پیوست زنگ کو دور اور پتھر کو آئینہ بنا دیتی ہے۔

خدا کا یہ آخری پیغام تنہا مسلمانوں کے لیے نہیں، بلکہ دنیا کی ساری قوموں کے لیے تھا، اس کی دعوت عام تھی، اس کا مقصد پورے عالم انسانیت کی اصلاح تھی، اسلیے ملت اسلامیہ اس پیام کی حامل و مبلغ قرار پائی، اور جب طرح اسلام پر خدا نے سلسلۂ ہدایت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر سلسلۂ نبوت کا خاتمہ کر دیا، اسی طرح دنیا کی ہدایت و رہنمائی کا منصب مسلمانوں کے سپرد کر کے ہمیشہ کے لیے نئی ملتوں کا خاتمہ کر دیا، اور اب خدا کے کسی نئے پیغام کی حامل کوئی قوم پیدا نہ ہوگی۔

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد	بر رسول ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفل ایام را	اُو رسل را ختم و ما اقوام را
خدمت ساقی گری با ما گذاشت	داد ما را آخریں جامے کہ داشت
مسلم از مینائے حق صہبا کشد	نعرۂ "لا قوم بعدی" می زند

(رموز بیخودی)

اس انقلاب انگیز پیغام کے نتائج اسلام کے ظہور کے وقت ساری دنیا ظلمت کدہ تھی، توحید و خدا شناسی کا نام مٹ چکا تھا۔ اشرف المخلوقات کی جبین نیاز شجر و حجر تک کے سامنے سجدہ ریز تھی، اخلاق و روحانیت کی شمعیں گل ہو چکی تھیں، اگر کسی راہب کی جھونپڑی میں کوئی چراغ ٹمٹماتا تھا تو دوسروں کو روشنی پہنچانے سے قاصر تھا۔ عدل و انصاف ختم ہو چکا تھا، دنیا میں صرف قوت اور ظلم کی حکومت تھی، خدا کی مخلوق نسل و نسب اور دولت و غربت کے اعتبار سے ادنیٰ و اعلیٰ طبقوں میں بٹی ہوئی تھی، ہر ادنیٰ اور کمزور اپنے سے اعلیٰ اور طاقتور طبقہ کا غلام تھا، فسق و فجور کی گرم بازاری تھی، اسلام

ان سب کے خلاف اعلان جنگ تھا ، اس کا مقصد توحید و خدا شناسی اور اخلاق و روحانیت کا احیاء ، عدل و مساوات اور انسانی شرف و عظمت کا قیام تھا ، اسلام کی سحر آفرینی نے چند برسوں کے اندر گمراہ انسانوں کی کایا پلٹ دی ، اس کے ابر کرم سے انسانیت کی سوکھی کھیتی ہری ہو گئی ، اس نے نہ صرف دینی و اخلاقی حیثیت سے انسانیت کی اصلاح کی ، بلکہ اس کو تہذیب و تمدن کا بھی سبق پڑھایا اور امت اسلامیہ پوری دنیا کی معلم و امام بن گئی ، اور اس کو علم و عرفان کے نور سے معمور کر دیا ، اقبال نے اسلام کے برپا کیے ہوئے اس انقلاب اور دنیا میں اس کی برکتوں کو متعدد نظموں میں بیان کیا ہے ، بعض نظموں کے کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں :

ایک نظم میں عربوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں :-

رمز الا اللہ کرا آموختند — ایں چراغ اول کجا افروختند
علم و حکمت ریزۂ از خوان کیست — آیۂ فاصبحتم اندر شان کیست
از دم سیراب آں امی لقب — لالہ رست از ریگ صحرائے عرب
حریت پروردۂ آغوش اوست — یعنی امروز امم از دوش اوست
او دلے در پیکر آدم نہاد — او نقاب از طلعت آدم کشاد
ہر خداوند کہن را او شکست — ہر کہن شاخ از نم او غنچہ گشت
علم و حکمت شرع و دیں نظم امور — اندرون سینہ دلہا صبور
حسن عالم سوز الحمرا و تاج — آنکہ از قدوسیاں گیرد خراج
ایں ہمہ یک لحظہ از اوقات اوست — یک تجلی از تجلیات اوست
ظاہرش ایں جلوہ ہائے دلفروز — باطنش از عارفاں پنہاں ہنوز

مصطفیٰ مدحِ رسولِ پاک را آنکہ ایماں داد مشتِ خاک را

خدا نے توحید کا رمز کس کو سکھایا اور سب سے پہلے یہ چراغ کہاں روشن کیا، علم و حکمت کس کے دسترخوان کا ریزہ ہے، آیۂ فاصدعم کس کی شان میں نازل ہوئی ہے، اس امی لقب کی آبیاری سے ریگستان عرب میں لالہ کا چمن کھل گیا، آزادی و حریت آپ کے آغوش کی پروردہ ہے، آج جس انسانی آزادی کی صدا بلند ہے وہ بہت پہلے عرب میں بلند ہو چکی ہے، آپ نے آدم کے پیکر میں ایک نیا دل رکھ دیا اور اسکے جمال کی پردہ کشائی کی، پرانے سارے دیوتاؤں کا طلسم توڑ دیا، خشک پرانی شاخوں میں غنچے پھوٹنے لگے، علم و حکمت، دین و شریعت، نظم و انتظام، الحمرا و تاج جیسی عمارتیں جو صدیوں سے خراج تحسین وصول کرتی ہیں، ان کی سیکڑوں تجلیوں میں سے ایک تجلی ہیں، یہ دلفریب جلوے تو اس کا ظاہر ہیں، اس کا باطن عارفوں کی نگاہ سے بھی پوشیدہ ہے۔

اس سے زیادہ واضح تصویر ابوجہل کے نوحہ میں نظر آتی ہے، وہ حرم کعبہ میں فریاد کرتا ہے:

سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ از دمِ اُو کعبہ را گل شد چراغ

از ہلاکِ قیصر و کسریٰ سرود نوجواناں را ز دستِ ما ربود

ساحر و اندر کلامش ساحری است ایں دو حرفِ لا الٰہ خود کافری است

پاش پاش از ضربتش لات و مناۃ انتقام از وے بگیر اے کائنات

دل بغائب بست و از حاضر گسست نقشِ حاضر را فسونِ او شکست

دیدہ بر غائب فروبستن خطاست آنچہ اندر دیدہ می ناید کجاست

ہم شدن بیش خدائے بے جہات	بندہ باز و قے دخشد ایں صلوٰۃ
مذہب او قاطعِ ملک و نسب	از قریش و منکر از فضل عرب
در نگاہ او یکے بالا و پست	با غلام خویش بر یک خوان نشست
قدر احرارِ عرب نشناختہ	با کلفتانِ حبش در ساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند	آبروئے دودمانے ریختند
ایں مساوات ایں مواخات اعجمیست	خوب می دانم کہ سلماں مزدکی است
ابن عبد اللہ فریبش خوردہ است	رستخیزے بر عرب آوردہ است
اعجمی ، ا اصل عدنانی کجاست	گنگ را گفتار سحبانی کجاست
اے ہبل اے بندہ را پوزش پذیر	خانہ خود را ز بے کیشاں بگیر
اے مناۃ اے لات ازیں منزل مرو	گر ز منزل می روی از دل مرو

یعنی ہمارا سینہ محمد کی وجہ سے داغ داغ ہے ، انھوں نے کعبہ کا چراغ گل کر دیا ، قیصر کسریٰ کی ہلاکت کی صدا بلند کی ، ہمارے نوجوانوں کو ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا ، وہ ساحر ہیں ، انکی باتوں میں ساحری ہے ، کلمۂ لا الہ خود کافری ہے ، ان کی ضرب سے لات و مناۃ پاش پاش ہو گئے ، کائنات اس کا انتقام لے ، دلوں کا رشتہ حاضر سے توڑ کر غائب سے جوڑا ، ان کے افسوں نے حاضر کا نقش توڑ دیا ، غائب سے دل لگانا بہت بڑی غلطی ہے ، جو چیز دیکھنے میں نہ آئے اس کا وجود کہاں ؟ خدائے بے جہات کے سامنے سر جھکانے سے کیا حاصل ، ایسی نماز سے کوئی ذوق پیدا نہیں ہو سکتا ، ان کا مذہب ملک و نسب کا قاطع اور قریش اور عرب کی فضیلت کا منکر ہے ، ان کی نگاہ میں ادنیٰ و اعلیٰ سب ایک ہیں ، وہ اپنے غلام کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھکر کھانا کھاتے ہیں ، افسوس انھوں نے عرب کے

اشراف کی قدر نہ پہچانی اور حبشہ کے حبشیوں کو سر چڑھایا، کالے کلوٹوں اور سرخ وسپید کو برابر کرکے اونچے خاندانوں کی آبرو برباد کی، یہ مساوات و اخوت تو سراسر عجمی ہے، سلمان تو مزدکی ہے، ابن عبداللہ نے اس کے فریب میں آکر عربوں میں حشر برپا کر دیا، عجمی شرف نسب میں عرب کو کہاں پہنچ سکتے ہیں، کج مج زبانوں میں سحبان کی طلاقت لسانی کہاں سے آسکتی ہے۔ اے ہبل اے اپنے بندوں کی معذرت قبول کرنے والے ان لامذہبوں سے اپنا گھر چھین لے، اے مناۃ! اے لات! اس گھر سے نہ نکلو، اور اگر گھر سے نکلتے ہو تو دلوں سے نہ نکلو۔

اگرچہ اس نوحہ میں اسلام کی اہم انقلابی تعلیمات آگئی ہیں، لیکن حق یہ ہے کہ اس کا سب سے جامع مرقع مولانا حالی نے دکھایا ہے۔ اس موقع پر اس کو نقل کیے بغیر آگے بڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔

گھٹا اک پہاڑوں سے بطحا کے اٹھی — پڑی چار سو یک بیک دھوم جس کی
کڑاک اور دمک دور دور اس کی پہنچی — جو ٹیگس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

کیا امیوں نے جہاں میں اجالا — ہوا جس سے اسلام کا بول بالا
بتوں کو عرب اور عجم سے نکالا — ہر اک ڈوبتی ناؤ کو جا سنبھالا

زمانے میں پھیلائی توحید مطلق
لگی آنے گھر گھر سے آواز حق حق

ہوا غلغلہ نیکیوں کا بدوں میں — پڑی کھلبلی کفر کی سرحدوں میں

ہوئی آتش افسردہ آتشکدوں میں   لگی خاک سی اڑنے سب معبدوں میں

ہوا کعبہ آباد سب گھر اجڑ کر
جمے ایک جا سارے دنگل بچھڑ کر

لیے علم و فن ان سے نصرانیوں نے   کیا کسب اخلاق روحانیوں نے
ادب ان سے سیکھا صفاہانیوں نے   کہا بڑھ کے لبیک یزدانیوں نے

ہر اک دل سے رشتہ جہالت کا توڑا
کوئی گھر نہ دنیا میں تاریک چھوڑا

ارسطو کے مردہ فنوں کو جلایا   فلاطون کو زندہ پھر کر دکھایا
ہر اک شہر و قریہ کو یوناں بنایا   مزا علم و حکمت کا سب کو چکھایا

کیا بر طرف پردہ چشم جہاں سے
جگایا زمانہ کو خواب گراں سے

ہر اک علم کے فن کے جویا ہوئے وہ   ہر اک کام میں سب سے بالا ہوئے وہ
فلاحت میں بے مثل و یکتا ہوئے وہ   سیاحت میں مشہور دنیا ہوئے وہ

ہر اک ملک میں ان کی پھیلی عمارت
ہر اک قوم نے ان سے سیکھی تجارت

کیا جا کے آباد ہر ملک ویراں   مہیا کیے سب کے راحت کے ساماں
خطرناک تھے جو پہاڑ اور بیاباں   انھیں کر دیا رشک صحن گلستاں

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انھی کی لگائی ہوئی ہے

(باقی)

کُلّ مَولُودٍ یُولَدُ علی الفطرۃ (الحدیث) کا مفہوم

(علامہ ابنِ عبدالبر کی کتاب التمہید کا ایک ورق)

از

ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

دوسرا مفہوم دوسری جماعت کے نزدیک فطرت سے اسلام مراد ہے، یہ لوگ کہتے ہیں کہ علمائے سلف سے اس کی یہی توجیہ مشہور و معروف ہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد (فطرۃ اللہ التی فطر النّاس علیھا) کے متعلق سب کا اتفاق ہے کہ اس میں "فطرۃ اللہ" سے دین اللہ یعنی الاسلام مراد ہے، خود راوی حدیث حضرت ابوہریرہؓ نے اس کو بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ (اقرؤا ان شئتم فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا) عکرمہ، مجاہد، حسن، ابراہیم، ضحاک، اور قتادہ رحمھم اللہ سے اس کی یہی تاویل منقول ہے، نیز ان حضرات نے (لاتبدیل لخلق اللہ) کی تفسیر لا تبدیل لدین اللہ سے کی ہے،

ان لوگوں نے اپنی رائے کے ثبوت میں عیاض بن حماد مجاشعی کی وہ حدیث بھی پیش کی ہے جو اوپر گذر چکی ہے کہ آپ نے فرمایا،

(الا احدثکم بما حدثنی اللہ فی الکتاب ان اللہ خلق آدم و بنیہ

حُنفاء مُسلمین)

یہ ایک طویل حدیث ہے، متعدد لوگوں نے اُس کی روایت کی ہے لیکن اکثر روایتوں میں صرف "حنفاء" کا لفظ ہے، اور "مسلمین" کا ذکر نہیں ہے[1]

اہلِ تفسیر نے حنفاء کی مختلف تفسیریں کی ہیں، لیکن درحقیقت یہ صرف لفظی اختلاف ہے ورنہ سب کا ماحصل یہ ہے کہ حنیفیت سے مراد اسلام ہے، اس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے کہ

ما کان ابراھیم یھودیا ولا نصرانیا ولکن کان حنیفا مُسلمًا، (آل عمران ۶۷)	ابراہیم یہودی اور نصرانی نہیں تھا، بلکہ حنیف (سب جھوٹے مذہبوں سے بیزار اور خدائے تعالیٰ کا) حکم بردار تھا،

دوسری جگہ فرمایا:-

ھو سماکم المسلمین، (حج - ۷۸)	اسی (اللہ یا ابراہیمؑ) نے تم لوگوں کا نام مسلمان (تابعدار) رکھا،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے "حنفاء مسلمین" کی روایت کی ہے وہ بھی درست ہے، اس پر رد و انکار کے کوئی معنی نہیں، راعی کا شعر ہے:-

أخلیفة الرّحمٰن انّا معشر حنفاء نسجد بکرة واصیلا

---

[1] علامہ ابن عبد البر نے اس موقع پر اس حدیث کے متعلق طویل فنی بحث کی ہے، اور دونوں قسم کی روایتوں کو صحیح قرار دیا ہے

عصب نری اللہ فی اموالنا حق الزکوٰۃ منزلاً تنزیلا

(ترجمہ) "اے خدائے رحمان کے خلیفہ! ہم حنفا (مسلمانوں) کی جماعت ہیں، جو صبح وشام خدا کی عبادت کرتے ہیں، اور ہم عربی ہیں، جو اپنے مالوں میں زکوٰۃ کو برحق اور منزل من اللہ فریضہ سمجھتے ہیں"

حضرت ابراہیمؑ کو حنیف کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے والد اور قوم کے معبودوں سے برگشتہ ہوکر خدائے واحد کی عبادت اور بندگی کی طرف یکسو ہوکر مائل ہوگئے تھے، کیونکہ "حنف" کے اصلی معنی میل ہی کے ہیں،

فطرت سے اسلام مراد لینے والوں کی ایک دلیل یہ حدیث بھی ہے،

خمس من الفطرۃ فذکر منھن قص الشوارب و الاختتان[1]	پانچ چیزیں امور فطرت میں شامل ہیں، پھر آپ نے اس سلسلہ میں مونچھیں کاٹنے اور ختنہ کرانے کا ذکر کیا،

کیونکہ یہ سب امور اسلام کے سنن وآداب میں داخل ہیں:۔

جن لوگوں نے فطرت سے اسلام مراد لیا ہے، ان میں حضرت ابوہریرہؓ اور ابن شہاب زہری بھی ہیں، چنانچہ حضرت ابوہریرۃؓ سے ایک ایسے آدمی کے متعلق جس پر ایک مومن غلام آزاد کرنا لازم تھا پوچھا گیا کہ کیا ایک دودھ پینے والے بچے کو آزاد کردینا کافی ہوگا، تو انھوں نے جواب دیا کہ ہاں کافی ہوجائے گا، اس لئے کہ وہ فطرت یعنی اسلام پر پیدا ہوا ہے[2]، اس

---

[1] یہ حدیث صحیحین اور مسند احمد وغیرہ میں الفاظ کے اختلاف کے ساتھ وارد ہے بعض روایتوں میں خمس (پانچ) کے بجائے عشرۃ (دس) چیزوں کو خصائل فطرت میں گنایا گیا ہے، [2] زہری سے یہاں تک

قول کے مطابق حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ بچہ کفر و شرک سے بالکل محفوظ و مصئون اور روز ازل کے میثاق کے مطابق مومن و مسلم پیدا ہوتا ہے،

ہمارے نزدیک فطرت سے اسلام مراد لینا صحیح نہیں ہے[1] اس لئے کہ ایمان و اسلام درحقیقت قلب کے اعتقاد و اذعان زبان کے اقرار اور اعضاء و جوارح کے عمل و فعل کا نام ہے، اور ایک بچے کے اندر یہ صلاحیت بالکل معدوم ہوتی ہے،

فطرت کا تیسرا مفہوم | کچھ لوگوں نے فطرت کے معنی بدائت (آغاز، ابتداء) کے لئے ہیں[2] ان کے نزدیک بچہ اس بدأت پر پیدا ہوتا ہے جس کو اول اول اللہ نے اس کے لئے مقرر کیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ مخلوق کے لئے ابتداء ہی میں شقاوت و سعادت، موت و حیات اور اس چیز کا جس کو وہ آئندہ اختیار کرنے والی ہے متعین کر دیتا ہے، اور جس چیز پر اس کی ابتداء کر دی گئی ہے، اس سے اُس کو کوئی مفر نہیں،

کلام عرب میں فطرت بدأت کو اور فاطر مبدی، و مبتدی کو کہتے ہیں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ مجھے فاطر السمٰوات والارض کے معنی اس وقت معلوم ہوئے جب دو بدو ایک کنوئیں کے بارے میں جھگڑا کرتے ہوئے میرے پاس آئے، ان میں سے ایک نے کہا کہ انا فطرتھا ای ابتدأتھا (میں نے اس کو پہلے کھودا اور بنایا تھا) پس فطرت

(بقیہ حاشیہ ص　) منقول ہے کہ ہر بچہ کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی، اس لئے کہ وہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوا ہے (فتح الباری ج ۳ ص ۲۹۰) وشفاء العلیل ص ۲۸۵، [1] علامہ ابن تیمیہ کے نزدیک فطرت سے اسلام مراد ہے، اور انھوں نے علامہ ابن عبدالبر کے مفہوم کی پرزور تردید کی ہے، (شفاء العلیل ص　) [2] امام خطابی اور علامہ ابن قتیبہ نے اسی معنی کو ترجیح قرار دیا ہے (معالم السنن ج ۴ ص ۳۲۷ و تاویل مختلف الحدیث ص ۱۵۹)

کے معنی بدأت کے ہوئے، جیساکہ اس آیت میں ہے،

کما بدأکم تعودون فریقاً هدی وفریقاحق علیهم الضلالة،	اللہ نے جیسا تمھارا آغاز کیا ہے، ویسے ہی دوبارہ پلٹو گے، ایک فرقہ کو ہدایت کی، اور ایک فرقہ پر ضلالت مقرر کی،

(اعراف، ۲۹)

حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ وہ اپنی دعاؤں میں فرماتے تھے،

اللّٰھُمَّ جبار القلوب علیٰ فطرتها شقیها وسعیدها.	اے دلوں کو اس کی ابتدا، یعنی شقاوت وسعادت پرمجبور کرنے والے خداوند!

اس معنی کی رو سے حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ شقاوت وسعادت میں سے جس چیز پر اللہ نے بچے کی ابتدا کی ہے، اسی پر وہ پیدا ہوتا ہے، ابوعبداللہ محمد بن نصر مروزی کا بیان ہے کہ امام احمد بھی پہلے اسی کے قائل تھے، مگر بعد میں انھوں نے اس سے رجوع کرلیا تھا،[1] موسیٰ بن عبیدہ کا بیان ہے کہ میں نے محمد بن کعب سے (کما بدأکم تعودون الخ) کی یہ تشریح سنی ہے کہ

---

[1] علامہ ابن قیمؒ نے امام احمد سے اس بارہ میں تین روایتیں نقل کی ہیں، (۱) اس سے معرفت الٰہی کا اقرار اور وہ عہد مراد ہے جو اللہ نے بنی آدم سے اُن کی اولین تخلیق کے موقع پر لیا تھا، ہر بچہ اسی اقرار اول پر پیدا ہوتا ہے، (۲) دوسری روایت کے مطابق اس سے مرتشکم مادہ میں انسان کی ابتدائے خلقت ہے، علی بن سعید نے امام صاحب سے "کل مولود یولد" کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ شقاوت وسعادت پر بچے کی تخلیق ہوتی ہے، (۳) امام صاحب سے تیسرا قول توقف

"اللہ نے جس شخص کی خلقت کی ابتدا ضلالت پر کی ہے وہ بالآخر ضلالت ہی کی طرف جائے گا، خواہ وہ ہدایت ہی کے کام کیوں نہ کرے، اور جس کی تخلیق کی ابتدا ہدایت پر کی ہے، اُس کو (آخرکار) اللہ ہدایت کی جانب لے جائے گا، خواہ وہ ضلالت ہی کے کام کیوں نہ کرے"

چنانچہ ابلیس کی خلقت کی ابتدا ضلالت پر کی گئی تھی، اور باوجود یکہ اُس نے دوسرے ملائکہ کی طرح نیکی کے کام کیئے تھے، لیکن بالآخر وہ ضلالت کی جانب پھیر دیا گیا، کیونکہ اسی پر ابتداءً اس کی تخلیق ہوئی تھی، اسی لئے اس کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ:-

وکان من الکافرین،

(بقرہ ۵ - ۳۴) اور وہ ابلیس کافروں میں سے تھا

(بقیہ حاشیہ ص سابق) کا مروی ہے،

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ اور خود حافظ ابن قیم کا رجحان یہ ہے کہ امام احمد کے نزدیک فطرت سے دین اسلام مراد ہے، گویا یہ وہی بات ہے جس کا پہلی روایت میں ذکر ہے، اور اگر اس سے مختلف بات ہے تو امام صاحب کی اس سلسلہ میں چار روایتیں ہو جائیں گی،

اس سلسلہ میں امام ابن قیم نے ایک لطیف نکتہ کی نشاندہی کی ہے، وہ فرماتے ہیں:-

فابواہ یہودانہ وینصرانہ ویمجسانہ کے متعلق یہ سمجھنا کہ اس میں محض بچوں کے دنیا کے احکام کا ذکر ہے، اور والدین کی فطرت میں تبدیلی کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے، درست نہیں ہے، یہ بات حدیث کے منشاء و مدلول کے بالکل خلاف ہے کیونکہ آپ نے والدین کی بچوں کی تکفیر کو جدع بہائم کے مشابہ قرار دیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک تغییر دوسری تغییر کے مماثل ہے، (شفاء العلیل ص ۲۹۶)

اس کے مقابلہ میں ساحرین مصر کی تخلیق کی ابتدا ہدایت پر ہوئی تھی، اور گو انھوں نے ضلالت کے کام کئے مگر آخر میں اللہ نے ان کو ہدایت وسعادت کی توفیق عطا فرمائی، اور وہ مومن ہو کر مرے، "کما بدأکم تعودون" کا یہ مفہوم متعدد کبار تابعین سے مروی ہے،

فطرت کا یہ مفہوم بیان کرنے والے اس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ

عن ابی محمد رجل من اہل المدینۃ قال سألت عمر بن الخطاب عن قولہ عزوجل (واذ اخذ ربک من بنی آدم الخ) فقال سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کما سألتنی فقال: خلق اللہ آدم بیدہ ونفخ فیہ من روحہ ثم اجلسہ ومسح ظہرہ فاخرج منہ ذروا قال ذرو ذرأ نہم	مدینہ کے ایک شخص ابو محمد نے بیان کیا کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب سے واذ اخذ ربک الخ کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے کہا کہ جس طرح تم نے مجھ سے اس کے متعلق سوال کیا ہے، اسی طرح میں نے بھی رسول اللہ سے اس کے بارہ میں سوال کیا تھا، تو آپ نے فرمایا کہ اللہ نے حضرت آدم کو پیدا کیا، اور اُن کے اندر اپنی روح پھونکی پھر اُن کو بٹھایا، اور اُن کی پشت

یہ حدیث حضرت عمرؓ کے علاوہ، حضرت علیؓ، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، ابو سعید خدریؓ، ابو ہریرہؓ، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمرو بن العاص، عائشہؓ، انس بن مالک، ابو موسیٰ اشعریؓ، عبادہ بن صامتؓ وغیرہ متعدد صحابہؓ اور بعض غیر مشہور صحابہ سے مروی ہے،

(شفا، ص ۱۰)

للجنۃ یعملون بما شئت من	پیچھے پھیر نیت ہے ایک بات
فعمل ختما ختو لھم با حسن	کو پیدا کر کے کہا کہ میں نے اِن
اعمالھم وا دخلھم الجنۃ	کو جنت کے لئے پیدا کیا ہے یہ
ثم مسح ظھرہ فاخرج ذریۃ	میری مشیت سے عمل کریں گے
فقال ذرو ذرا تھم للنار	پھر میں اُن کا خاتمہ بالخیر کروں گا
یعملون بما شئت من عمل	اور جنت میں داخل کروں گا، پھر
ثم اختم لھم بشر اعمالھم	اللہ اُن کی پشت پھیر کر ایک اَور
فادخلھم النار	جماعت کو نکال کر کہے گا کہ ان کو
	میں نے جہنم کے لئے بنایا ہے
	بھی میری مشیت سے کام کریں گے

اس قسم کی حدیث موطا میں مرفوعاً مروی ہے[1]، لیکن درحقیقت (کما بدأکم تعودون) یا مذکورہ بالا حدیث میں اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ بچہ مومن یا کافر پیدا ہوتا ہے، کیونکہ یہ بداہتہً عقل کے منافی ہے، پیدائش کے وقت بچوں میں کفر و ایمان کی فہم و تمیز کی بالکل صلاحیت نہیں ہوتی، رہی وہ حدیث جس میں لوگ کے مختلف طبقوں میں پیدا کئے جانے کا ذکر ہے، وہ قدح وطعن سے خالی نہیں علی بن زید بن جدعان اس کو روایت کرنے میں منفرد ہیں، شعبہ نے ان کے متعلق کہا ہے[2]، علاوہ ازیں اس کی تاویل یوں کی جاسکتی ہے کہ مومن و کافر پیدا کئے

---

[1] موطا کی روایت میں ابو محمد کے بجائے مسلم بن یسار جہنی کے حضرت عمرؓ سے سوال کرنے ذکر ہے، نیز اس کے آخر میں بعض اضافے ہیں۔ [2] امام احمد اور دوسرے ائمہ فن سے بھی

(حاشیہ بیچ میں عمودی: اس قسم کی حدیث ... ابو داؤد ... [illegible])

مطلب یہ ہے کہ آخر میں وہ مومن یا کافر ہوں گے، جیسا کہ اُن کے متعلق اللہ کا سابق علم ہے،

اسی طرح (خلقت ھؤلاء للجنۃ وخلقت ھؤلاء للنار) سے بجز لوگوں کے خاتمہ کے اور کسی بات کا ثبوت نہیں ملتا، پہلے ہم تحریر کر چکے ہیں کہ طفولیت کے زمانے میں بچہ جنت یا دوزخ کے استحقاق کے لائق یا کفر و ایمان کو سمجھنے کے قابل نہیں ہوتا،

چوتھا مفہوم | ایک جماعت کے نزدیک (کل مولود یولد علی الفطرۃ) کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو کفر و ایمان اور معرفت و انکار پر پیدا کیا ہے، چنانچہ ذریت آدم سے اس کی پیدایش ہی کے وقت اس کا عہد لیا گیا تھا کہ

الست بربکم،	کیا میں تم لوگوں کا رب نہیں ہوں،
(اعراف)	

تو لوگوں نے جواب میں بلے کہا یعنی کیوں نہیں؟ بیشک تو ہمارا رب ہے، لیکن اہلِ سعادت نے طوعاً اور اہلِ شقاوت نے کرہاً (بلی) کہا تھا، جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے،

ولہ اسلم من فی السموات والارض طوعاً وکرھاً،	اور اسی کے حکم میں خوشی یا لاچاری سے ہے، جو آسمانوں اور زمین میں ہے،
(آل عمران ۸۳)	

اور یہی بات (کما بدأکم تعودون) میں بھی کہی گئی ہے، مروزی کا بیان ہے کہ اسحق بن راھویہ کا یہی قول ہے، اور وہ استدلال میں حضرت ابوہریرہؓ کے اس قول کو پیش کرتے ہیں جو حدیث کے آخر میں مذکور ہے، اسحق فرماتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ کا

(بقیہ حاشیہ ص ۲۷۸) کی تصنیف منقول ہے، ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب ج ۲، ص ۲۲۲)

آیت لاتبدیل لخلق اللہ کو ذکر کرنے کا منشا یہ ہے کہ اللہ نے کفر و ایمان اور معرفت و انکار میں سے جس حالت میں بھی اولادِ آدم کو پیدا کیا ہے، اُس میں کوئی ردوبدل نہیں ہو سکتا، وہ واذ اخذ ربک من بنی آدم الخ سے اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ علماء کا اجماع ہے کہ اجساد سے پہلے اللہ نے ارواح کو گویائی عطا کر کے اُن سے اپنے رب ہونے کا اقرار لیا تھا، اور اس کی پوری تاکید کر دی تھی تاکہ کوئی عذر و حیلہ نہ کیا جا سکے، چنانچہ فرمایا،

ان تقولوا یوم القیامۃ انا	(یہ قول و قرار اس بنا پر ہے کہ)
کنا عن ھذا غافلین او تقولوا	تم قیامت کے دن یہ کہنے لگو کہ ہم کو
انما اشرک آباؤنا من قبل	تو اس کی خبر ہی نہ تھی، یا کہنے لگو
وکنا ذریۃ من بعدھم،	کہ ہمارے باپ دادوں نے ہم سے
(اعراف ۱۷۱، ۱۷۲)	پہلے شرک کیا اور ہم تو ان کے پیچھے
	ان کی اولاد ہیں،

ہمارے نزدیک اس آیت کی سب سے عمدہ تاویل وہ ہے جو عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور بعض دوسرے صحابۂ کرام سے مروی ہے کہ جب اللہ نے حضرت آدم کو جنت سے نکالنے سے پہلے ان کی پشت کے دائیں جانب سے موتی کی طرح سفید ایک ذریت نکالی، اور اس سے کہا کہ میری رحمت سے جنت میں داخل ہو جاؤ، اور پھر ان کی پشت کے بائیں جانب سے ایک سیاہ ذریت نکالی، اور اس سے کہا کہ تم لوگ جہنم میں داخل ہو جاؤ مجھے تمہاری پروا نہیں،[1] اسی حقیقت کی تعبیر دوسری جگہ اصحاب الیمین و اصحاب الشمال سے کی گئی ہے، پھر

[1] اس معنی کی روایت امام احمد نے اور ابن عساکر نے حضرت ابوالدرداءؓ سے کی ہے، امام سیوطی

ان سب سے عہد و میثاق لے کر اپنی ربوبیت کا اقرار کرایا، پہلی جماعت نے طوعاً اور دوسری جماعت نے کرہاً بطور تقیہ اقرار کیا، پھر اللہ نے اس پر اپنے کو اور ملائکہ کو گواہ بناتے ہوئے کہا: شہدنا ان تقولوا یوم القیامۃ انا کنا عن ھذا غافلین او تقولوا انما اشرک آباؤنا من قبل وکنا ذریۃ من بعدھم افتھلکنا بما فعل المبطلون، (اعراف ۱۷۲-۱۷۳)

اس مفہوم کو ماننے والے کہتے ہیں کہ تمام اولاد آدم کو اللہ کے رب ہونے کا علم وہیں حاصل ہے، جیسا کہ وله اسلم من فی السمٰوٰت والارض) سے ظاہر ہے، نیز یہ آیت اس کی گئی ہے کہ

قل فللہ الحجۃ البالغۃ فلو شاء ... تم کہدو کہ بس اللہ کا الزام پورا ہے اس

(بقیہ حاشیہ ص ۲۰۰) نے ابن عساکر کی روایت کو حسن قرار دیا ہے،

لجامع صغیر ج ۱ ص ۵۳۳

لہ شہدنا کے فاعل کے متعلق علامہ ابن عبد البر کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اور ملائکہ فاعل ہیں، آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جب اللہ اولاد آدم سے اپنی ربوبیت کا اقرار کرا چکے اور وہ اس کا اقرار کر لیں گے، تو اس کے بعد خدا اور ملائکہ کہیں گے کہ ہم تمہارے اس اقرار کے گواہ ہیں، تاکہ تم قیامت کے روز کوئی حیلہ حجت نہ کر سکو، لیکن عام مفسرین ذریت آدم کو فاعل مانتے ہیں، اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ کے استفسار (الست بربکم) کے جواب میں بنی آدم (بلیٰ شہدنا) کہیں گے، یعنی ہاں! تو ہمارا رب ہے ہم اپنے اس اقرار کے شاہد اور گواہ ہیں، اس کے بعد خدا تعالیٰ کہے گا کہ یہ اقرار و شہادت ہم نے اس لئے تم سے لی ہے تاکہ تم قیامت کے روز کوئی حیلہ حجت نہ کر سکو، یہ دونوں

لهدا کم اجمعین ..... اگر وہ چاہتا تو سب لوگوں کو
(الانعام - ۱۴۹) ہدایت دیدیتا۔

غلام خضر کے متعلق جو حدیث گذری ہے، اس سے بھی اسحٰق نے استدلال کیا ہے، کہ ایک ظاہر بین شخص کو تو اس میں وہی بات نظر آئے گی، جو حضرت موسیٰؑ نے فرمائی تھی، کہ (أقتلت نفسا زکیۃ) لیکن، اللہ نے حضرت خضر کو غلام کی اس فطرت سے آگاہ کر دیا تھا، جس پر وہ پیدا کیا گیا تھا، اسی لئے وہ جانتے تھے کہ اس کی تخلیق کفر پر کی گئی ہے اسی بنا پر حضرت ابن عباسؓ اس آیت کو اس طرح پڑھتے تھے:

واما الغلام فکان کافرا و | اور وہ جو لڑکا تھا، سو کافر تھا، اور اس کے
کان ابواہ مومنین[1] | ماں باپ مسلمان تھے،

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں کا حکم نہ بتلا دیا ہوتا تو لوگوں پر ان کا معاملہ مشتبہ رہ جاتا، اور وہ مومن و کافر بچوں میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ ان کو بچوں کی اس اصل جبلت کے متعلق کوئی واقفیت اور علم نہیں ہے، جس پر وہ پیدا کئے گئے ہیں، اس لئے آپ نے دنیا کے اندر بچوں کا معاملہ یہ کہکر کہ (فابواہ یہودانہ وینصرانہ ویمجسانہ) بالکل واضح کر دیا،

اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو بچوں کی اس اولین فطرت کی کوئی خبر نہیں ہے، جس پر وہ پیدا کئے گئے ہیں، اسی لئے دنیا میں ان کا وہی حکم، اور وہ معاملہ ہوگا جو ان

---

[1] یہ نا لیا قراءۃ ہوگی، بلکہ حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر ہوگی، اور اگر یہ قراءۃ ہے تو شاذ وشیبنا ہے، ظاہر ہے کہ اس کو مشہور ومعروف قراءت پر ترجیح نہیں دیا سکتی جو یہ ہے (واما الغلام فکان ابواہ مومنین)

کے والدین کا ہے، اُن کے کفر و ایمان کی تمیز کا ذریعہ اُن کے والدین ہوں گے، اگرچہ بچوں میں کا فرق ماں باپ کے درمیان ہے، تو ان کو بھی ان ہی میں شامل سمجھا جائے گا، اور اُن کے آیندہ کے معاملہ کو اللہ کے حوالہ کر دیا جائے گا، غلام کے واقعہ سے حضرت موسیٰؑ پر حضرت خضر کی یک گونہ فضیلت ثابت ہوتی ہے، کیونکہ اللہ نے جس علم خاص سے اُن کو نوازا تھا، اس کا حضرت موسیٰؑ کو علم نہیں تھا،

اسحٰق بن راہویہ کا یہ خیال صحیح نہیں ہے، کہ رسول اللہ صلعم نے بچوں کے معاملہ کو لوگوں سے بیان کر دیا ہے، اس باب میں روایات مختلف ہیں آگے ہم ان کو بالتفصیل تحریر کریں گے،

اسحٰق کی دلیل یہ بھی ہے کہ ایک انصاری بچہ کا انتقال ہوا، تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اس کو مبارک ہو یہ جنت کی کنجشک ہے لیکن رسول اللہ صلعم نے ان کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "تم کو کیا خبر؟ اللہ نے تو جنت اور دوزخ کے اہل پیدا کئے ہیں"[1]

غور کرنے سے اسحٰق اور ان کے ہمنوا لوگوں کی رائے کی دو نوعیتیں سامنے آتی ہیں، ایک تو یہ کہ اللہ نے جب بچوں کو پیدا کیا تو اس وقت اس کو اُن کے مومن و کافر ہونے کا علم تھا، جیسا کہ عقیدۂ قضا و قدر کا اقتضاء ہے کہ ہر چیز کی طرح بچوں کا معاملہ بھی علم الٰہی میں ہے، اور سن رشد و تمیز کو پہنچ جانے کے بعد جب اُن میں معرفت و انکار یا کفر و ایمان کے اعتقاد کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی، تو یہ جس کو چاہیں گے، اختیار کریں گے، اگر اسحٰق کے قول کا یہی مطلب ہے تو دراصل یہ وہی بات ہے جو ہم نے کہی ہے

[1] صحاح میں امام بخاری و ترمذی کے علاوہ سب نے اور امام احمد نے الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ اس حدیث کی تخریج کی ہے۔

ہے اگر اُن کا منشا یہ ہو کہ بچہ مومن و مسلم یا جاحد و منکر اور مشرک ہو کر پیدا ہوتا ہے تو یہ سراسر عقل و مشاہدہ کے خلاف ہے، اور عقل و مشاہدہ سے بڑھ کر معتبر اور صحیح کوئی علم نہیں ہے، (و اذ اخذ ربک من بنی آدم الخ) سے نہ اس دعویٰ کی تائید ہوتی ہے اور نہ ہمارے خیال کی تردید بلکہ اس سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ مخلوق کا حشر و انجام اللہ کے سابق علم کے مطابق ہوگا، ظاہر ہے کہ اس میں اہلِ حق کا کوئی اختلاف نہیں ہے، دراصل اختلاف مومنین اور کفار کے ان بچوں کے متعلق جو بچپن ہی میں مرجاتے ہیں، رہا وہ غلام جس کو حضرت خضر نے قتل کیا تھا تو بلا شبہ اسکے والدین مومن تھے، اب اگر وہ واقعی بچہ تھا اور اسکے متعلق بعض اہلِ علم کی یہ رائے صحیح نہیں ہے، کہ وہ بالغ ہو چکا تھا تو اسکی نوعیت ایک خاص معاملہ کی ہوگی، اس کی بنیاد پر مومن والدین کے چھوٹے بچوں کے متعلق کفر کا حکم نہیں لگایا جا سکتا، کیونکہ ان کے قتل کے جائز و مباح نہ ہونے پر تو امت کا اتفاق ہے، اس واقعہ کی تخصیص کے لئے اس قدر اشارہ کافی ہے، کہ جبریہ کے سوا تمام مسلمانوں اور اہلِ سنت کے جملہ فرقوں کا اتفاق ہے کہ مومنین کی اولاد جنت میں داخل کی جاے گی، اس لئے اس واقعہ سے اب کوئی استدلال نہیں کیا جا سکتا،

رہی حضرت عائشہؓ کی حدیث تو وہ ضعیف ہے، اس کو بیان کرنے میں طلحہ بن یحییٰ منفرد ہیں، اور محدثین نے اسی وجہ سے ان کی تضعیف کی ہے[1]

فطرت کی ایک اور توجیہ | اسحٰق کے قول کے اس دوسرے مفہوم کی اہلِ بصیرت نے نہ معتبر

---

[1] علامہ سیوطی نے بھی اس حدیث کو ضعیف بتایا ہے (جامع صغیر جلد ا ص ۲۴۳) اور طلحہ بن یحییٰ کے متعلق اہلِ فن کے اقوال مختلف ہیں، اکثر نے اس کی تضعیف کی ہے، امام بخاری نے منکر الحدیث کہا ہے، لیکن بعض علماء سے اُن کی توثیق بھی منقول ہے، (تہذیب ج ۵ ص ۲۸) امام مسلم نے ان کو ثقہ بیان کیا ہے نیز ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور احمد نے بھی اس کی روایت کی ہے اسی لئے اکثر علماء کے نزدیک یہ روایت صحیح ہے، آگے خود ابن عبد البر نے بھی اس کی تضعیف میں تامل کیا ہے،

سمجھا ہے، اور نہ علماے اہلسنت نے اس کو پسند کیا ہے، بلکہ یہ جبریہ کا قول ہے، ایک اور جماعت کے نزدیک فطرت اس میثاق کا نام ہے جو اللہ نے ذریت آدم سے اس کو دنیا میں بھیجنے سے پہلے اور آدمؑ کی پشت سے نکالے جانے کے دن لیا تھا، اور جس کا ذکر الستُ بربکم میں ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سب نے علم و معرفت کے ساتھ ربوبیت الٰہیہ کا اقرار کیا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے اسی معرفت و اقرار پر ان کو ان کے آبا کی صلب سے نکال کر دنیا میں بھیجا، لیکن یہ ایمان کی معرفت و اقرار کے بجائے اللہ کا وہ طبعی و فطری اقرار تھا، جس کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے قلوب میں جاگزیں کر دیا ہے، پھر جب اس نے اپنے رسولوں کو ان کے پاس بھیجا، اور انھوں نے ربوبیت الٰہی کے اعتراف و قبول اور اپنی رسالت کی تصدیق کی دعوت دی تو معرفت کے باوجود بعض لوگوں نے کفر و جحود و انکار کا رویہ اختیار کیا، ان لوگوں کے نزدیک یہ چیز ناممکن ہے، کہ اللہ اپنی مخلوق کو اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت تو دے، لیکن ان کو اس کی معرفت و واقفیت نہ ہو، اس کو ماننے کی معنی یہ ہوتے، کہ اللہ ان کو اس چیز پر ایمان لانے کا مکلف بنا رہا ہے

لہ علامہ ابن قتیبہ نے جن کے متعلق پہلے گذر چکا ہے کہ انھوں نے فطرت سے ابتدا و انشا کے معنی مراد لئے ہیں، اس کا یہی مفہوم بیان کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ :- "دنیا میں ہر بچہ اسی عہد و اقرار یعنی حنیفیت پر پیدا کیا جاتا ہے جو خلقت کی ابتداء میں ظہور میں آیا تھا، اور جو عقول و طبائع میں جاری و ساری ہے، .... لیکن اس اولین اقرار سے کوئی حکم یا ثواب نہیں مترتب... ہوتا کیونکہ مشرکین کے بچے اگر اپنے والدین کے درمیان ہوں، تو وہ انہی کے دین پر متصور سمجھے جائیں گے، اور اگر مرجائیں تو ان کی جنازہ کی نماز نہیں پڑھی جائے گی،

جس سے وہ واقف ہی نہیں ہیں حالانکہ اس کا ارشاد ہے،

وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَهُمْ ۔۔۔ اور اگر تم ان سے پوچھو کہ ان کو کس

لَيَقُولُنَّ اللَّهُ (زخرف - ۸۷) نے بنایا ہے تو کہیں گے کہ اللہ نے،

ان لوگوں کے عام دلائل بھی وہی ہیں، جو پہلے بیان کئے گئے ہیں، البتہ یہ لوگ حضرت ابی ابن کعبؓ کی ایک روایت کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں جو (واذ اخذ ربک من بنی آدم) کے سلسلہ میں وارد ہے، اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ روز ازل میں بنی آدم سے اپنی ربوبیت کے اقرار کے ساتھ ساتھ اپنے پیغمبروں اور کتابوں پر ایمان لانے کا عہد بھی لے گا،

حماد بن سلمہ سے کل مولود یولد علی الفطرۃ الخ کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ ہمارے نزدیک اس سے وہ عہد مراد ہے، جو اللہ نے الست بربکم کہکر لوگوں سے اس وقت لیا تھا، جب وہ اپنے آبا کے اصلاب میں تھے،

یہ قول درحقیقت اس سے پیشتر والے قول ہی کی طرح ہے کہ معرفت و اقرار کا تعلق ایمان سے نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ کا وہ طبعی و فطری اقرار ہے جس کو اس نے لوگوں کے دلوں میں جاگزیں کر دیا ہے،

چھٹا مفہوم | ایک گروہ کے نزدیک فطرت سے وہ ارادۂ الٰہی اور مشیت ایزدی مراد ہے جس کے مطابق اللہ مخلوق کے قلوب کو پھیرا اور پلٹ دیا کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بندہ کبھی کافر ہوتا ہے، پھر ایمان لاتا ہے، اور ایمان ہی پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے، اور کبھی مومن ہوتا ہے، مگر پھر کافر ہو جاتا ہے، اور کفر ہی پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے، اور کبھی وہ کافر ہوتا ہے، اور اسی حال پر برقرار رہتا ہے، یہاں تک کہ موت آجاتی ہے

اسی طرح کبھی مومن ہوتا ہے اور ایمان ہی پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے، یہ گویا اللہ کی تقدیر اور بندوں کے لئے اس کا قانونِ فطرت ہے، ان لوگوں کی دلیل حضرت ابوسعید خدری کی وہ حدیث ہے جس میں لوگوں کے مختلف احوال میں پیدا کئے جانے کا ذکر ہے

ان لوگوں کا مدعا یہ ہے کہ فطرت سے مراد وہ قضا و قدر ہے جس کو اللہ نے اپنے بندوں کے اول سے آخر تک کے احوال کے لئے مقرر کیا ہے، بندہ کی حالت خواہ یکساں رہے یا مختلف ہوتی رہے سب پر فطرت کا اطلاق ہوگا، قرآن مجید میں ہے :-

لترکبن طبقاً عن طبق (انشقاق) تم لوگوں کو ضرور چڑھنا ہے سیڑھی پر سیڑھی،

اصولی حیثیت سے اگرچہ یہ مفہوم صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن لغوی حیثیت سے نہایت ضعیف ہے، واللہ اعلم"

ابھی تک حدیث کے سلسلہ میں ہم نے اہل سنت کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے مگر اہل بدعت[1] کا خیال یہ ہے کہ اللہ نے حضرت آدمؑ اور ان کی ذریت سے ان کی پیدائش سے پہلے نہ کوئی عہد و میثاق لیا ہے، اور نہ وہ اپنی ماؤں کے بطون کے سوا کبھی اور پیدا کئے گئے ہیں، اسی طرح اس کا بنی آدم سے کوئی مکالمہ بھی نہیں ہوا کیونکہ اس کو مان لینے کے بعد لازماً یہ بھی ماننا پڑیگا کہ اللہ کی طرف سے لوگوں کو تین بار زندگی ملی ہے، حالانکہ قرآن مجید میں ہے،

ربنا امتنا اثنتین واحییتنا اثنتین، (مومن - ۱۱)	(کفار) بولیں گے کہ اے ہمارے خداوند! تو نے ہم کو دوبار موت اور دوبار زندگی عطا کی،

---

[1] غالباً اس سے فرقہ باطلہ مراد ہوں گے،

یہ اگرچہ اہل رسوخ کا قول ہے لیکن قرآن مجید نے اس کی کوئی تردید نہیں کی ہے بلکہ دوسری جگہ اس کی تصدیق کرتے ہوئے اس نے کہا ہے :-

وکنتم امواتاً (فی حال عدم	تم لوگ مردہ تھے (یعنی حالت
غیر وجود) فاحیاکم (یعنی	عدم میں جب کہ تم لوگوں کا سرے
خلقہ ایاکم) ثم یمیتکم ثم	سے کوئی وجود ہی نہیں تھا)
یحییکم (بقرہ ۲۸)	پھر (اللہ) نے تم لوگوں کو جلایا (پیدا کرکے) پھر تم لوگوں کو آئے

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کو زندگی اور موت کا مرحلہ دو ہی دفعہ پیش آتا ہے، آخر بے عقل و بے شعور لوگوں سے اللہ تعالیٰ کی کیا بات چیت ہوئی گی اور انھوں نے اس کو جواب کیا دیا ہوگا، اور پھر جو عہد و میثاق ان کو یاد تک نہ رہ گیا ہو تو اس سے اُن کے خلاف حجت کس طرح قائم کی جا سکتی ہے، جب کہ بھول چوک اور سہو و نسیان کا کوئی مواخذہ نہیں ہوتا، اس لئے آیت میثاق کی تاویل یہ ہوگی کہ اللہ نے لوگوں کو دنیا میں پیدا کرکے ان پر اس طرح حجت قائم کی ہے کہ ان کے لئے اُس نے ایک ایسی فطرۃ صحیحہ بنا دی ہے جس کے ذریعہ وہ سن رشد و شعور کو پہنچ جانے کے بعد یہ جان سکیں گے کہ اللہ ہی ان کا رب اور خالق ہے،

ان میں سے بعض لوگوں کے نزدیک اللہ نے ذریت آدم کو قرناً بعد قرنٍ ظاہر کرکے اُن کے نفوس کے خلاف اس طرح شاہد بنایا ہے کہ ان کی عقل و طبیعت میں وہ صلاحیت ودیعت کر دی ہے جو ان کو اُن کی خواہشات کے علی الرغم اقرار ربوبیت کی طرف لے جاتی ہے، اسی فطری و طبعی صلاحیت کے لحاظ سے گویا ان سے کہا گیا ہے

کہ (الست بربکم؟) اور انھوں نے اس کے جواب میں (بلی) کہا پس یہ مجاز ہے نہ کہ حقیقت و واقعہ، اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ (الست بربکم) انبیاء کی زبانی کہا گیا ہے،

ان سب لوگوں کے نزدیک حدیث کی حیثیت ماثور و منقول کی ہے اور اس کا اس آیت کی تاویل سے کوئی تعلق نہیں ہے،

فطرت کے بارہ میں علمائے سلف کے جن آراء و اقوال کا علم ہو سکا ہے، ان کو ہم نے بالتفصیل بیان کر دیا اس ضمن میں ہم نے وہ رائے بھی تحریر کر دی ہے جو روایۃً و درایۃً ہمارے علم و نظر اور فہم و اجتہاد کے مطابق صحیح و صائب تھی، لیکن ہم کو اس کی صحت پر اصرار نہیں ہے، ممکن ہے، دوسرے ارباب علم و نظر کی رسائی وہاں تک ہو جائے، جو ہم سے اوجھل رہ گئی ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ حقائق و معارف کو جن علماء کے لئے چاہتا ہے منکشف کر دیتا ہے اور جن کے لئے چاہتا ہے ان پر مخفی و مستور رکھتا ہے، تاکہ مخلوق کا عجز و قصور اور خالق ذوالجلال والاکرام کی قدرت و کمال ظاہر و باہر ہو جائے،

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی

از

جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری، اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۴)

سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو معارف ماہ جون

شیخ صفی الدین ردولوی حضرت شیخ صفی الدین بن شیخ نصیر الدین بن شیخ نظام الدین غزنوی دہلوی ردولوی دہلی میں پیدا ہوئے، اُن کے دو بھائی شیخ رضی الدین اور شیخ فخر الدین تھے یہ تینوں قاضی شہاب الدین کے نواسے اور اُن کے خصوصی تلامذہ میں ہیں، فتنہ تیموری کے بعد شیخ صفی الدین اور ان کے بھائی اپنے خاندان کے ساتھ دہلی سے جونپور چلے آئے اس خاندان کا قاضی شہاب الدین سے خصوصی رشتہ تھا، اور علم و فضل میں بھی ممتاز تھا اس لئے سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے اسے مرحمت خسروانہ سے نوازا، شیخ صفی الدین نے دہلی ہی میں اپنے نانا قاضی شہاب الدین سے علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کی، اُس کے بعد سید اشرف سمنانی سے طریقت کی تعلیم حاصل کر کے اُن کے محبوب ترین خلیفہ ہوئے، اور انھوں نے بھی اپنے نانا کی طرح فراغت کے بعد درس و افتاء اور تصنیف کا مشغلہ اختیار کیا کافیہ کی شرح غایۃ التحقیق اُن کی مشہور تصنیف ہے جس میں اپنے نانا کی شرح کافیہ کو شروح کافیہ میں بہترین کتاب بتایا ہے، اور اس کی بڑی تعریف کی ہے،

چلپیؒ نے کشف الظنون میں غایۃ التحقیق کا تذکرہ کیا ہے، اُن کی دوسری مشہور کتاب علم صرف میں دستور المبتدی ہے، جسے اپنے صاحبزادے شیخ ابو المکارم اسمٰعیلؒ کے لئے لکھا تھا شیخ صفی الدین علم و حکمت میں یکتائے زمانہ اور شریعت و طریقت کے جامع تھے ۱۲ ذی قعدہ ۹۱۰ھ میں فوت ہوئے، اس وقت ان کے نانا بقید حیات تھے۔

اُن کے صاحبزادے شیخ ابو المکارم اسمٰعیل ۸۹۰ھ میں پیدا ہوئے، اس وقت اُن کا خاندان دہلی میں آباد تھا، سید اشرف سمنانیؒ نے اُن کو بچپن ہی میں اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کر لیا تھا، والد نے اُن کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ کی، بڑے ذہین و طباع تھے، تقریباً سولہ ۱۶ سال ہی کی عمر میں علوم مروجہ کی تحصیل سے فراغت حاصل کر کے درس و افادہ میں مشغول ہو گئے، ۹۱۰ھ میں اپنے والد شیخ صفی الدین کے وصال کے بعد ان کے جانشین ہوئے، اور تقریباً چالیس سال تک اپنے فیوض و برکات سے خلق اللہ کو مستفیض کرنے کے بعد ۱۱ ربیع الاول ۹۶۰ھ میں وفات پائی،

شیخ ابو المکارم اسمٰعیل کے چار ۴ صاحبزادے تھے، اور سب کے سب عالم و فاضل اور بزرگ تھے جنہیں زیادہ مشہور حضرت شیخ عبد القدوس بن شیخ ابو المکارم اسمٰعیل بن شیخ صفی الدین بن شیخ نصیر الدین گنگوہیؒ متوفی ۹۴۵ھ ہیں، جو حضرت شیخ احمد عبد الحق ردولویؒ کے پوتے شیخ محمد بن شیخ عارفؒ کے مرید اور خلیفہ ہیں، آپ نے شیخ احمد عبد الحق کے ملفوظات و احوال کو انوار العیون فی اسرار المکنون میں جمع کیا ہے، ان کے علاوہ شیخ ابو المکارم اسمٰعیل کے تین صاحبزادے شیخ عبد الصمد، شیخ عزیز اللہ، شیخ حبیب عرف مخدوم منجھن تھے، یہ سب اپنے والد سے علم و معرفت حاصل کر کے ان کے خلیفہ ہوئے، ان ہر سہ حضرات کا تعلق سلسلۂ چشتیہ نظامیہ سے تھا، اور شیخ عبد القدوس نے سلسلۂ چشتیہ صابریہ سے منسلک ہو کر گنگوہ میں سکونت اختیار کی[۱۵]

[۱۵] اخبار الاخیار، تذکرہ علمائے ہند، نزہۃ الخواطر،

قاضی رضی الدین رودولی | انھوں نے بھی اپنے نانا قاضی شہاب الدین سے جملہ علوم و فنون حاصل کئے، اور اپنے اسلاف کے طرز پر درس و تدریس کی زندگی بسر کی، سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے اُن کو رودولی کا قاضی بنایا تھا، اسی لئے انھوں نے وہیں مستقل بود و باش اختیار کر لی، اس زمانہ میں اُن کے بڑے بھائی شیخ صفی الدین مرشد کامل کی تلاش میں رودولی گئے، وہاں سید اشرف سمنانی سے ملاقات ہوئی، سید صاحب نے ان کو اپنے حلقۂ ارادت و خلافت میں لے لیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ شیخ رضی الدین سید اشرف سمنانی کی وفات ۸۰۸ھ سے پہلے ہی رودولی کے قاضی بنائے جا چکے تھے، اور اس سے چند سال پہلے اُن کے والد اور نانا دہلی سے جونپور آ گئے تھے، اور اُن کی پیدائش اور تعلیم و تربیت کے تمام مراحل دہلی ہی میں گذر چکے تھے، اور یہ تصریح اُن کے بارے میں صحیح نہیں ہے،

ولد ونشاء بجونبور، و	وہ جونپور میں پیدا ہوئے، اور
قرء العلم علی جدہ لامہ	وہیں نشو و نما پائی، اور اپنے نانا
الشھاب المذکور، و	قاضی شہاب الدین سے تحصیل علم
لازمہ مدۃ من الزمان[1]	کرکے ایک مدت تک اُن کی خدمت

میں رہے،

واقعہ یہ ہے کہ قاضی رضی الدین کی ولادت، نشو و نما اور نانا سے تحصیل علم کے تمام مراحل قیام دہلی کے زمانہ میں طے ہو چکے تھے،

شیخ فخر الدین | شیخ صفی الدین اور شیخ رضی الدین کے حقیقی بھائی اور قاضی شہاب الدین کے نواسے ہیں، انھوں نے بھی اپنے بھائیوں کی طرح اپنے نانا کی خدمت میں رہ کر علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کی، تذکرہ علمائے ہند میں تینوں بھائیوں کے بارے

---

[1] نزہۃ الخواطر جلد ۳ ص ۱۰۷،

میں تصریح ہے :۔

"و ہر یکے بخدمت قاضی شہاب الدین جد مادری خود باکتساب علوم متداولہ دانشمند مشہور شدند"

شیخ فخرالدین کے بارے میں بھی نزھۃ الخواطر کی یہ تصریح محل نظر ہے :

"ولد ونشأ بجونپور"[1]

شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوریؒ جونپور کے علماے کبار اور مشائخ عظام میں ظاہری و باطنی کمالات میں جامع شخصیت رکھتے تھے، وطن دہلی تھا، تیموری فتنہ میں حدود سنہ ۸۰۱ھ میں جونپور چلے آئے، اس وقت اُن کی عمر صرف سات آٹھ سال کی تھی، اسی عمر میں شیخ فتح اللہ اودھیؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے، جو اودھ کے رہنے والے تھے، اور دہلی میں درس وتدریس کی خدمت انجام دے چکے تھے، مگر جونپور آنے کے بعد اس مشغلہ سے کنارہ کش ہو گئے تھے، اسلئے انھوں نے اپنے اس کم سن مسترشد کو مشورہ دیا کہ وہ قاضی شہاب الدین کی درسگاہ میں داخل ہو کر علوم شرعیہ کی تکمیل کریں،

نہایت ذہین وذکی تھے، اس لئے قاضی صاحب نے بھی اُن کی طرف خصوصی توجہ فرمائی، اور اسی شاگرد عزیز کے لئے اصول بزدوی کی شرح تا بحث امر تحریر فرمائی قاضی صاحب ان سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے،

شیخ محمد بن عیسیٰ تکمیل کے بعد درس وتدریس میں مشغول ہو گئے مگر بعد میں اس کو ترک کر کے اپنے شیخ و مرشد فتح اللہ اودھیؒ کی صحبت میں رہے، اور علائق دنیا سے علٰحدہ ہو گئے اور عبادت وریاضت کی دنیا آباد کی، قاضی شہاب الدین کو اپنے اس شاگرد کی ولایت

---

[1] تذکرۂ علمائے ہند ص ۹۹ - ونزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۱۵،

وکرامت پر بڑا ناز و اعتماد تھا، ایک بار مولانا فقیہ جیرتی سے مناظرہ کے سلسلہ میں اُن کی خصوصی توجہ چاہی تھی،

سلطان ابراہیم شاہ اور اُن کا لڑکا سلطان محمود شاہ اُن کا بجد معتقد تھا، دونوں بادشاہوں نے بارہا خدمت کرنی چاہی، مگر انھوں نے ہمیشہ استغنا اور بے نیازی ظاہر کی، دوسرے امرا، وحکام کے ہدایا وتحائف بھی قبول نہیں کرتے تھے، اس سلسلہ میں اکثر یہ اشعار پڑھا کرتے تھے:

من دلقِ خود با فسرِ شاہاں نمی دہم — من فقرِ خود بملکِ سلیماں نمی دہم

از رنجِ فقر در دلِ گنجے کہ یافتم — ایں رنج را براحتِ شاہاں نمی دہم

حضرت شیخ محمد بن عیسیٰ ۴ ربیع الاوّل ۸۶۰ھ میں فوت ہوئے،

اُن کے تلامذہ میں شیخ بہاء الدین عمری جونپوری متوفی ۹۱۱ھ بڑے مرتبہ کے عالم وبزرگ ہیں، شیخ محمد بن عیسیٰ سے تعلیم حاصل کرکے سید راجہ حامد شاہ مانک پوریؒ سے طریقت کی تعلیم وتربیت پائی، اور نو سال تک اُن کی خدمت میں رہے، اس کے بعد حرمین شریفین میں تیس سال تک زہد وتقویٰ اور علم وفضل کی زندگی بسر کی، مکہ مکرمہ کے علماء ومشائخ سے حدیث اور طریقت میں کسبِ فیض کیا، اور کتبِ احادیث سے خصوصی شغل وشغف رکھا، ارشاد السالکین اُن کی مشہور کتاب ہے،

شیخ محمد بن عیسیٰ کے دوسرے مشہور شاگرد شیخ مبارک ارزانی بنارسی رحمتوفی ۸۹۰ھ ہیں، جو علم حدیث میں نمایاں تخصیص رکھتے تھے، اُن کو دینی وعلمی مرتبہ کے ساتھ دنیاوی جاہ وجلال بھی حاصل تھا، شیر شاہ سوری اور اس کے لڑکے سلیم شاہ سوری کے عہد حکومت میں وزارت کے عہدہ پر فائز رہے، مدارج الاخبار اُن کی مشہور تصنیف ہے،

جس میں مشارق الانوار کی حدیثوں کو ترتیب دیا ہے[1]

مولانا عبدالملک عادل جونپوری | جونپور میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں قاضی شہاب الدین کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا، اور اٹھارہ سال کی عمر میں علوم متداولہ سے فراغت پاکر یکتاے زمانہ ہوئے، اور اپنے استاذ کے جانشین بنے، اور اُن کے طریقہ پر درس و افتا، اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا، قاضی شہاب الدین کی وفات کے بعد اُن کے مدرسہ کے صدرالمدرسین اور جانشین بنائے گئے، اور پچاس سال تک تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۲ ربیع الاول ۸۹۷ھ میں فوت ہوئے،

مولانا عبدالملک عادل کے تلامذہ میں شیخ الٰہ داد بن عبداللہ جونپوری متوفی ۹۲۳ھ زبردست عالم و فاضل اور باخدا بزرگ تھے، سید راجہ حامد شاہ مانک پوری کے مرید و خلیفہ تھے، انھوں نے بھی اپنے اسلاف و اساتذہ کے طریقہ پر فراغت کے بعد درس، افتاء اور تصنیف کا مشغلہ اختیار کیا، اپنے استاذ الاستاذ قاضی شہاب الدین کی شرح کافیہ پر بہترین حواشی لکھ کر اس کی شرح و تعلیق کی، نیز ہدایہ، اصول بزدوی اور تفسیر مدارک التنزیل کے شروح و حواشی لکھے، اُن کی شرح کافیہ کو قبول عام حاصل ہوا، اپنے زمانہ میں جونپور کے مشہور اساتذہ میں شمار ہوتے تھے، انکے صاحبزادے شیخ بھکاری عہد

. . . .

لودھی کے علماے فحول میں تھے، ایک مرتبہ سلطان وقت نے دہلی میں مناظرہ کی مجلس منعقد کی، جس میں ایک طرف شیخ عبداللہ تلنبی اور شیخ عزیز تلنبی تھے، اور دوسری طرف شیخ الٰہ داد اور اُن کے صاحبزادے شیخ بھکاری تھے، سر دربار مناظرہ کے بعد معلوم ہوا کہ شیخ الٰہ داد اور شیخ بھکاری علوم و مسائل کی تنقیح میں ماہر ہیں، اور اُن کے

[1] اخبار الاخیار ص ۱۷۵، تذکرہ علماے ہند ص ۹۵، نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۴۳

تذ مقابل دونوں علما تفوس میں آگئے ہیں[۱]

مولانا قطب الدین ظفرآبادیؒ | ۸۰۲ھ میں ظفرآباد میں پیدا ہوئے، حفظ قرآن کے بعد ابتدائی کتابیں اپنے والد شیخ نور الدین حسینی واسطیؒ سے پڑھیں، اس زمانہ میں قاضی شہاب الدین کی علمی و تدریسی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا، اور دور دور سے تشنگان علم ان کے چشمۂ علم پر آکر سیراب ہورہے تھے، شیخ قطب الدین نے بھی قاضی صاحب کی خدمت میں اس طرح حاضری دی کہ پھر کسی دوسری درس گاہ کا رُخ نہیں کیا، اور تمام کتب درسیہ اور علوم متداولہ کی تکمیل چار سال تک اُن ہی کی شاگردی میں رہ کر کی، اس کے بعد اپنے والد سے طریقت حاصل کر کے حج و زیارت سے مشرف ہوئے، نہایت متواضع، خوش اخلاق اور عابد و زاہد عالم و بزرگ تھے، اُن کی ذات سے بہت سے بندگان خدا کو فیض ملا، ۲۰ رجادی الاخری ۸۶۹ھ میں ظفرآباد میں فوت ہوئے،

مولانا علاء الدین جونپوریؒ | جونپور کے مشاہیر علماء و اساتذہ میں شمار کئے جاتے تھے، انھوں نے ایک مدت تک قاضی شہاب الدین کی خدمت میں رہ کر مروجہ علوم و فنون حاصل کئے، اسی شاگرد عزیز کے لئے قاضی صاحب نے کافیہ کی شرح لکھی تھی، جسے بعد میں علماء و مدرسین اور طلبہ و تلامذہ میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، شیخ علاء الدین بیس سال کی عمر میں تحصیل علم سے فارغ ہوگئے، اور درس و افتا کے ساتھ تصنیف و تالیف کا مشغلہ اختیار کیا، اُن کی تصانیف میں اپنے استاذ قاضی شہاب الدین کی شرح کافیہ کی شرح بھی ہے، استاذ نے اپنے عزیز شاگرد کے لئے جو کتاب لکھی، شاگرد نے اسکی شرح لکھ کر حق شاگردی ادا کرنے کی کوشش کی، جونپور میں فوت ہوئے[۲]

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۱۹۱، تذکرہ علماے ہند ص ۲۵، وص ۳۳، نزہتہ الخواطر ج ۳ ص ۱۴۱،
[۲] تجلی نور، و نزہتہ الخواطر،

قاضی شہاب الدین کے سلسلۂ تلامذہ میں قاضی سماء الدین جونپوری بھی شامل ہیں جنھوں نے قاضی صاحب کے تلامذہ سے تحصیلِ علم کی تھی، اور اپنے زمانہ کے اعلم العلماء اور سلطان حسین شاہ شرقی کے اُستاد تھے، بعد میں سلطان مذکور نے اُن کو اپنا وزیر بنا کر تلغ خاں کا لقب دیا تھا، سنہ ۸۸۳ھ میں جب سلطان حسین شاہ اور سلطان بہلول لودھی میں مقابلہ ہوا، تو مولانا سماء الدین سلطان حسین کے ہمراہ تھے، سلطان بہلول لودھی نے اُن کو گرفتار کر کے دہلی میں قید کیا، سنہ ۹۰۲ھ تک ان کے زندہ رہنے کی تصریح ملتی ہے[1]۔

تصانیف | قاضی شہاب الدین تدریسی خدمات کے ساتھ تصنیفی کارناموں میں بھی اپنے اقرانِ معاصر میں خاص شہرت رکھتے ہیں، انھوں نے مختلف علوم و فنون میں ایسی معیاری کتابیں لکھیں جو آٹھویں صدی کے اسلامی ہند کی یادگار بن گئیں، اُن کے ہر تذکرہ نگار نے اُن کی تصنیفی خدمات کا خاص طور سے ذکر و اعتراف اور اُن کی کتابوں کا تعارف کرایا ہے، سب سے پہلے قاضی صاحب کے شیخ و مرشد سید اشرف سمنانیؒ نے جو خود بھی زبردست عالم و مصنف تھے، اُن کی تصانیف کی داد دی ہے، شاہ عبد الحق صاحب محدث دہلوی نے ان کی کئی تصانیف کا شاندار الفاظ میں تعارف کرایا ہے، فرشتہ نے لکھا ہے:-

"تصانیف مستحسنہ مفیدہ آں بزرگوار شہرت عام دارد"

اس کے بعد چند خاص کتابوں کے نام درج کئے ہیں، (ج ۲ ص ۴۰۶) سبحۃ المرجان میں ہے:-

والف کتباً سارت بھا الرکبان		قاضی صاحب نے وہ کتابیں لکھیں
العرب والعجم (ص ۳۹)		جن کو عرب و عجم کے علمی قافلے لے

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۹۰ و نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۱۵،

خزینۃ الاصفیاء میں ہے "تصانیف و تالیف عالی دارد" (ج ۱ ص ۳۰۴) تذکرۂ علمائے ہند میں ان کی تصنیفی خدمات کو ان الفاظ میں ذکر کیا ہے "قاضی مسادۂ افادہ و درس بحجرہ مزین فرمود، و بہ تصنیف کتب مصروف گردید" اور بعض کتابوں کا نام بھی لکھا ہے کسی مصنف کی کتابوں کا قبول عام اس کی زندگی ہی میں حاصل ہونا بڑی سعادت کی بات ہے، اور یہ سعادت قاضی صاحب کو حاصل تھی، چنانچہ اُن کی حیات ہی میں ان کی کتابوں کو ہند اور بیرون ہند کے علماء نے پڑھا، پڑھایا، اُن کی شرحیں لکھیں ان کے اقتباسات سے اپنی کتابوں کو زینت دی، اور اُن کے ساتھ خصوصی اعتناء کیا۔

قاضی صاحب کے تدریسی و تصنیفی جوہر قیام جونپور کے بعد ظاہر ہوئے، دہلی کے زمانۂ قیام میں اس کا کوئی نشان نظر نہیں آتا، چنانچہ ان کے تذکرہ نگاروں نے اُن کی تصانیف کو جونپور کے زمانۂ قیام کی خدمات میں شمار کیا ہے، حالانکہ اس سے پہلے بھی قاضی صاحب چند کتابیں لکھ چکے تھے خصوصاً الارشاد، بدیع البیان، جامع الصنائع اور بحر المواج کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ قیام دہلی کے زمانہ میں لکھی گئی تھیں، کیونکہ قاضی صاحب نے دہلی سے جونپور آنے کے چند سال کے بعد ان کتابوں کو سید اشرف سمنانی متوفی ۸۰۸ھ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

مختلف کتابوں سے آپ کی حسب ذیل تصانیف معلوم ہو سکی ہیں:-

(۱) الارشاد فی النحو، (۲) حواشی کافیہ، (۳) بدیع البیان، (۴) جامع الصنائع، (۵) بحر المواج (۶) شرح اصول بزدوی تا بحث امر، (۷) رسالہ در تقسیم علوم، (۸) مناقب السادات (۹) المصباح، (۱۰) فتاویٰ ابراہیم شاہی، (۱۱) عقیدۂ شہابیہ، (۱۲) شرح قصیدہ بانت سعاد، (۱۳) شرح قصیدہ بردہ، (۱۴) رسالہ معارضہ

(۱۵) ہدایۃ السعداء (۱۶) رسالہ در طہارت زیاد (۱۷) رسالہ در افضلیت عالم بر سید (۱۸) ایک کتاب تفسیر میں، ان کتابوں کا مختصر تعارف یہ ہے،

الارشاد فی النحو علم نحو میں اس نام کی متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر قاضی صاحب کی کتاب کو جو مقبولیت حاصل ہوئی، وہ کسی اور الارشاد کے حصہ میں نہیں آئی، ملک اور بیرون ملک میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، اس کی اہمیت و افادیت کو سب سے پہلے سید اشرف سمنانیؒ نے ان شاندار الفاظ میں ظاہر فرمایا "اینکہ گویند سحر از ہندستان راست آمدہ غالباً ایں راست سحر بود"[1]

شاہ عبدالحق صاحب نے لکھا ہے: "ارشاد در نحو کہ در دے تمثیل در ضمن تعبیر التزام نمودہ و ترتیب جدید اختیار فرمودہ است نیز نسخہ ایست لطیف و بے نظیر و قریب"[2]

تاریخ فرشتہ میں ہے، "متن ارشاد کہ در نحو کہ بصیح المثال است"[3] سبحۃ المرجان میں ہے،

والارشاد وھو متن فی النحو	ارشاد علم نحو کا متن ہے، اس میں
التزم فیہ التمثیل المسالۃ	ہر مسئلہ کی تعریف کے ضمن میں اسکی
فی ضمن تعریفھا [4]	مثال کا التزام کیا ہے،

کشف الظنون میں ہے :-

والارشاد متن لہ فی النحو	ارشاد علم نحو میں ایک متن ہے جس
تعمق فی تھذیبہ کل التعمق	کی تہذیب و تنقیح میں قاضی صاحب
وتانق فی ترتیبہ حق التانق	نے بڑا اہتمام کیا ہے، اور ترتیب
اولہ الحمد للہ کما یجب و	میں کمال دکھایا ہے، اس کی ابتدا

---

[1] لطائف اشرفی ج ۱ ص ۱۰۹ [2] اخبار الاخیار ص ۱۸۵، [3] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۶، [4] سبحۃ المرجان ص ۳۹،

یہ ضمنی ہے — الحمد للہ کما یجب و یرضی سے ہوئی ہو،

صاحب خزینۃ الاصفیاء میں لکھا ہے "دوم کتاب ارشاد کہ در علم نحو بے عدیل"[۲]

اس کتاب کی افادیت و اہمیت کے پیش نظر ہند اور بیرون ہند کے مشاہیر نے اس کے شروح و حواشی لکھے، چنانچہ علمائے ہند میں مولانا شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی متوفی ۹۹۸ھ نے اس کی ایک شرح لکھی تھی، سبحۃ المرجان میں اُن کی تصانیف کے ذکر میں لکھا ہے،

شرح الارشاد للقاضی شہاب الدین الدولتابادی فی النحو[۳]	علامہ وجیہ الدین علوی کی تصانیف میں الارشاد فی النحو مؤلفہ قاضی شہاب الدین کی شرح بھی ہے

تذکرہ علمائے ہند میں بھی شیخ وجیہ الدین علوی کی اس شرح کا ذکر ہے[۴]

باہر کے علماء میں مشہور محشی ابو الفضل خطیب گازرونی نے ارشاد کی ایک شرح لکھی جس کا تذکرہ کشف الظنون میں ان الفاظ میں ہے:-

وعلی متن الہندی شرح ممزوج للفاضل العلامۃ ابی الفضل الخطیب الکازرونی المحشی[۵]	قاضی شہاب الدین ہندی کے متن الارشاد پر علامہ ابو الفضل خطیب گازرونی نے اس طرح شرح لکھی ہے کہ متن اور شرح کی عبارتیں ملی جلی ہیں،

خطیب گازرونی نے قاضی صاحب کی شرح کافیہ پر بھی حواشی لکھے ہیں، تذکرہ علمائے ہند

---

[۱] کشف الظنون ج ۱ ص ۶۰، [۲] خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۳۹۰، [۳] سبحۃ المرجان ص ۴۵، [۴] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵۰، [۵] کشف الظنون ج ۱ ص ۶۸

کے مصنف نے ارشاد کا ایک نسخہ مولانا مفتی علی کبیر مچھلی شہری کے کتب خانہ میں دیکھا تھا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ لائڈن کی لائبریری میں موجود ہے[1]

بدیع البیان | اس کا نام بعض کتابوں میں بدیع المیزان درج ہے، عربی میں علم بیان اور بلاغت میں نہایت جامع متن ہے، اس زمانہ کے ذوق کے مطابق اس کی عبارت مسجع و مقفی ہے، اُسے بھی قاضی صاحب نے سید اشرف سمنانیؒ کی خدمت میں پیش کیا تھا، اور آپ نے اس کو پسند فرمایا تھا[2]، شاہ عبدالحق صاحب اس کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"بدیع البیان نیز نسخہ ایست در علم بلاغت دریں جا مقید بسجع شدہ است"[3]

صاحب سبحۃ المرجان نے اس کا نام بدیع المیزان بتایا ہے، اور لکھا ہے وبدیع المیزان وھو متن فی فن البلاغۃ بعبارات مسجعۃ[4]

صاحب خزینۃ الاصفیاء نے اسے اپنے فن میں لاثانی کتاب بتایا ہے، ثیوم بدیع البیان در علم بلاغت لاثانی است"[5]

بحر مواج | فارسی میں کئی جلدوں میں قرآن مجید کی تفسیر ہے، اس کی تہذیب و تنقیح نہیں ہو سکی، اور تسوید کے بعد کسی سبب سے تبییض کی باری نہیں آئی، اس لئے اس میں حشو و زوائد رہ گئے، سید اشرف سمنانی نے اسے دیکھ کر کہا تھا سخن خالی از لطافت نیست[6]، شاہ صاحب نے اس کے متعلق یہ تفصیل لکھی ہے :۔

"بحر مواج تفسیر قرآن مجید کردہ بعبارت فارسی، و در وے بیان ترکیب و معنی فصل و وصل دادہ است و دریں جا نیز برائے سجع تکلف کردہ است، قابل اختصار ...

---

[1] المنجد فی العلوم والادب ص ۱۳۰، [2] لطائف اشرفی جلد ۲ ص ۱۰۲، [3] اخبار الاخیار ص ۱۸۵،
[4] سبحۃ المرجان ص ۳۹، [5] خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۳۹۰، [6] لطائف اشرفی ج ۲ ص ۱۰۹

شاہ صاحب کے انداز بیان اور تفصیلی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اُن کی نظر سے گذری تھی، صاحب خزینۃ الاصفیا نے لکھا ہے "بحر مواج تفسیر قرآن کہ بعبارت فارسی نہایت مقبول"[۵۱] صاحب اخبارالاصفیا نے اس کتاب کے بارے میں قاضی صاحب کا ایک جواب نقل کیا ہے کہ زمانہ تصنیف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کتاب کو بے حد پسند فرمایا اور قاضی صاحب کو اس کی جلد از جلد تکمیل کی تاکید فرمائی، اس پر قاضی صاحب نے تعمیل ارشاد میں بعجلت تمام کتاب مکمل کی،

اس واقعہ کے آخر میں لکھا ہے "اختتام تفسیر ہماں بود، و اجزاے حیاتش از شیرازہ بدن پراگندہ شدن ہماں"[۵۲] حالانکہ بحر مواج قاضی صاحب کی ابتدائی تصانیف میں سے ہے انھوں نے اسے ۸۰۰ھ سے پہلے سید اشرف سمنانیؒ کی خدمت میں پیش کیا تھا، اور اس کے تقریباً چالیس سال بعد فوت ہوئے، اخبارالاصفیا کے علاوہ قاضی صاحب کے کسی تذکرہ نگار نے یہ خیالی واقعہ بیان نہیں کیا ہے،

جامع الصنائع | یہ کتاب فارسی میں علم بدائع و صنائع میں ہے، سید اشرف سمنانیؒ نے اُسے دیکھ کر کہا تھا "حضرت قاضی درین فن ہم دست زدہ اند"[۵۳] پھر اپنے متوسل خاص شیخ اوحدی کے بارے میں جو فارسی زبان کے زبردست شاعر تھے، قاضی صاحب سے فرمایا "چوں ہمہ از علوم سر بردہ آید، فارسی را بشیخ گذارید" شاہ صاحب نے اس کے بارہ میں لکھا ہے "و در صنائع نیز رسالہ فارسی دارد" (اخبارالاخیار ص ۱۷۵) اور صاحب خزینۃ الاصفیا نے لکھا ہے "ششم رسالہ در تقسیم صنائع" (ج ۱ ص ۳۶۱)

---

[۵۱] خزینۃ الاصفیاء جلد ۱ صفحہ ۳۶۱،　[۵۲] اخبارالاصفیا، ورق ۶۰
[۵۳] لطائف اشرفی ج ۲ ص ۱۰۶،

حواشی کافیہ | یہ کتاب شرح کافیہ، شرح ہندی اور حاشیۂ ہندی کے ناموں سے بھی مشہور ہے، علم نحو کے مشہور متن کافیہ ابن حاجب کی عربی میں نہایت مفید شرح ہے، اسے قاضی صاحب نے اپنے لائق ترین شاگرد مولانا علاء الدین عمری جون پوری کے لئے تحریر کیا تھا، اور اُن کو اس کا درس بھی دیا تھا، قاضی صاحب کو اس کتاب کی اہمیت و افادیت کا خاص خیال تھا، اور انھوں نے اسے اپنے خواجہ تاش اور معاصر عالم قاضی نصیر الدین کی خدمت میں بھیجا، جو اس زمانہ میں درس و تدریس کا مشغلہ رکھتے تھے، اور یہ خواہش کی کہ اگر آپ اس کتاب کو اپنے یہاں داخل درس کرلیں تو دوسرے علماء بھی اعتناء کریں گے، قاضی نصیر الدین نے قاضی صاحب کی خواہش تو پوری نہیں کی، مگر اس کی داد دی کہ "خوب نوشتہ اند احتیاج درس گفتن نیست"[1] اس کے بعد قاضی صاحب کی تمنا یوں پوری ہوئی، اور ان کی زندگی ہی میں یہ کتاب مقبول ہو کر داخل درس ہوئی، کئی علماء نے اُس کی شرحیں اور حواشی لکھے، شاہ عبدالحق صاحب لکھتے ہیں:

> "از تصنیفات او یکے حواشی کافیہ است کہ در لطافت و متانت بے عدیل واقع شدہ، و ہم در حالت حیات او مشہور عالم گشتہ"۔
>
> (اخبار الاخیار ص ١٧٥)

صاحب مشکوٰۃ النبوۃ نے بھی اسی کتاب کی تعریف و توصیف میں شاہ صاحب کے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں:[2]

فرشتہ نے لکھا ہے کہ "حاشیہ کافیہ کہ مشہور است بحاشیۂ ہندی"[3] صاحب سبحۃ المرجان نے اُسے قاضی صاحب کی مشہور ترین تصنیف قرار دیا ہے، والحواشی علی کافیۃ

---

[1] اخبار الاخیار ص ١٧٠، [2] مشکوٰۃ النبوۃ قلمی ص ٢٣١، [3] تاریخ فرشتہ ج ٢ ص ٣٠٧

الحو، دھی اشھر تصانیفہ[۱]

اس کتاب کی سب سے پہلی شرح قاضی صاحب کے اسی شاگرد رشید نے لکھی، جس کے لئے انھوں نے اسے تحریر فرمایا تھا، چنانچہ مولانا علاء الدین جونپوری نے فراغت کے بعد اس پر مفصل حاشیہ لکھا، اس کے بعد قاضی صاحب کے تلمیذ التلمیذ مولانا الہ داد جونپوری نے اس کا ایک حاشیہ لکھا، بیرونِ ہند کے شارحین میں مولانا ابو الفضل خطیب گازرونی، شیخ غیاث الدین منصور، اور شیخ توقانی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، کشف الظنون میں شرح کافیہ کے بیان میں ہے:۔

وشرحھا شھاب الدین احمد بن عمر الھندی المتوفی ۸۴۹ھ تسع واربعین وثمانمائۃ وعلیہ حاشیۃ لمولانا الفاضل میاں اللہ (میاں اللہ داد) الجانپوری و وعلی شرح الھندی حاشیۃ للتوقانی، وللکازرونی، و ولغیاث الدین منصور[۲]،	شہاب الدین احمد بن عمر ہندی متوفی ۸۴۹ھ نے کافیہ کی شرح لکھی، جس پر مولانا میاں الہ داد جونپوری کا حاشیہ ہے، نیز اس شرح ہندی پر توقانی، گازرونی اور غیاث الدین منصور کے حواشی ہیں،

تجلی نور میں ہے کہ جب شیخ عبد الرحمٰن جامیؒ نے کافیہ کی شرح لکھی، اور قاضی صاحب نے اسے ملاحظہ کیا، تو فرمایا کہ "ملا جامی خلاصہ شرح ہندی را نوشتہ[۳] الحق بظاہر صحیح نہیں

۱؎ سبحۃ المرجان ص ۳۹، ۲؎ کشف الظنون ج ۲، ص ۲۵۰، ۳؎ تجلی نور ج ۱، ص ۳۴،

معلوم ہوتا، کیونکہ حضرت شیخ عبدالرحمن جامی کی وفات ۸۹۸ھ میں ہوئی، اور اُن سے تقریباً چالیس سال پہلے قاضی صاحب کی وفات ہوچکی تھی،

رسالہ درتقسیم علوم | یہ رسالہ فارسی میں تھا، اخبار الاخیار (۱۷۵) خزینۃ الاصفیاء (جلد ۱ ص ۳۰۱) تذکرہ علمائے ہند (ص ۸۸) میں اس کا نام رسالہ درتقسیم علوم" درج ہے، سبحۃ المرجان میں بھی اس کا تذکرہ ہے، نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعریفاتِ سید جرجانی کے طرز پر یہ کوئی کتاب ہوگی جس میں علوم و فنون کی تعریف و تقسیم کا بیان ہوگا،

رسالہ درطہارتِ زیاد | قاضی صاحب کی تصانیف کی فہرست میں اس نام کی کوئی مستقل کتاب نہیں ہے، البتہ اُن کے اور شیخ ابوالفتح کے درمیان فقہی بحث و مناظرہ کے سلسلہ میں اس کا ذکر ملتا ہے، چنانچہ حضرت شاہ صاحب نے شیخ ابوالفتح کے تذکرہ میں قاضی شہاب الدین سے اُن کے مباحثہ کے ذکر میں لکھا ہے،

"و قاضی بطہارتِ او می رفت، و آنچہ وے در بعضے رسائل کہ بدین بحث تالیف کردہ نوشتہ است الخ"[1]

زباد یعنی کھٹے نافۂ مشک کو قاضی صاحب پاک اور شیخ ابوالفتح ناپاک مانتے تھے اس کی تفصیل پہلے گذرچکی ہے،

رسالہ افضلیت عالم برسید | اس کتاب کا نام بھی قاضی صاحب کی مستقل تصانیف میں نہیں ملتا، صرف مناقب السادات کی تصنیف کے سلسلہ میں اس کا پتہ چلتا ہے، شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ سید اجمل اور قاضی صاحب کے درمیان دربار میں تقدیم و تاخیر کے معاملہ میں تکرار ہوگئی، قاضی صاحب نے کہا "ماہیت ما شخص و تعیین است و علویت شما

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۷۰،

مشکوک، پس بار تقدیم و ترجیح بر شما ثابت باشد و دریں باب رسالہ نوشت[1]"

اس رسالہ کی تصنیف پر قاضی صاحب کے ایک استاد ناراض ہوگئے، اس لئے خود انہوں نے اپنے قول سے رجوع کرکے مناقب السادات لکھی، صاحب خزینۃ الاصفیا نے اس رسالہ کو کتاب کے نام سے یاد کیا، اور لکھا ہے "ازیں سبب کتابے در ذکر فضیلت علما بر سادات تصنیف کردہ، و دراں کتاب درج کردکہ فضیلت علما بسبب علم کہ ہست در عالم اظہر است و فضیلت علویت سادات موہوم کہ اثبات آن بس مشکل" پھر لکھا ہے، کہ قاضی صاحب نے بعد میں اس کتاب کو دریا برد کر دیا" و کتابے کہ تصنیف کردہ بود در دریا انداخت و بجائے آن در مناقب سادات رسالہ تالیف کرد[2]"

شرح اصول بزدوی | فخر الاسلام علی بن محمد بزدوی حنفی متوفی ۴۸۲ھ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الاصول فی الفقہ اصول فقہ پر نہایت مشہور اور جامع کتاب ہے، مگر الفاظ وعبارات میں اجمال و ابہام کی وجہ سے سخت مشکل ہے، اس لئے بہت سے علماء و فقہاء نے اس کے شروح و حواشی لکھے،

آٹھویں صدی میں جو مشکل پسندی کا دورِ شباب ہے، اس کے شروح و حواشی کا زور تھا، اور خود اصول بزدوی ہندوستان میں بہت رواج پذیر تھی، جونپور میں قاضی صاحب کے معاصر مولانا فقیہ جیرتی، اس کے رموز و نکات کے خصوصی ماہر اور مشہور مدرس تھے، اور بیسیوں بار اس کا درس دے چکے تھے، قاضی صاحب نے اپنے تلمیذ عزیز شیخ محمد بن عیسی جونپوری کی خاطر اصول بزدوی کی ایک شرح بحث امرتک تحریر فرمائی تھی شاہ صاحب شیخ محمد بن عیسی کے حال میں لکھتے ہیں، "۔ شرح اصول بزدوی

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۷۰، [2] خزینۃ الاصفیا ج ۱ ص ۳۹۱،

کہ قاضی ثابت امرتجربہ اونوشتہ است" (ص ۱۸۵) صاحب تذکرہ علمائے ہند نے بھی یہی لکھا ہے، (ص ۲۰۵)

شرح قصیدہ بانت سعاد | قصیدہ بانت سعاد وہ مشہور و مبارک قصیدہ ہے جسے حضرت کعب ابن زہیر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں پیش کیا تھا، اور آپ نے خوش ہوکر روائے مبارک عطا فرمائی تھی، اہل دل علما و ادبا نے مختلف انداز میں اسکی شرحیں لکھی ہیں، قاضی صاحب نے بھی ایک شرح تحریر کی ہے، جو بقول صاحب سبحۃ المرجان شرح بسیط علی قصیدۃ بانت یعنی قصیدہ بانت سعاد کی مفصل شرح ہے، (ص ۳۹)

تذکرہ علمائے ہند میں بھی اس شرح کا ذکر ہے، (ص ۸۸) یہ شرح مدت ہوئی دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد سے طبع ہوکر شائع ہو چکی ہے،

شرح قصیدہ بردہ | حضرت شیخ بوصیریؒ کا قصیدہ بردہ نعت و منقبت رسول میں بڑا پُر اثر اور والہانہ قصیدہ ہے، اور عباد و علما کو اس سے خاص شغف رہا ہے، اس کے بہت سے معاوضے تضمینیں اور شروح و حواشی لکھے گئے، قاضی صاحب نے بھی اس کی ایک شرح لکھی ہے، نزہۃ الخواطر (ج ۳ ص ۲۰) میں اس کی تصریح موجود ہے،

عقیدۂ شہابیہ | یہ کتاب کلام وعقائد میں ہے، اس کا تذکرہ فرشتہ نے ان الفاظ میں کیا ہے۔ "و رسالۂ عقیدۂ شہابیہ نیز از مولفات اوست" نزہۃ الخواطر میں بھی اس کا ذکر ہے، غالباً فارسی زبان میں کوئی مختصر سا رسالہ ہوگا،[1]

فتاوے ابراہیم شاہی | اپنے قدر داں اور محسن علم و فن سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے نام پر یہ کتاب عربی میں لکھی تھی، جس میں فقہی مسائل و فتاوے درج تھے، تاریخ فرشتہ (جلد ۲

---

[1] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۶،
نزہۃ الخواطر ج ۳ ص،

ص ۲۰۰ تذکرہ علمائے ہند ص ۹۰ میں اس کا نام فتاوی ابراہیم شاہی ہے مگر تجلی نور (جلد ۲ ص ۴۴) میں ہے "اصول ابراہیم شاہی بوی نوشتہ" اس میں نام کے اختلاف کے ساتھ اس کے عربی زبان میں ہونے کی تصریح ہے،

یہ واضح ہے کہ سلطان ابراہیم شاہ کے نام پر "فتاوی ابراہیم شاہیہ" نامی ایک کتاب قاضی احمد بن محمد جونپوری نے بھی لکھی تھی جس کے بارے میں صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ "فتاوی قاضی خاں کے طرز کی کتاب ہے، اور ۶۰ کتب فقہیہ سے ماخوذ و مرتب ہے، قاضی احمد بن محمد جونپوری سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے زمانہ میں گجرات سے جونپور آئے، سلطان نے اُن کو عنایاتِ شاہانہ سے نوازا، اور عہدۂ قضا پیش کیا، قاضی احمد نے اس کے شکرانہ میں سلطان کے نام پر یہ کتاب لکھی، طبقاتِ اکبری نے قاضی شہاب الدین کی کتاب فتاوی ابراہیم شاہی وغیرہ کو عہد ابراہیمی کی زریں یادگار بتایا ہے، "و چند کتب رسائل بنام او تصنیف شدہ، مثل حاشیہ ہندی و بحر المواج و فتاوی ابراہیم شاہی و ارشاد"[1]

مصباح | اس کتاب کا تذکرہ صرف تاریخ فرشتہ (ج ۲ ص ۳۰۶) میں ہے، یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کس فن اور کون سی زبان میں ہے،

معافیہ | اس کتاب کا تذکرہ صاحب کشف الظنون نے ان الفاظ میں کیا ہے،

المعافیہ للشیخ شہاب الدین بن شمس الدین بن عمر الدولت آبادی الہندی ذکرھا فی آخر ارشادہ[2]	معافیہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی کتاب ہے، انھوں نے اس کا تذکرہ الارشاد کے آخر میں کیا ہے،

---

[1] طبقات اکبری ص ۵۰۲، [2] کشف الظنون ج ۲ ص ۴۵۸،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود صاحب کشف الظنون نے اس کتاب کو نہیں دیکھا تھا، غالباً یہ عربی زبان میں علم نحو میں مختصر رسالہ رہا ہوگا

ہدایۃ السعداء | یہ کتاب فارسی میں تھی جس میں غالباً وعظ ونصیحت اور اخلاقیات سے متعلق مضامین تھے، اس کا تذکرہ نزہۃ الخواطر میں ہے،

ایک اور تفسیر | قرآن پاک کی آیت فَسُحْقًا لِّأَصْحَابِ السَّعِيرِ کی تفسیر میں کوئی کتاب لکھی تھی، اس کا پتہ کشف الظنون کی اس عبارت سے چلتا ہے،

کتاب عرف الورد فی نصرۃ	عرف الوردی فی نصرۃ الشیخ الہندی
الشیخ الھندی لمحمد بن ابراھیم	نامی کتاب محمد بن ابراہیم حلبی المعروف
الحلبی المعروف بابن الحنبلی	بہ ابن حنبلی متوفی ۹۷۱ھ کی تصنیف
المتوفی سنۃ احدی وسبعین	ہے جس میں عبد اللطیف مشہدی کا
تسعمائۃ، وھو رسالۃ فی الرد	رد ہے، مشہدی نے قاضی شہاب الدین
علی عبد اللطیف المشھدی	کی ایک کتاب کا رد لکھا تھا جسے انھوں نے
لما رد علی الشیخ شھاب الدین	آیت فسحقاً لاصحاب السعیر
احمد الھندی فی تالیفہ علی	کی تفسیر میں لکھا تھا،
قولہ تعالیٰ فسحقاً لاصحاب السعیر[1]	

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب نے اس آیت کی تفسیر میں کوئی کتاب لکھی تھی، جس کا رد شیخ عبد اللطیف مشہدی نے لکھا، اور مشہدی کے رد میں قاضی صاحب کی تائید میں شیخ محمد بن ابراہیم حلبی نے کتاب لکھی، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قاضی صاحب کی تصانیف عالم

---

[1] کشف الظنون ج ۲ ص ۱۱۲،

اسلام میں کس قدر مقبول و متداول تھیں، اور اُن کی بعض کتابوں پر علمائے اسلام میں جواب اور جواب الجواب کا سلسلہ چلتا تھا، اور اس میں مستقل کتابیں لکھی جاتی تھیں،

وفات: قاضی صاحب نے درس و تدریس، افتا اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ پوری زندگی علوم اسلامیہ کی خدمت میں بسر کی، اور دہلی، کالپی، اور جونپور ہر جگہ اُن کا فیض جاری رہا، مگر جونپور میں اُن کی زندگی کا تقریباً چالیس سالہ دینی و علمی دور حاصل زندگی ہے، اور اُن کے جوہر یہیں آکر کھلے، اُن کے حالات کا بیشتر حصہ اسی دیار سے تعلق رکھتا ہے، قاضی صاحب کی وفات ۲۵ رجب ۸۴۸ھ یا ۸۴۹ھ میں جونپور میں ہوئی، اور اپنے محلہ خواجگی میں دفن کئے گئے، اخبار الاخیار اور خزینۃ الاصفیا میں ۸۴۸ھ ہے، اور اخبار الاصفیا، اور سبحۃ المرجان، کشف الظنون، تذکرہ علمائے ہند، برکات الاولیاء، اور نزہۃ الخواطر میں ۸۴۹ھ درج ہے، اور اخبار الاصفیا، سبحۃ المرجان، تذکرۂ علمائے ہند اور نزہۃ الخواطر میں ۲۵ رجب کی تصریح ہے، البتہ برکات الاولیا میں ۲۵ رشوال ہے، اس سلسلہ میں فرشتہ کا بیان سب سے جداگانہ ہے، وہ لکھتا ہے کہ سلطان ابراہیم سے قاضی صاحب کو اس قدر محبت تھی کہ سلطان کی وفات کے غم میں اسی کی وفات ۸۴۰ھ میں وہ بھی عالم قدس میں تشریف لے گئے، اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ سلطان ابراہیم کی وفات کے دو سال کے بعد ۸۴۲ھ میں ان کا طائر روح روضۂ رضوان کی طرف پرواز کر گیا،[1]

تجلی نور میں وفات اور مدفن کے بارے میں تصریح ہے:-

"مولانا شہاب الدین در جونپور بمحلہ خواجگی قیام پذیر رفت، و بعد مدتے متصل

---

[1] تاریخ فرشتہ، ج ۲ ص ۳۰۶،

آن محلہ و دروازۂ جنوبی مسجد آثار مدفن یافت، ہنوز قبر ش سنگیں اندر احاطہ
شن اسکول موجود است، بہ سبب وارید زمانہ نشان مکانات و مدرسہ مولانا
بے نشان گشت، و اولاد ایشان ہم باقی نماندہ[1]"

صاحب خزینۃ الاصفیاء نے حسب ذیل تاریخ وفات کہی ہے،

شہاب الدین چوں رفت از عالم دہر | بجنت گشت روشن آں بہ علم
وصالش کن رقم "تو قیرا سلام" | دگر با "شہاب الدین بہ علم"

"جیسا کہ تجلی نور میں ہے قاضی صاحب کی اولاد کا سلسلہ نہیں چلا، اُن کی صرف ایک
زادی تھیں جن کا نکاح دہلی میں شیخ نصیر الدین بن شیخ نظام الدین غزنوی سے ہوا،
ہیں اُن کے بطن سے قاضی صاحب کے تین نواسے شیخ صفی الدین، شیخ رضی الدین اور
ز الدین پیدا ہوئے، اور سب نے اپنے نانا سے تعلیم حاصل کی، اور انہی نواسوں نے اپنے
علوم و معارف کی میراث پائی، اُن کے علاوہ قاضی صاحب کی علمی و روحانی اولاد اُن کے
و تھے،

---

[1] تجلی نور ج ۲ صفحہ ۳۷،

حیاتِ شبلی طبع دُوم

یہ نو سو صفحوں کی ضخیم کتاب صرف اس عہد کے ایک جامع کمالات بزرگ کی سوانح عمری نہیں
ہیں، بلکہ درحقیقت مولانا شبلی کے دور تک کے ہندوستانی مسلمانوں کے بچاس سالہ علمی، ادبی،
تعلیمی، مذہبی، ملی اور قومی تحریکات و واقعات کی ایک مستند تاریخ بن گئی ہے، شروع میں
ر کے بعد ایک مفصل مقدمہ ہے جس میں دیارِ مشرق میں علوم اسلامیہ کی تعلیم و اشاعت کی خدمت
یخ کے ساتھ ہر عہد کے مشاہیر علمائے درس و تصنیف کے حالات بھی آگئے ہیں، قیمت: [illegible]
منیجر

ادبیات

غزل

از جناب ماہر القادری

کس وہم میں اے دل! تو گرفتار ہوا ہے
آنکھوں سے کہیں دوست کا دیدار ہوا ہے[1]

کشتی کبھی قسمت سے جو پہنچی ہے کنارے
کشتی سے اترنا مجھے دشوار ہوا ہے

وہ راہ میں چلتے ہوئے نظروں کا تصادم
پیمانِ محبت سرِ بازار ہوا ہے

جو چاہے سزا دیجئے دل اُف نہ کرے گا
دل، جرمِ محبت کا گنہگار ہوا ہے

پرسش ہے، دعا ہے، نہ دوا ہے نہ تسلی
ایسے بھی علاجِ دلِ بیمار ہوا ہے

ہر سمت ہیں سجدوں کے نشاں راہِ وفا میں
تب جا کے کہیں راستہ ہموار ہوا ہے

یہ گرمیٔ احساس مری تشنہ لبی کی
اک شعلہ صراحی سے نمودار ہوا ہے

آتی ہے طبیعت تو پھر آتی ہے اندھا دھند
جب عشق ہوا ہے تو دھواں دھار ہوا ہے

یہ حال ہے سایہ بھی مرے واسطے ماہر
تپتی ہوئی جلتی ہوئی دیوار ہوا ہے

یہ ہجر کی شب ہے کہ شبِ قدر ہے ماہر
غم خانہ مرا جلوہ گہِ یار ہوا ہے

---

[1] لا تدرکہ الابصار

غزل

از جناب اثیم کانپوری

وہ جانِ محبت ہیں، وہ جانانِ محبت
وابستہ انھیں سے ہیں سب ارمانِ محبت

ہے دل کی تڑپ سلسلہ جنبانِ محبت
نازک ہے بہت رشتۂ پیمانِ محبت

اتنا بھی نہ ہو کوئی پریشانِ محبت
مرکز سے ہٹے جاتے ہیں ارمانِ محبت

جنبش میں ہمیشہ رہے دامانِ محبت
ہر سانس رہے سلسلہ جنبانِ محبت

شرمندہ ہوں میں اک غلط اندازِ نظر کا
اللہ رے بے ربطیٔ عنوانِ محبت

آنسو ہیں کہ امنڈے چلے آتے ہیں دمادم
اک قطرۂ خوں دل میں ہے طغیانِ محبت

سوزِ ابدی شمع کی قسمت میں لکھا ہے
پروانہ نہیں سوختہ سامانِ محبت

بن جائے گا آئینۂ تصویر سراپا
حیرت کدۂ حسن میں حیرانِ محبت

یہ راہِ حقیقت ہے کوئی کھیل نہیں ہے
جاتے ہو کہاں بے سر و سامانِ محبت

روشن ہے انھیں سے دلِ تاریک کی دنیا
جلوے جو چھپے ہیں تہِ دامانِ محبت

کچھ بھی تو اثیم اس کا ادا کر نہ سکے حق
ہم جان بھی دے کر ہیں پشیمانِ محبت

غزل

از جناب جمیل احمد صاحب ناگپوری

کیوں غم کا اثر لیتی دنیا تھی تماشائی
شبنم کے گرے آنسو غنچوں کو ہنسی آئی

چھیڑا تھا ابھی میں نے افسانہ محبت کا
دل کانپ اٹھا میرا وہ آنکھ جو بھر آئی

ہر وقت تصور رہتے میں جوش تیرے جلوے ہیں
محفل نظر آتی ہے صحرا کی بھی تنہائی

معلوم نہیں دنیا کیوں راہ میں حائل ہے
میں ان کا تمنائی وہ میرے تمنائی

ہم نے شب غم اپنی کس طرح گزاری ہے
سینے میں تیری یادیں لیتی رہیں انگڑائی

بگڑی ہوئی تقدیریں اس در پہ سنورتی ہیں
مایوس نہ ہو جانا اے شوق جبیں سائی

جب نام سنا ان کا رکتے نہ رکے آنسو
ہونا ہی پڑا مجھکو شرمندۂ رسوائی

کس جام میں کیا ہوگا، لا اور پلا ساقی
وہ دیکھ ہوا سنکی وہ دیکھ گھٹا چھائی

قسمت تو مری دیکھو محفوظ رہا ساحل
سو بار میری کشتی طوفان سے ٹکرائی

طلسم شوق

از جناب وحید الدین خاں ایم۔اے علیگ

قدم منزل کی جانب خود بخود بڑھنے لگے پیہم
حجابات مظاہر یک بیک اٹھنے لگے پیہم

یہ ہے ادنیٰ کرشمہ ارتقائے شوق پیہم کا
کہ اصنام نگاہ شوق بھی گرنے لگے پیہم

کرن پھوٹی افق سے تیرگی ہونے لگی رخصت
طیور خوشنوا حمد و ثنا کرنے لگے پیہم

ادھر شبنم نے منہ دھو کر نکھارا غنچہ و گل کو
ادھر جھونکے نسیم صبح کے چلنے لگے پیہم

عناصر کی کشاکش نے دکھائے دن یہ دنیا کو
کہ صدہا نقش ہائے زندگی مٹنے لگے پیہم

سمجھ میں آگیا کیا راز تخلیق دو عالم کا
کہ اجرام عناصر راہ سے ہٹنے لگے پیہم

یہ کون آیا تخیل میں کہ ہر تار نفس جھنکا
کہ کلیاں مسکرائیں پھول بھی ہنسنے لگے پیہم

کہیں پھولوں کی نکہت میں کہیں کلیوں کی نزہت میں
ہزاروں پردہ ہائے رنگ و بو اٹھنے لگے پیہم

نظر آنے لگے ہر شے میں جلوے حسن قدرت کے
نقوش ماسوا آئینہ سے مٹنے لگے پیہم

طلسم شوق ٹوٹا مظہر حسن ازل بن کر
ہوس کے جو نشیمن ہیں وہی جلنے لگے پیہم

مطبوعات جدیدہ

صبح مولانا ابوالکلام آزاد نمبر - مرتبہ جناب عبداللطیف صاحب اعظمی، تقطیع خورد، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۰۰۔ قیمت سے، پتہ جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو، علی منزل، کوچہ پنڈت، دہلی ۶

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی یادگار میں بہت سے رسالوں نے خاص نمبر شائع کیے، اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے، زیر نظر نمبر میں مولانا کی شخصیت، ادب وصحافت، افکار ونظریات اور بعض دوسرے کمالات سے متعلق سولہ[17] مضامین شامل ہیں، صف اول کے ادیبوں اور اہل قلم میں مولانا عبدالماجد دریابادی، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر سید عابد حسین، مالک رام اور اور آل احمد سرور، کے مضامین قابل ذکر ولائق مطالعہ ہیں "ابوالکلام آزاد کا ذہنی پس منظر" (عتیق صدیقی) بھی اہم مضمون ہے، اور بڑی محنت وتحقیق سے لکھا گیا ہے، دو مضامین "افکار آزاد اور چند قومی مسائل" (ضیاء الحسن فاروقی) اور "مولانا آزاد اور فلسفۂ اشتراکیت" (نصرت بانو روحی) میں مولانا کے افکار وخیالات کی بعض تعبیریں وتشریحیں محل نظر ہیں۔ گو اس نمبر کے بعض مضامین پرانے ہیں، تاہم اس سے اس کی قدر وقیمت میں فرق نہیں آتا، اور یہ مولانا پر نکلنے والے اچھے نمبروں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے، فاضل مرتب نے اس کو سلیقہ سے مرتب کرکے مولانا سے اپنی عقیدت کا حق ادا کیا ہے۔

شاعر ناولٹ نمبر - مرتبین جناب اعجاز صدیقی، ہندرناتھ، ڈاکٹر محمد حسن

مدیر فاضلی صاحبان، تقطیع متوسط، کاغذ بہتر، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۰

قیمت معہ ، پتہ مکتبہ قصر الادب، پوسٹ بکس نمبر ۵۲۶ بمبئی ۸ بی، سی

یہ مشہور ادبی رسالہ شاعر کا ناولٹ نمبر ہے، جو اس حیثیت سے قابل ذکر ہے کہ اس میں موجودہ دور کے سترہ ناول نگاروں کے ناول اور ناولٹ کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، کوثر چاندپوری، سہیل عظیم آبادی اور رام لعل وغیرہ مشاہیر ناول نگاروں کے نام اس کی کامیابی کی ضمانت ہیں، خواجہ احمد عباس، سہیل عظیم آبادی، رام لعل، واجدہ تبسم اور جوگندر پال کے ناول گہرے تجربات و مشاہدات پر مبنی اور تکنیک کے اعتبار سے دلکش ہیں، شروع میں ڈاکٹر محمد حسن نے موجودہ اردو ناول نگاری کا سرسری تنقیدی جائزہ لیا ہے، اس نمبر کی تزئین و آرائش کا بڑا اہتمام کیا گیا ہے، عنوانات کی فہرست کے ساتھ ہی ناول و ناولٹ نگاروں کے فوٹو اور اندرونی سرورق پر ناولٹوں کے مرکزی خیال کو تصویروں کے ذریعہ نمایاں کیا گیا ہے، اس طرح یہ صوری حیثیت سے بھی دیدہ زیب ہے، ہر ناول نگار کے حالات و ادبی کمالات کا مختصر مرقع بھی دیا گیا ہے، شاعر کے گذشتہ خاص نمبروں کی روایت کے مطابق یہ نمبر بھی ضخیم اور بلند پایہ ہے، جو اردو ناول میں ایک عمدہ اضافہ ہے۔ امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

آجکل فلم نمبر مرتبہ جناب شہباز حسین صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۵۴۲ پتہ: پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱

اس خاص نمبر میں فلم سے متعلق مختلف عنوانات کے تحت اس کے مختلف پہلوؤں پر مضامین شائع کیے گئے ہیں، اور فلموں کے آغاز و ارتقا کی سرگذشت، ان کے بننے کے طریقے قومی فلمی اداروں، علاقائی زبانوں کی مشہور فلموں اور ان کے سماجی و جمالیاتی پہلوؤں وغیرہ

کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس نمبر کی اشاعت کا مقصد بیان کرتے ہوئے مرتب نے اعتراف کیا ہے کہ "مخرب اخلاق ہونے کا الزام اب بھی اس (فلم) پر عائد ہے، اور حقیقت پسندانہ اور زندگی کی صحیح و سچی عکاسی کرنے والی فلمیں کم مقبول ہوتی ہیں"، اور یہ واقعہ ہے کہ موجودہ فلمی صنعت سے سماجی و اخلاقی اصلاح اور دوسرے فوائد کم حاصل ہوتے ہیں اور نوجوان ان سے اخلاقی جرائم کا سبق سیکھتے ہیں، اور کم سے کم مشرقی آداب و تہذیب سے میل نہیں کھاتا، اداریہ میں ادب اور فلم کا بنیادی مقصد تفریح بتایا گیا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو ان سے مفید نتائج پوری طرح بر آمد نہیں ہو سکتے، اخلاقی اقدار کو اضافی بتانا عجیب ہے، اس نمبر میں فلم سازی خصوصاً ہندوستانی فلموں سے متعلق متنوع معلومات اور مشہور فلمی کلاکاروں کے فوٹو بھی دیے گئے ہیں۔

فروغ اردو محسن کاکوروی نمبر۔ مرتبہ جناب محمد حسین شمس علوی صاحب، تقطیع کلاں

کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۰۰، قیمت ہے، پتہ ادارۂ فروغ اردو امین آباد پارک، لکھنؤ۔

فروغ اردو کے خاص نمبر اکثر نکلتے رہتے ہیں، یہ نمبر اردو کے مشہور نعت گو حسان الہند حضرت محسن کاکوروی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے شائع کیا گیا ہے، وہ اگرچہ بڑے پایہ کے شاعر تھے، اور ہر صنف سخن پر پوری قدرت رکھتے تھے، مگر عشق نبوی نے مدح رسول کے سوا ان کی زبان کو اور اصناف سخن سے زیادہ آلودہ نہیں ہونے دیا، نعت گوئی مشکل بھی ہے اور نازک بھی، انھوں نے احتیاط اور ادب و محبت کے حدود میں رہ کر ایسی گلکاریاں کی ہیں جن کی نظیر اردو شاعری میں نہیں ملتی، اس نمبر کے مضامین میں محسن کے نعتیہ کلام کی خصوصیات اور نعت گوئی میں ان کا کمال دکھایا گیا ہے اور

بعض مضامین میں ان کی شخصیت اور حالات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے، آخر میں ان کے نعتیہ کلام کا مختصر انتخاب ہے، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی اور ڈاکٹر انوار الحسن کے مضامین اور مولانا عبد الماجد دریابادی کا پیغام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

جمعیۃ ٹائمز مسلم یونیورسٹی نمبر مرتبہ جناب علی محمد صاحب تقطیع کلاں، قیمت ۵/ کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔ پتہ:- ۶۱۶ مٹیا محل دہلی ۶

دہلی کے ہفت روزہ جمعیۃ ٹائمز کے علی گڑھ نمبر کا غلغلہ کئی مہینوں سے بلند تھا، اس کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں، کہ مرکزی حکومت نے اس کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی، اس لیے فسادات سے متعلق حصہ شائع نہیں ہو سکا، اور اس نمبر میں صرف یونیورسٹی سے متعلق مضامین ہیں جس میں یونیورسٹی کی اہمیت، اس کے مقاصد اور گذشتہ و موجودہ حالات کا ذکر اور یونیورسٹی کی خصوصیات کو جس طرح ختم کیا گیا ہے، اس کی تفصیل ہے، اور آیندہ پیش ہونے والے یونیورسٹی بل کے متعلق مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی اور حکومت سے اس کے کردار کے تحفظ کا مطالبہ کیا گیا ہے، بعض مضامین میں لہجہ جذباتی اور سخت ہو گیا ہے، ایک مضمون سرسید کے تعلیمی نظریات پر بھی ہے، اور بعض موثر نظمیں بھی ہیں، اس نمبر کی اشاعت نے وقت کی ایک ضرورت کو پورا کیا ہے۔

مرزا غالب ۔ مرتبہ ڈاکٹر امرت لعل عشرت صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۴۰ مجلد مع گردپوش، قیمت ۱۲ روپے۔ پتہ: (۱) پرشوتم سنگھ سیٹھی، راجہ بھون، ریتھ روڈ، لکھنؤ، (۲) ڈاکٹر امرت لعل عشرت، راشٹ بھون، بھیلوپور، کالونی، بنارس۔

غالب صدی کے موقع پر غالب صد سالہ جشن کمیٹی یو، پی کی جانب سے نظم و نثر کے

مضامین کا یہ مجموعہ شائع کیا گیا تھا جس کو کمیٹی کے اڈیٹوریل بورڈ کے کنوینر اور بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے صدر جناب امرت لعل عشرت نے ترتیب دیا ہے، مضمون نگاروں میں فراق گورکھپوری، ڈاکٹر سید اعجاز حسین، جگن ناتھ آزاد، عرش ملسیانی، احتشام حسین اور خود فاضل مرتب اور شعراء میں آنجہانی تلوک چند محروم، نذیر بنارسی اور نازش پرتاپگڈھی کے نام قابل ذکر ہیں، جگن ناتھ آزاد کا مضمون "غالب اور اقبال" گو پہلے چھپ چکا ہے، مگر خاصے کی چیز ہے، سب سے زیادہ مبسوط مضمون "غالب کا مذہبی عقیدہ" (سید سلیمان عباس رضوی) ہے، اس میں غالب کو شیعی ثابت کیا گیا ہے، ان کی شیعیت صحیح ہو یا غلط، اس مضمون کے انداز تحریر سے دوسرے فرقہ کے لوگوں کی دلآزاری ہوسکتی ہے، مجموعی حیثیت سے غالب پر یہ اچھی پیش کش ہے۔

سیر غالب ۔ مرتبہ جناب حکیم ابوالحسنات بیدل فاروقی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۵۶۔ قیمت للعہ پتہ:۔ مکتبہ دارالحسنات میرکوٹ، سہارنپور۔

یہ کتاب مرزا غالب مرحوم کی مختصر سوانح عمری ہے، اس میں ان کے خاندانی حالات پیدائش سے وفات تک کے واقعات اور اخلاق وعادات کے ساتھ ان کے ادبی کارناموں کا تذکرہ ہے، تصنیفات پر تبصرہ اور شاعری وانشاء پردازی کی خصوصیات وغیرہ بھی بیان کی گئی ہیں، مصنف اگرچہ سن رسیدہ ہیں لیکن غالباً یہ انکی پہلی تصنیف ہے، اس لیے اسکی ترتیب میں ناہمواری، طرز تحریر میں الجھاؤ، الفاظ اور جملوں کے در و بست میں نا پختگی اور زبان و بیان میں خامی پائی جاتی ہے، اس کے علاوہ اس میں رطب ویابس ہر قسم کا مواد شامل کر لیا گیا ہے، اس کے باوجود مصنف کی محنت قابل ستایش ہے۔

قادر نامۂ غالب ۔ مرتبہ جناب عبد القوی دسنوی صاحب تقطیع خورد

کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۲، قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے ۔

پتہ : شعبۂ اردو سیفیہ کالج، بھوپال ۔

جناب عبد القوی دسنوی صدر شعبۂ اردو، سیفیہ کالج بھوپال، غالب پر متعدد تحقیقی مضامین اور کتابچے لکھ چکے ہیں، اب انھوں نے قادر نامۂ غالب کا متن ایڈٹ کرکے شائع کیا ہے، یہ مختصر اور دلچسپ منظوم کتاب مرزا نے اپنے متبنیٰ عارف کے دونوں بچوں باقر علی خاں اور حسن علی خاں کے لیے لکھی تھی، گو اس کے متعدد اڈیشن شائع ہو چکے ہیں لیکن عبد القوی دسنوی صاحب نے اس کو اس پروگرام کے مطابق شائع کیا ہے جو شعبۂ اردو سیفیہ کالج نے بچوں کو عربی، فارسی، ترکی اور ہندی کے ہم معنی الفاظ سکھانے کے لیے بنایا ہے اور جس کے ماتحت وہاں سے اس نوع کی اور کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں، شروع میں لائق مرتب کے قلم سے ایک مختصر و جامع پیش لفظ بھی ہے، اس میں قادر نامہ کے غالب کی تصنیف ہونے کے دلائل تحریر کیے گئے ہیں، امید ہے غالب کے قدر دانوں کے حلقے میں یہ کتاب پسند کی جائے گی۔

نقشہائے رنگ رنگ ۔ مرتبہ جناب عطا کاکوی صاحب، تقطیع خورد

کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۹۶ قیمت ۳ ؎ پتہ : عظیم الشان بکڈپو

سلطان گنج، پٹنہ ۔ ۶

یہ غالب کے فارسی کلام کا ایک مختصر انتخاب ہے، جو غزلیات، قطعات، قصائد، رباعی مثنوی اور خمسہ وغیرہ مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہے، مرزا کو اپنی فارسی شاعری پر زیادہ ناز تھا، اس حیثیت سے انکے فارسی کلام کی یہ قدر دانی لائق تحسین ہے، مگر اس کی قیمت زیادہ ہے ۔

"ض"

رجسٹرڈ نمبر ال ([illegible]) نومبر ۱۹۷۱ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

مجلسِ ادارت

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارمِ اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات و احکام و قوانین کے لحاظ سے بلا تفریق مذہب ملت نسل ورنگ زاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے، اور اسی کو اختیار کرنے اور اُسی کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے یہاں سے اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے جن میں اہلِ کتاب اور مشرکین عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب داخل ہیں، اور حیوانات کے حقوق، اور ان سب کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات اُن کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں اُن کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا ہے،

......(مرتبہ)......

شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت:- ۳۲۰ صفحے قیمت:- ۶ؔ

جلد ۱۰۸ ماہ رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۷۱ء عدد ۵

مضامین

مقالات

وفیات

ادبیات

تصحیح: گذشتہ مہینہ جمیل احمد صاحب کے نام سے جو غزل شائع ہوئی ہے وہ محمد شرف الدین صاحب ساحل کی ہے، غلطی سے جمیل احمد صاحب کے نام سے شائع ہو گئی ہے، مقطع میں "مخفنا" کی بجائے "مخفوظ" چھپ گیا ہے، ناظرین تصحیح کر لیں۔

شذرات

افسوس ہے کہ مشہور ماہر تعلیم سید اسد اللہ صاحب کاظمی نے کراچی میں انتقال کیا، وہ مسلم یونیورسٹی کے نامور فرزند تھے، حصول تعلیم کے بعد کچھ دنوں یونیورسٹی ہی میں انگریزی کے استاد رہے، پھر صوبہ متحدہ کے محکمۂ تعلیمات سے وابستہ ہوگئے، اور ڈپٹی ڈائرکٹری کے عہدہ تک پہنچے، اسی زمانہ میں ریاست کشمیر کے ڈائرکٹر تعلیمات ہوگئے، ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد یونسکو کی طرف سے کئی سال تک حکومت بغداد کے مشیر تعلیم رہے، اس طرح ان کی پوری عمر تعلیمی تجربات میں گذری، مسلمانوں میں وہ ماہر تعلیم مانے جاتے تھے، ان کو مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے بڑی دلچسپی تھی، اور ان کی تعلیمی تنظیموں کو اپنے تجربات اور مفید مشوروں سے فائدہ پہنچاتے تھے علم و ادب کا بلند اور ستھرا مذاق رکھتے تھے، مذہبی مطالعہ بھی وسیع تھا، راسخ العقیدہ پابند مذہب مسلمان تھے، کلام مجید کے مطالعہ کا خاص ذوق تھا، بغداد کے قیام کے زمانہ میں کچھ عربی بھی سیکھ لی تھی اللہ تعالیٰ نے اُن کو دین و دنیا دونوں سے نوازا تھا، عالم آخرت کی نعمتوں سے بھی سرفراز فرمائے۔

دوسرا حادثہ اُردو کے بزرگ شاعر افقر موہانی کی وفات کا ہے، اپنے معاصرین میں وہ تنہا رہ گئے تھے، ان کی عمر کا اب کوئی شاعر زندہ نہیں ہے، وفات کے وقت ۹۰ سال کی عمر تھی، وہ استادفن تھے، پرانے اساتذہ کی طرح زبان کی باریکیوں پر اُن کی نظر بڑی گہری تھی، اور شاعری میں اس کا بڑا اہتمام رکھتے تھے اُن کے دامن تربیت میں بہت سے شعرا رہے، اُن کے تلامذہ کا دائرہ وسیع تھا، صاحب قلم بھی تھے ایک زمانہ میں ایک سالہ جام جہاں نما کے نام سے نکالتے تھے، مگر عرصہ سے لکھنا چھوٹ گیا تھا، مگر مشق سخن برابر جاری تھی کبھی کبھی معارف میں بھی اپنا کلام بھیجتے تھے، حاجی وارث علی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے، ان کی یادگار میں ہر سال

بڑے اہتمام سے مشاعرہ کرتے تھے، انکی موت سے ایک استاد فن شاعر اٹھ گیا، رمضان المبارک میں موت یوں بھی نشانِ مغفرت ہے، اللہ تعالیٰ انکو مزید رحمتوں سے نوازے،

عارف عباسی بھی اللہ کو پیارے ہوگئے، وہ اس دور کے ممتاز غزل گو اور جگر کے طرز کے کامیاب مقلد تھے، انھوں نے اپنی ظاہری وضع قطع بھی انہی کی جیسی بنالی تھی، ان کا مکان اعظم گڈھ سے متصل ضلع بلیا میں تھا اسلئے اعظم گڈھ میں اُن کے پرانے تعلقات تھے اور یہاں برابر اُن کی آمد و رفت رہتی تھی پہلے جب اعظم گڈھ آنا ہوتا تھا تو دارالمصنفین ضرور آتے تھے، اور اپنے تازہ کلام سے محظوظ کرتے تھے، مگر ادھر کچھ دنوں سے اس وضعداری میں فرق آگیا تھا، عرصہ تک اُن کی غزلیں معارف میں چھپتی رہیں، اُن کے تغزل میں بڑی لطافت و پاکیزگی تھی، ابتدا میں راجہ صاحب نانپارہ کے لڑکوں کے اتالیق رہے تھے، اسلئے درباری آداب اور علم مجلس کے بڑے ماہر تھے، اُن کی عمر ساٹھ باسٹھ سال کی رہی ہوگی، ادھر کچھ دنوں سے کچھ قلبی شکایت ہوگئی تھی، اسی نے مرض الموت کی شکل اختیار کر لی، اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے،

اترپردیش کی حکومت نے جو اُردو اکیڈمی قائم کی ہے بعض حلقوں میں اس کا بڑا خیر مقدم ہورہا ہے اور اُس سے اُردو کے بارہ میں بڑی امیدیں قائم کی جارہی ہیں، اکیڈمی کے جو اغراض و مقاصد شائع ہوئے ہیں، اس سے اتنا اندازہ تو ضرور ہوتا ہے کہ اب اُردو سے عناد باقی نہیں رہا، اگر ان مقاصد پر عمل ہو، تو اُردو کو پنپنے کا کچھ موقع مل سکتا ہے، پہلے اُردو کے نام سے جو شہ تھی، اُردو کتابوں پر انعامات اور اُن کی طبع و اشاعت اور اردو لائبریریوں میں ان کی خریداری کے لئے جو حقیر رقم ملتی تھی، وہ بھی ہندی کے طفیل میں تھی مگر اب ان کاموں کے لئے ایک معقول رقم اُردو کے نام سے مخصوص کردی گئی ہے، باقی اُردو کی بقا و ترقی کے وسائل اور اس سے متعلق شکایتوں کے ازالہ وغیرہ کے بارہ میں جو باتیں کہی گئی ہیں، اصل سوال اُن پر عمل کا ہے، ورنہ اس قسم کے وعدے تو ہر حکومت

کرتی چلی آئی ہے جس پر آج تک عمل نہیں ہوا، اب اکیڈمی کے ذریعہ اس کا تجربہ کرنا ہے۔

اُردو کا اصل مسئلہ اُس کی تعلیم کا ہے، جبتک ابتدائی اور ثانوی اسکولوں میں اس کا قابلِ اطمینان انتظام نہیں ہوتا، اس قسم کی اکیڈمیوں کے قیام سے کوئی بڑا فائدہ نہیں، اُردو کے مطالبات سے حکومت پوری طرح واقف ہے، مرکزی انجمن ترقی اُردو اور دوسری مجالس ان کو بار بار پیش کر چکی ہیں، اگر واقعی حکومت اُردو کے معاملہ میں مخلص ہے تو ان مطالبات کو مان کر اس کا ثبوت دینا چاہئے، ورنہ کم سے کم اُردو کو جو حقوق بھی ملیں اُس کی حیثیت قانونی ہونی چاہئے، محض اُردو اکیڈمی کے قیام سے اُردو زندہ نہیں رہ سکتی،

اگر اکیڈمی کے اغراض و مقاصد پر عمل درآمد ہو تو بھی غنیمت ہے جو بڑی حد تک اُردو کے ساتھ اُس کے ممبروں اور عہدہ داروں کی ہمدردی اور دلچسپی پر موقوف ہے، ممبروں کے نام کا تو ابھی اعلان نہیں ہوا ہے، اس کے صدر اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کملا پتی ترپاٹھی اور سکریٹری تربھون پرشاد ہوے ہیں جن کو اُردو سے کوئی تعلق نہیں، اگر اکیڈمی کے ذریعہ واقعی کچھ کرنا ہے تو ان دونوں عہدوں کے لئے ایسے اشخاص کا انتخاب ہونا چاہئے جو اُردو سے پوری طرح واقف ہوں اور جن کو اس سے ہمدردی بھی ہو، سرکاری آدمی کا ہونا ضروری نہیں ہے، اس لحاظ سے صدارت کے لئے سب سے موزوں شخصیت پنڈت آنند نرائن مُلا کی ہے، سکریٹری کے عہدہ کے لئے بھی ایسے اشخاص مل سکتے ہیں، ایک نام تو حیات اللہ صاحب انصاری کا ہے، جن کی حیثیت سرکاری بھی ہے، اور وہ اردو کے مشہور وکیل اور ادیب بھی ہیں

مقالات

اقبال کی تعلیمات پر ایک نظر

از شاہ معین الدین احمد ندوی

(۲)

مسلمانوں کا منصب و مقام یہ سارا معجزہ اسلام کا تھا، اسی نے اُن میں زندگی کی روح پھونکی تھی۔ اور اسی کے بدولت انھوں نے دنیا میں سربلندی حاصل کی، اس نے جب سے اس کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹا دین کے ساتھ دنیا نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور حکومت و اقتدار، علم و فن اور تہذیب و تمدن بھی اُن سے رخصت ہو گئے، اور وہ دنیا میں ایک فلاکت زدہ قوم بن کر رہ گئے۔ اور جن قوموں کی انھوں نے امامت کی تھی۔ خود اُن کے غلام بن گئے،

اقبال اور حالی دونوں نے اس زبوں حالی کا ماتم کیا ہے۔ لیکن اقبال نے ماتم کے ساتھ مسلمانوں کے امراض اور اُن کے زوال کے اسباب کی تشخیص کر کے اس کا علاج بھی بتایا ہے، اور ان پر زندگی کے اسرار و رموز ظاہر کر کے دوبارہ اُن میں روح پھونکنے کی کوشش کی ہے، ان کا پورا کلام اس روح سے معمور ہے، وہ مسلمانوں کی زبوں حالی پر اُن کو دل شکستہ اور مایوس نہیں کرتے، بلکہ ان کا اصلی منصب و مقام

بنا کر ان میں زندگی کا جوش و ولولہ پیدا کرتے ہیں:۔

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو	قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں ہے تو
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو	دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیامِ ناز کا	جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ	تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے
اب تلک شاہد ہے جس پر کوہِ فاراں کا سکوت	اے تغافل پیشہ تجھکو یاد وہ پیماں بھی ہے
تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا	ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے
آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا	دانہ تو، کھیتی بھی تو حاصل بھی تو
آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے	راہ تو رہبر بھی تو منزل بھی تو
کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے	ناخدا تو بحر تو کشتی بھی تو ساحل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا	مے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو	خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے (شمع و شاعر)

ایک دوسرے مقام پر کہتے ہیں:۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے	یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی	ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا	خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا	تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے

جہانِ آب و گِل سے عالمِ جاوید کی خاطر نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا

لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا (طلوعِ اسلام)

ایمان و یقین اس منصب و مقام کو حاصل کرنے کے لئے جیسا کہ اقبال نے آخری شعر میں اشارہ کیا ہے، یہ ضروری ہے کہ مسلمان اپنے میں وہ اوصاف پیدا کریں، جنھوں نے اُن کو دنیا میں سربلند کیا تھا، اور جن کی بدولت وہ صدیوں تک تمام دنیا کی قوموں کی امامت کرتے رہے، یہ وصف اسلام سے شیفتگی اور اس کی تعلیمات پر عمل سے پیدا ہوتا ہے، اسلام نام ہے چند حقائق پر یقینِ واثق، ایمانِ کامل، اُن کے مطابق عمل، اور اس کے لئے ایثار و قربانی کا، اس راہ میں جو مشکلات و مصائب بھی پیش آئیں اُن کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا جائے، اگر جان دینے کی ضرورت پیش آئے تو اس کو بھی بلا تکلف نثار کر دیا جائے، اور اس کو سب سے بڑی سعادت اور سب سے بڑی کامیابی سمجھا جائے،

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

چنانچہ شہادت کے موقع پر صحابۂ کرام کی زبان سے بے اختیار "فُزتُ بربّ الکعبۃ" نکل جاتا تھا،

اسلام تو ایک وسیع نظامِ حیات ہے جس سے زندگی کا کوئی گوشہ باہر نہیں ہے لیکن اس کا اصل الاصول توحید اور اعلاء کلمۃ اللہ ہے، یہ کہنے کو تو دو لفظ ہیں، لیکن اسلام کی ساری تعلیمات اور نظام کا خلاصہ اس میں آجاتا ہے، توحید ہی وہ منبع ہے جس سے انسانی فوز و فلاح کے سارے چشمے پھوٹتے ہیں، توحید کے معنی یہ ہیں کہ

سوا اللہ کا خوف بالکل دل سے نکل جائے توحید انسان میں ایسی قوت پیدا کر دیتی ہے کہ پھر وہ دنیا کی کسی طاقت کو نگاہ میں نہیں لاتا، اعلاء کلمۃ اللہ کے معنی ہیں دنیا میں نیکی اور بھلائی کی تبلیغ، اور اس کا عملی نفاذ اور قیام، اس بار گراں کی حامل امت اسلامیہ ہے، دنیا کا کوئی نظام، کوئی فلسفہ، موجودہ اصطلاح میں کوئی ازم بھی اس پر ایمان و یقین کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا، اسلام بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، بلکہ اسلام نام ہی ہے چند ابدی صداقتوں پر یقین واثق کا، اس فلسفہ کو اقبال نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے،

دین ہو، فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو — ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
حرف اس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں — ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

دین و دنیا کی تمام کامیابیوں کا راز اسی ایمان و یقین پر ہے،

گمان آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا — بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے — وہ کیا تھا، زور حیدر، فقر بوذر، صدق سلمانی

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا — تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا
غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں — جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
ولایت، بادشاہی، علم اشیا کی جہانگیری — یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے — ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم — جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

(طلوع اسلام)

عمل اور جوشِ کردار | کسی مقصد سے شیفتگی کا لازمی نتیجہ اس کے لئے عملی جد و جہد ہے اگر

سے قوموں کی تقدیر بنتی اور بگڑتی ہے جنت وجہنم بھی عمل ہی کا نتیجہ ہے،

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

انسان بڑے بڑے کارنامے جوشِ عمل ہی کے بدولت انجام دیتا ہے، اسی سے میدانِ جہاد میں مردِ مومن کی تکبیر خدا کی آواز بن جاتی ہے۔

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع
کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز

جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز

صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر
جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز

زندگی کا فلسفہ | ایک نظم میں انھوں نے حضرت خضر کی زبان سے قوموں اور ملتوں کی موت وحیات کا پورا فلسفہ بیان کر دیا ہے، جس میں زندگی کے اہم عناصر آگئے ہیں؛

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار — تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب — تا بدخشاں پھر وہی لعل وگہر پیدا کرے
سوئے گردوں نالۂ شبگیر کے بھیجے سفیر — رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے (خضرراہ)

عشق کی عظمت | اقبال نے عشق کو بڑے وسیع اور مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے ان میں قدرِ مشترک کسی اعلیٰ و برتر مقصد سے والہانہ شیفتگی اور اس کے لئے جان فروشی وجاں سپاری ہے، ہر مقصد اور نصب العین کی کامیابی کے لئے خواہ دینی ہو یا دنیاوی والہانہ لگن ضروری ہے، یہی لگن انسان میں وہ جذبہ وقوت پیدا کرتی ہے جس سے وہ اس راہ میں ہر قربانی اور اپنا سارا خانماں لٹانے کے لئے تیار ہوجاتا ہے، مغربی قومیں مادی ترقی کے لئے کیسی کیسی قربانی اور جانفروشی کرتی ہیں دین کا جذبۂ عشق تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے "الذین آمنوا اشد حبا للّٰہ" اس کی راہ میں موت بھی حیاتِ ابدی ہے "ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربھم" اس عشق کی بدولت انسان ایسے ایسے کارنامے انجام دیتا ہے، جو عام طاقتِ بشری سے باہر ہیں، جب تک مسلمانوں میں اسلام کے ساتھ یہ جذبۂ عشق رہا، انھوں نے بڑی بڑی حکومتوں کے تختے الٹ دیئے۔ اور صدیوں دنیا کے بڑے حصہ پر حکمراں رہے، اور دوسری قوموں کو علم وعرفان اور تہذیب وتمدن کا درس دیتے رہے، جب سے یہ جذبہ سرد پڑا، ان پر زوال طاری ہوگیا، اور وہ خود ان قوموں کے غلام بن گئے۔ اس لئے اقبال نے بڑے موثر

اور نگارنگ پیرایوں میں اس جذبۂ عشق کی عظمت و اہمیت بیان اور اس کو دوبارہ مسلمانوں میں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، ان کے نزدیک عشق کی اصل اس دنیا کے عناصر سے ماورا، اور اس کی قوت بے پناہ ہے، اس کی نگاہ سے سنگ خارا کا جگر شق ہو جاتا ہے، عشق خود سراپا حق اور اس کی قوت حق کی قوت بن جاتی ہے، اس کی انگلی کے اشارے سے چاند شق ہو جاتا ہے، جب انسان کی خودی عشق ومحبت سے مستحکم ہو جاتی ہے، تو اس کی طاقت سارے عالم کی حکمراں اور سارے دنیا کے جھگڑوں میں حکم اور دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ اور حکومتیں اس کی تابع فرمان بن جاتی ہیں،

عشق را از تیغ و خنجر باک نیست اصل عشق از آب و باد و خاک نیست
از نگاہ عشق خارا شق شود عشق حق آخر سراپا حق شود
از محبت چوں خودی محکم شود قوتش فرمان دہ عالم شود
در خصومات جہاں گردد حکم تابع فرمان او دارا و جم

دونوں عالم عشق کے آثار سے معمور ہیں، عشق ہی کی بدولت بنی آدم خلافت ارضی کا مستحق قرار پایا،

در دو عالم ہر کجا آثار عشق ابن آدم سرے از اسرار عشق
"حرف انی جاعل" تقدیر او از زمیں تا آسماں تفسیر او"

(اسرار خودی)

ایک نظم میں عشق کی عظمت ان الفاظ میں بیان کی ہے،

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

صدق خلیل بھی ہے عشق صبر حسین بھی ہے عشق — معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

ایک نظم میں علم و عشق کا موازنہ کرکے عشق کی عظمت و برتری دکھائی ہے۔

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن — عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن

بندۂ تخمین و ظن کرم کتابی نہ بن — عشق سراپا حضور علم سراپا حجاب

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات — علم مقام صفات عشق تماشائے ذات

عشق سکون و ثبات عشق حیات و ممات — علم ہے پیدا سوال عشق ہے پنہاں جواب

عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں — عشق کے ادنیٰ غلام صاحب تاج و نگیں

عشق مکان و مکیں عشق زمان و زمیں — عشق سراپا یقیں اور یقیں فتح باب

شرع محبت میں ہے عشرت منزل حرام — شورش طوفان حلال لذت ساحل حرام

عشق پہ بجلی حلال عشق کا حاصل حرام — علم ہے ابن الکتاب عشق ہے ام الکتاب

(ضرب کلیم)

یہ واضح رہے کہ علم سے ان کی مراد دنیاوی علوم ہیں جن کی بنیاد ذہنی قیاسات پہ ہوتی ہے، اور ان کا مقصد ہی انسان کی محض ذہنی و دماغی تربیت ہے، ان کو قلبی وجدان سے بحث نہیں ہوتی، اس لئے ان سے ذہنی و دماغی تربیت تو ضرور ہو جاتی ہے لیکن انسان ایمان و یقین کی لذت سے محروم رہتا ہے جس پر انسانی فوز و فلاح کا دارو مدار ہے۔

ایک دوسری نظم میں عقل کے مقابلہ میں عشق کی عظمت دکھائی ہے، اسکے چند اشعار یہ ہیں:

مومن از عشق است و عشق از مومن است — عشق را ناممکن ما ممکن است

عقل در پیچاک اسباب و علل عشق چوگاں باز میدانِ عمل

عشق صید از زورِ بازو افگند عقل مکار است و دامے می نہد

عقل را سرمایہ از بیم و شک است عشق را عزم و یقیں لاینفک است

عقل چوں باد است ارزاں در جہاں عشق کمیاب و بہائے او گراں

عقل محکم از اساسِ چون و چند عشق عریاں از لباسِ چون و چند

عقل می گوید کہ خود را پیش کن عشق گوید امتحانِ خویش کن

عقل گوید شاد شو آباد شو عشق گوید بندہ شو آزاد شو

عشق را آرام جاں حریت است ناقہ اش را سارباں حریت است

آں شنیدستی کہ ہنگام نبرد عشق با عقلِ فسوں پرور چہ کرد

یعنی مومن اور عشق لازم ملزوم ہیں، دونوں کا وجود ایک دوسرے سے وابستہ ہے عشق کے سامنے ناممکن بھی ممکن ہے، عقل اسباب و علل کے پھیر میں گرفتار رہتی ہے، اور عشق میدان عمل کا کھلاڑی ہے، عشق اپنے قوتِ بازو سے شکار کرتا ہے اور عقل مکار شکار کو پھنسانے کے لئے جال بچھاتی ہے، عقل کا سارا سرمایہ خوف اور شک و شبہات ہیں، اور عشق کا مایۂ خمیر عزم و یقین ہے، عقل دنیا میں ہوا کی طرح ارزاں ہے، اور ہر جگہ پائی جاتی ہے لیکن عشق کمیاب اور بڑی قیمتی چیز ہے، عقل کا استحکام چون و چرا سے ہوتا ہے، اور عشق چون و چرا سے بالکل بے نیاز ہوتا ہے، عقل کہتی ہے کہ اپنے کو دنیا کے سامنے پیش کرو لیکن عشق کہتا ہے کہ پہلے اپنا احتساب کرو، عقل کہتی ہے کہ دنیا میں شاد آباد رہو، عشق کہتا ہے کہ خدا کا بندہ بن کر آزاد رہو، عشق کے لئے حریت آرام جان ہے، ان کے ناقہ کا ساربان حریت ہے، تم نے سنا نہیں کہ میدان جنگ میں عشق نے عقلِ فسوں پرور کے ساتھ کیا کیا،

اس کے بعد واقعۂ کربلا سے عقل پر عشق کی فتح دکھائی ہے۔

عشق کی تکمیل اور اس میں زور و قوت محبت و اتباعِ رسول سے پیدا ہوتی ہے، جو سارے جہان کا مالک بنا دیتی ہے۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست | اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است	آبروے ما ز نامِ مصطفیٰ است
دل ز عشقِ او توانا می شود	خاک ہم دوشِ ثریا می شود
عاشقانِ او ز خوباں خوبتر	از حسینانِ جہاں محبوب تر
عاشقی محکم کن از تقلیدِ یار	تا کمندِ تو شود یزداں شکار
محکم از حق شو، سوے خود گام زن	لات و عزاے ہوس را سر شکن
لشکرے پیدا کن از سلطانِ عشق	جلوہ گر شو بر سرِ فارانِ عشق

تا خداے کعبہ بنوازد ترا

شرحِ انّی جاعلٌ سازد ترا (اسرارِ خودی)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام مسلمان کا دل ہے، اس کی ساری آبرو اسی پاک نام سے وابستہ ہے، مسلمان کا دل رسول اللہ کی محبت ہی سے توانا ہوتا ہے اس سے خاک بھی ثریا کی ہمدوش ہو جاتی ہے، رسول اللہ کے عاشق سارے دنیا کے حسینوں سے زیادہ حسین اور سارے محبوبوں سے زیادہ محبوب ہیں، رسول اللہ کی تقلید و اتباع ہی سے عشق میں استحکام پیدا ہوتا ہے، اور اسی سے مسلمان کی کمند یزداں شکار بنتی ہے یعنی

۱۔ عشق پر اقبال نے اتنی نظمیں کہی ہیں کہ ان پر ایک مستقل مضمون لکھا جا سکتا ہے، ہم نے صرف بعض

خدا تک رسائی کا ذریعہ صرف اتباع رسول ہے، اس لئے حق کے سرچشمہ سے قوت حاصل کرو، اور ہوس کے لات و عزا کو توڑ ڈالو، عشق کی حکومت سے نوع آراستہ، فاران عشق کی چوٹی پر جلوہ گری کرو، اس وقت خدا تم کو اپنے انعامات سے نوازنے لگا، اور استخلاف فی الارض کا وعدہ پورا کرے گا، یہ محض شاعری نہیں خیر القرون کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے، یہ اسلام کے عشق ہی کا کرشمہ تھا کہ ایک اُمی قوم نے اس دور کی تعلیم یافتہ اور متمدن ترین قوموں کا تختہ الٹ دیا،

اقبال کا مرد مومن اور اس کے اوصاف

اقبال کے کلام میں حکیمانہ خیالات کا ایک عالم ہے، اس میں انھوں نے قوموں اور ملتوں کی موت و حیات اور عروج و زوال کا فلسفہ بھی بیان کیا ہے، مگر ان کی شاعری کا مرکزی نقطہ اور اس کی اصلی غرض و غایت مسلمانوں کی تجدید و اصلاح اور دنیا و روح کے ذریعہ اُن میں زندگی کی آب و تاب پیدا کرنا ہے، اس لئے انھوں نے ان کے ایک ایک مرض کی نشان دہی کی ہے، اور اس کا علاج بتایا ہے، ان کا اصلی منصب و مقام واضح کیا ہے، اُن کے عروج و اقبال اور نکبت و ادبار کی داستان سُنائی ہے، اُس کے اسباب واضح کئے ہیں اور دوبارہ اس منصب و مقام اور دنیا میں عروج و اقتدار حاصل کرنے کی تدبیریں بتائی ہیں، اور اُن کو اس تکرار کے ساتھ اور اتنے رنگا رنگ پیرایوں میں بیان کیا ہے، کہ اگر اس کا ایک حصہ بھی نقل کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے گی،

وہ مسلمانوں میں جو اوصاف اور جو روح پیدا کرنا چاہتے ہیں، اس کو انھوں نے مرد حق، مرد حُر، مرد مومن اور قلندر کی مختلف شکلوں میں پیش کیا ہے، اس سے مرد مومن

(بقیہ حاشیہ ص ۳۳۴) نظموں کے کچھ اشعار نقل کئے ہیں،

کا مثالی پیکر اور ملت اسلامیہ کے متعلق ان کی شاعری کا لب لباب نگاہ کے سامنے آجاتا ہے۔اس لئے زیادہ تفصیل میں پڑنے کے بجائے اس کو پیش کر دینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

موت سے بے خوفی | زندگی خصوصًا اعلیٰ مقاصد میں کامیابی کا راز موت سے بے خوفی میں مضمر ہے، زندہ قومیں موت سے نہیں ڈرتیں، اور اپنے مقصد کی راہ میں بے تکلف جان دے دیتی ہیں، اور مرد مومن کے لئے تو موت زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ ایک نئی زندگی کا آغاز، اور خدا کی راہ میں موت حیات ابدی ہے۔اس لئے ایک مومن موت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اور مسرت کے ساتھ اس کا استقبال کرتا ہے،

نشان مرد مومن با تو گویم   چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

مرد مومن کی زندگی تسلیم و رضا کی پابند ہوتی ہے، اس کی نگاہ میں موت ایک کھیل ہے۔ بندۂ حق گو یا شیر اور موت ہرن ہے، موت اس کے مقامات میں سے ایک مقام ہے، اس لئے اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں، وہ موت پر اس طرح جھپٹتا ہے، جس طرح شاہین کبوتر پر جھپٹتا ہے، غلام کی زندگی موت کے ڈر سے حرام رہتی ہے، اور وہ ہر وقت اس کے خوف سے ڈرتا رہتا ہے، لیکن بندۂ آزاد کی شان جدا ہوتی ہے، اس کو موت نئی زندگی عطا کرتی ہے، وہ موت اندیش نہیں بلکہ خود اندیش ہے، اس کی موت ایک لمحہ سے زیادہ نہیں ہوتی، اس کے بعد ہی اس کو دوسری زندگی مل جاتی ہے، جو پہلی زندگی سے زیادہ ارفع اور پائدار ہوتی ہے، اس لئے مرد مومن قبر والی موت نہیں پاتا،

وہ جانوروں کی موت ہے، بلکہ خدا سے وہ موت چاہتا ہے جو اس کی راہ میں جذبہ سرفروشی کی انتہا اور رزمگاہ شوق کی آخری تکبیر ہوتی ہے اگرچہ ہر قسم کی موت مومن کے لئے شیریں ہے لیکن اولاد مرتضیٰ کی موت چیز ہی دوسری ہے، دنیاوی بادشاہوں کی جنگ تو غارتگری ہے لیکن مومن کی جنگ سُنّتِ پیغمبری ہے مومن کی جنگ خدا کی جانب ہجرت، اور حق کے لئے ترکِ ماسوا کا نام ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو اسلام کی رہبانیت فرمایا ہے، اس نکتہ کو شہید کے علاوہ دوسرا نہیں سمجھ سکتا، جو اپنے خون سے اسکو خریدتا ہو

زندگی محکم زتسلیم و رضاست	موت نیرنج و طلسم و سیمیاست
بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ	یک مقام از صد مقام اوست مرگ
می فتد بر مرگ آں مردِ تمام	مثلِ شاہینے کہ افتد بر حمام
ہر زماں میرد غلام از بیم مرگ	زندگی او را حرام از بیم مرگ
بندۂ آزاد را شانے دگر	مرگ او را می دہد جانے دگر
او خود اندیش است مرگ اندیش نیست	مرگ آزاداں ز آنے بیش نیست
بگذر از مرگے کہ سازد با لحد	زانکہ ایں مرگ است مرگِ دام و دد
مرد مومن خواہد از یزداں پاک	آں دگر مرگے کہ برگیرد ز خاک
آں دگر مرگ انتہائے راہِ حق	آخریں تکبیر در جنگاہ شوق
گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر	مرگِ پورِ مرتضیٰ چیزے دگر
جنگِ شاہانِ جہاں غارتگری ست	جنگ مومن سنّتِ پیغمبری ست
جنگ مومن چیست؟ ہجرت سوئے دوست	ترکِ عالم اختیار کوئے دوست
آنکہ حرفِ شوق با اقوام گفت	جنگ را رہبانی اسلام گفت
کس نداند جز شہید ایں نکتہ را	کو بخونِ خود خرید ایں نکتہ را

مومن اپنی گفتار و کردار میں اللہ کی برہان ہے، وہ صفاتِ الٰہی کا مظہر تو ہے اس لئے اُس کی صفات قہاری، غفاری، قدوسیت اور جبروت کا مردِ مومن میں ہونا ضروری ہے، اُن کے بغیر مسلمان نہیں بن سکتا، وہ اپنے مقام کی بلندی میں جبرئیل امین کا ہمسایہ ہے، وہ کسی ملک و وطن کا پابند نہیں، ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست، وہ بظاہر قرآن کا صرف قاری ہے مگر اپنے عمل میں قرآن کا نمونہ ہے، اس کا ارادہ قدرت کے مقاصد کا معیار ہے یعنی اس کا ارادہ ہی قدرت کا مقصد بن جاتا ہے، اس کا عمل دنیا میں بھی دوسرے مومنوں کے اعمال کے پرکھنے کی میزان ہے، اور آخرت میں بھی، یعنی اس کی ذات دین و دنیا دونوں میں مردوں کے لئے نمونہ ہے، وہ صاحبِ لطف و جمال بھی ہے، اور صاحبِ جلال و جبروت بھی،

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن	گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت	یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایہ جبریل امین بندۂ خاکی	ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ سمرقند
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن	قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے	دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

ایک دوسری نظم میں اس کی عظمت اور جمال و جلال کو ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے،

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن

جچتے نہیں کنجشک و حمام اسکی نظر میں
جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن

ایک نظم میں مرد مومن کی تصویر کشی اس طرح کی ہے،

ہاتھ اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کارآفریں، کارکشا، کارساز

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولیٰ صفات
ہر دو جہاں سے غنی اسکا دل بے نیاز

اس کی امیدیں قلیل اسکے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اسکی نگہ دلنواز

نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

ایک نظم میں مردِ حُر یعنی مرد مومن کے کمالات بڑی خوبی سے بیان کئے ہیں۔ یہ نظم کسی قدر طویل ہے، لیکن مردِ مومن کے اوصاف کا بڑا مکمل اور موثر مرقع ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے،

مردِ حُر کی ہستی ہر قوت کی بے خوفی سے مستحکم ہوتی ہے، اسی کی قوت سے وہ میدانِ جنگ میں سربکف ہوتا ہے، وہ لا الٰہ کے نور سے روشن ضمیر ہوتا ہے، کسی سلطان و میر کا غلام نہیں ہوتا، اس کی زندگی موت سے اور پائندہ ہوتی ہے، اس کا نعرۂ تکبیر حروف اور آواز کے حدود سے ماورا ہوتا ہے، وہ راہ کے بڑے بڑے سنگِ گراں کو شیشے کے ذروں سے زیادہ وقعت نہیں دیتا۔ یہ درویش بے نوا قلندر سلاطین و ملوک سے خراج وصول

کرتا ہے، بڑے بڑے حریر پوش بادشاہ اس ننگے فقیر کی ہیبت سے سہمے رہتے ہیں، وہ دین کے اسرار کا آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے، ہم محض سُنی سُنائی باتیں جانتے ہیں، وہ اندرون خانہ کی خبر رکھتا ہے، ہم بیرونِ در رہتے ہیں، ہم کلیسا دوست اور مسجد فروش اور وہ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے پیمانہ نوش ہے، وہ نہ ساقی کا محتاج ہے نہ ساغر کا، ہمارا پیمانہ خالی اور وہ مست الست رہتا ہے، اس کی نمی سے پھول سُرخ رہتے ہیں، اس کا دھواں ہمارے شعلوں سے زیادہ روشن رہتا ہے، اس کے سینوں میں اقوام کی تکبیر اور اس کی پیشانی میں قوموں کی تقدیر تحریر ہوتی ہے، ہمارا قبلہ کبھی کلیسا ہے، کبھی دیر۔ مگر وہ دوسروں کے ہاتھ سے رزق حاصل نہیں کرتا، ہم سب فرنگ کے غلام ہیں، اور وہ خدا کا بندہ ہے، اس کی وسعت و پہنائی کے لئے یہ جہان رنگ و بو تنگ ہے، اس جہان فانی میں اسی مردِ حُر کو ثبات ہے، اس کی موت بھی درحقیقت زندگی کا ایک مرحلہ ہے۔ ہمارے سارے کام ظن و تخمین سے وابستہ ہیں، وہ کم سخن مگر سراپا عمل ہے، ہم فاقہ مست اور گوشہ گر دگدا ہیں، اور اس کا فقر لا الٰہ کی قوت سے تیغ بدست ہے، ہم ایک پرکاہ کی طرح گردباد کے اسیر ہیں، اور اس کی ضرب کوہ گراں سے جوئے رواں نکالتی ہے، اس کا سینہ دیگ کی طرح جوش زن رہتا ہے، اور اس کے سامنے کوہ گراں تو دہ ریگ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، صلح کی حالت میں وہ انجمن ساز اور انجمن آرا ہوتا ہے، جس طرح چمن میں باد بہاری چلتی ہے، اور جنگ کی حالت میں وہ اپنی تقدیر کا محرم خود اپنی تلوار سے اپنا قبر کھودتا ہے،

اب اصل نظم ملاحظہ ہو:

مردِ حُر محکم ز وردِ لاتخف
ما بمیدان سر بجیب او سر بکف

مردِ حر از لا الٰہ روشن ضمیر
می نگردد بندۂ سلطان و میر

جانِ او پاینده تر گردد ز موت
بانگِ تکبیرش بروں از حرف و صوت

ہر کہ سنگِ راه را داند زجاج
گیرد آن درویش از سلطاں خراج

پادشاہاں در قباہائے حریر
زرد رُو از سہمِ آن عریاں فقیر

تر دیں ما را خبر آں را نظر
او درونِ خانہ ما بیرونِ در

ما کلیسا دوست ما مسجد فروش
او ز دستِ مصطفیٰ پیمانہ نوش

نے مغاں را بنده نے ساغر بدست
ما تہی پیمانہ اُو مستِ الست

چہرۂ گل از نمِ اُو احمر است
ز آتشِ ما دودِ او روشن تر است

دارد اندر سینہ تکبیرِ امم
در جبینِ اوست تقدیرِ امم

قبلۂ ما را کلیسا گاه دیر
او نخواہد رزقِ خویش از دستِ غیر

ما ہمہ عبدِ فرنگ او عبدہٗ
او نگنجد در جہانِ رنگ و بو

در جہانِ بے ثبات او را ثبات
مرگِ او را از مقاماتِ حیات

کارِ ما وابستۂ تخمین و ظن
او ہمہ کردار و کم گوید سخن

ما گدایانِ کوچہ گرد و فاقہ مست
فقرِ او از لا الٰہ تیغے بدست

ما بہر گامے اسیرِ گرد باد
ضربتش از کوهِ گراں جوئے کشاد

سینۂ ایں مرد می جوشد چو دیگ
پیشِ او کوهِ گراں یک توده ریگ

روزِ صلح آں برگ و سازِ انجمن
ہم چو بادِ فرودیں اندر چمن

روز کیں آں محرم تقدیر خویش   گور خود می کند از شمشیر خویش

مردِ حُر کے کمالات بیان کرنے کے بعد مسلمانوں کو اس کی تقلید اور اس کی صحبت کی تلقین کرتے ہیں :

شکوہ کم کن از سپہر گرد گرد   زندہ شو از صحبتِ آں زندہ مرد
صحبت از علمِ کتابی خوشتر است   صحبتِ مردانِ حُر آدم گر است
مردِ حُر دریائے ژرف و بے کراں   آب گیر از بحر نے از ناودان
اے سرت گردم گریز از ما چو تیر   دامنِ او گیر و بے تابانہ گیر
می نروید تخمِ دل از آب و گل   بے نگاہِ از خداوندانِ دل

(مسافر)

یعنی فلک کج رفتار کا شکوہ کم کرو، اس زندہ مرد کی صحبت سے زندگی حاصل کرو، صحبتِ علمِ کتابی سے زیادہ فائدہ مند ہے، مردانِ حُر کی صحبت انسان ساز ہوتی ہے، مردِ حر ایک دریائے بے کراں ہوتا ہے، اس لئے نالی کے بجائے اس بحرِ بیکراں سے پانی حاصل کرو، میں تمہارے قربان مجھ سے تیر کی طرح بھاگو۔ اور مردِ حُر کا دامن پکڑ لو۔ دل کا تخم محض آب و گل سے نہیں کسی صاحبِ دل فرد کی نگاہِ التفات سے اگتا ہے،

فقر | مردِ مومن کا ایک بڑا وصف فقر بھی ہے، الفقر فخری رسول اکرم صلعم کا ارشاد ہے، اس سے مراد مفلسی و تنگ دستی نہیں، بلکہ حقیقی فقر یعنی اعلیٰ مقاصد کے لئے ادنیٰ خواہشات کی قربانی، عظمتِ دنیا اور دنیاوی عیش و تنعم سے بے نیازی اور اس کی تحقیر، سادگی، سخت کوشی، اولو العزمی، اور جذبۂ نظرِ حق، توکل علی اللہ اور دنیا کی

ہر قوت سے بے خوفی کا نام ہے، ایسا فقر کسی قوت کو دھیان میں نہیں لاتا، اور بڑی بڑی حکومتوں کے تختے الٹ دیتا ہے، جس کی تصویر عہد صحابہ میں نظر آتی ہے، ایران کی فوج کشی میں جو مسلمان سفراء یزدگرد سے گفتگو کرنے کے لئے گئے تھے، ان کے گھوڑوں پر زین اور رکاب تک نہ تھی، معمولی نیزے ہاتھوں میں تھے، جسم پر قرینے کا لباس تک نہ تھا، لیکن ان کے دل فقر کی دولت سے غنی اور جوش جہاد سے معمور تھے، ایرانیوں نے جن کی نگاہیں ظاہری شکوہ و تجمل دیکھنے کی عادی تھیں، ان سفراء کو بڑی حقارت سے دیکھا اور تحقیر آمیز گفتگو کی، لیکن جب انہی بے سرو سامان اور بے نوا فقیروں کا مقابلہ ہوا تو انھوں نے ساسانی تاج و تخت کے پرزے اڑا دیئے، شام کی فتح کے بعد جب حضرت عمرؓ نے عیسائیوں سے معاہدہ کے لئے بیت المقدس کا سفر کیا، تو سواری میں معمولی گھوڑا تھا جس کے کھر گھسے ہوئے تھے، جسم پر انہی معمولی حیثیت کا لباس تھا، کہ خود مسلمان افسروں کو اس خیال سے شرم آتی تھی کہ عیسائی اس ہیئت میں دیکھ کر کیا اثر لیں گے، اس لئے انھوں نے ترکی گھوڑا اور عمدہ لباس پیش کیا، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ خدا نے ہم کو جو عزت دی ہے، وہ اسلام کی عزت ہے، اور ہمارے لئے بس ہے، گویا یہی حضرت عمرؓ نے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کا تخت الٹ دیا، اقبال نے اسی فقر کی تعلیم دی ہے، فقر پر ان کی کئی نظمیں ہیں، یہاں ایک نظم کے کچھ اشعار نقل کئے جاتے ہیں،

چیست فقر اے بندگانِ آب و گل ~~~ یک نگاہِ راہ بیں یک زندہ دل

فقر خیبر گیر با نانِ شعیر ~~~ بستۂ فتراکِ او سلطان و میر

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضا ~~~ ما امینیم ایں متاعِ مصطفےٰ است

فقر بر کرّ و بیان شبخون زند — بر نوامیسِ جہان شبخون زند
بر مقامِ دیگر اندازد ترا — از زجاجِ الماس می سازد ترا
برگ و ساز او ز قرآنِ عظیم — مرد درویشے نہ گنجد در گلیم
بے پراں را ذوقِ پروانے دہد — پشہ را تمکینِ شہبازے دہد
با سلاطین درفتد مردِ فقیر — از شکوہِ بوریا لرزد سریر
قلبِ او را قوت از جذب و سلوک — پیشِ سلطاں نعرۂ او "لا ملوک"

از جنوں می افگند ہوئے بہ شہر — وارہاند خلق را از جبر و قہر
می نگیرد جز بہ آں صحرا مقام — کاندرو شاہیں گریزد از حمام
آتشے با سوزناکے ز خاکِ او — شعلہ ترسد از خس و خاشاکِ او
بر نیفتد ملتے اندر نبرد — تا درو باقیست یک درویش مرد
خویشتن را اندریں آئینہ بیں — تا ترا بخشند سلطانِ مبیں

حکمتِ دیں دلنوازی ہائے فقر
قوتِ دیں بے نیازی ہائے فقر

یعنی فقر نام ہے فراست اور حالات پر نظر رکھنے اور گرمی قلب کا، فقر نانِ شعیر کی قوت سے خیبر کو فتح کرتا ہے کہ "جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری" بڑے بڑے سلاطین و فرماں روا اس فقر کے فتراک کے نخچیر ہیں، فقر نام ہے راہِ خدا میں ذوق و شوق اور تسلیم و رضا کا، حضرت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس متاع کے ہم امین ہیں، فقر فرشتوں پر شبخوں مارتا ہے، اور قوانینِ قدرت کو مغلوب کرتا ہے، وہ ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیتا اور شیشہ جیسی نازک اور معمولی چیز کو الماس جیسا

سخت اور قیمتی بنا دیتا ہے، اس کا سارا ساز و برگ قرآن حکیم سے وابستہ ہے، یہ مردِ درویش گلیم میں نہیں سماتا، بے پر و بال میں ذوقِ پرواز اور ممولے کو شہباز کی قوت عطا کرتا ہے' وہ بڑے بڑے با جبروت سلاطین سے بھڑ جاتا ہے، اس کے بوریہ کے شکوہ سے تاج و تخت لرزتے ہیں، اس کے قلب کو جذب و سلوک سے قوت حاصل ہوتی ہے، وہ سلاطین و ملوک کے سامنے "لاملوک" کا نعرہ لگاتا ہے، اپنے خون سے پوری آبادی میں روح پھونک دیتا ہے، اور مخلوقِ خدا کو ظلم و جور سے نجات دلاتا ہے، وہ اسی صحرا میں رہتا ہے، جہاں شاہین کبوتر سے کتراتے ہوں، جہاں طاقتور کو کمزور کے ستانے کی جرأت نہ ہو، اس کی خاک میں اتنا سوز ہے کہ ہماری آگ اسی سے سوز و تپش حاصل کرتی ہے، اور اس کے خس و خاشاک سے شعلہ لرزتا ہے، جب تک کسی ملت میں ایسے مردِ درویش کا وجود باقی ہے، وہ کسی معرکہ میں شکست نہیں کھا سکتی، مسلمانو! اس آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھو یعنی اپنے میں اس مردِ درویش کے اوصاف پیدا کرو، اس وقت تم کو دنیا میں حکومت اور غلبہ حاصل ہوگا، اس قسم کی اور نظمیں بھی ہیں، مگر یہ چند مثالیں مردِ مومن، مردِ حُر، اور مردِ حق کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے بالکل کافی ہیں، ان میں بہت سے اوصاف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ جس قوم میں بھی ایسے انسان پیدا ہو جائیں وہ دنیا پر حکومت اور قوموں کی امامت کریگی اور حقیقت یہ ہے کہ مغربی قومیں انہی اوصاف کی بدولت دنیا پر حکمراں ہیں،

(باقی)

چند قرآنی الفاظ کی لغوی تشریح

از

جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) سابق پروفیسر عربی

(پنجاب یونیورسٹی)

گورنمنٹ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد میں چند سال سے اردو زبان کے مختلف نوعیت کے الفاظ کے اشتقاق کی بحث میں مصروف ہوں، اور اس سلسلہ میں بہت سے متفرق الفاظ پر لسانی نوٹ لکھ چکا ہوں، اور ایک رسالہ کی صورت میں اپنے کام کا ایک نمونہ بھی شائع کر چکا ہوں، گذشتہ سال معارف کے اپریل اور مئی کے شماروں میں عربی الفاظ پر جو مقالہ اس خاکسار کے قلم سے شائع ہوا تھا، وہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، زیر بحث کلمات میں قرآنی الفاظ بھی شامل ہیں، ان الفاظ کے انتخاب میں اعلام کے علاوہ معربات اور شواذ و نوادر کو بالخصوص ترجیح دی گئی ہے، اور ان کی تشریح میں جدید لسانی تحقیقات سے مدد لی گئی ہے، بعض احباب کا تقاضا ہے، کہ میرے کام کا جو حصہ قرآنی الفاظ کے متعلق ہے، اس کی سب سے پہلے تکمیل کی جائے، اور اسے ایک الگ مستقل لغت کی صورت میں شائع کر دیا جائے، کیونکہ ان کی رائے میں اس قسم کی لغوی تحقیق جس میں الفاظ کو ان کے اصل و صول تک پہنچایا گیا ہے، اور ان کے ابتدائی لغوی مفہوم و معنی کو متعین کیا گیا ہے، مسلم تفسیر کا

پہلا زینہ ہے،

پاکستان کے چند جید علما رشلاً مشفقی و مکرمی مولانا عبد العزیز المیمنی نے میرے مقالہ کے بعض حصوں کو دیکھا ہے، اور اس کے متعلق ازراہ کرم بہت عمدہ اور حوصلہ افزا رائے کا اظہار فرمایا ہے، اس مضمون میں اسی ذخیرہ میں سے چند الفاظ کی بحث کو منتخب کر کے اور اس کی ایک تمہید لکھ کر اس کو ایک مقالہ کی صورت دے دی ہے، اور اسے ہندوستان بھر کے باذوق اہل کمال کی خدمت گرامی میں استصواب رائے کے لئے پیش کر رہا ہوں اور ان سے التفات خاص کی تمنا رکھتا ہوں،

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

لسانی تحقیق و تدقیق ہمیشہ سے اہل اسلام کی علمی زندگی کی ایک نمایاں خصوصیت رہی ہے، اور مسلمانوں میں عربوں نے بالخصوص اپنی زبان کے ساتھ جو اعتنا کیا ہے اور لسانی تحقیقات میں جو سرگرمی دکھائی ہے، اس کی نظیر دیگر قوموں کی تاریخ میں کم ملتی ہے، اس لسانی کد و کاوش کی ابتدا قرآن مجید کے مطالعہ سے ہوئی، مسلمانوں کو اور خصوصاً عجمیوں کو جب کلام پاک کے فہم و تفہیم کی ضرورت پیش آئی تو اس سے لسانی مسائل کی تحقیق کو تحریک ملی، زبان کے قواعد منضبط ہوئے جس سے عربی کا علم صرف و نحو وجود میں آیا، از روئے انصاف اس بات کا اعتراف لازم ہے، کہ ان تحقیقات میں عرب علما کے ساتھ ساتھ عجم کے فضلا نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، چنانچہ عربی گرامر کی سب سے پہلی جامع کتاب جو لکھی گئی، وہ ایرانی نسل کے ایک عالم سیبویہ کے قلم سے نکلی تھی، اسی طرح ترکستان کی خاک سے علامہ زمخشری جیسا عربی زبان کا عالم متبحر

پیدا ہوا،

عربی گرامر کی تدوین کے ساتھ ساتھ عربی الفاظ اور محاورات کی جمع و ترتیب بھی شروع ہوئی، ابتدا میں مختلف موضوعات پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے گئے مثلاً کتاب الابل، کتاب الخیل، کتاب الشجر وغیرہ، پھر اسی مواد کو بڑی بڑی لغتوں کی صورت میں ترتیب دیا گیا، ان کتب لغت کی جامعیت اور وسعت حیرت انگیز ہے، جب لسان العرب شائع ہوئی، تو اس کی سمائی بمشکل بیس جلدوں میں ہو سکی، اسی طرح قاموس کی شرح "تاج العروس" دس ضخیم جلدوں میں طبع ہوئی، عبرانی، یونانی اور لاطینی بھی علمی زبانیں ہیں لیکن ان میں کسی زبان کو ایسے مفصل اور مبسوط لغات نصیب نہیں ہوئے تھے، عربی کتب لغت کی حیرت انگیز جامعیت اور ضخامت کی وجہ عربی زبان کی بے پایاں وسعت ہے، جس پر عبور حاصل کرنا معمولی انسان کا کام نہیں ہے، امام سیوطی نے "الاتقان" میں ایک فقیہ کا قول نقل کیا ہے، کہ کلام العرب لا یحیط بہ الا نبی یعنی عربوں کی زبان اتنی وسیع ہے کہ اس کا احاطہ نبی جیسا غیر معمولی انسان ہی کر سکتا ہے"، اسی مفہوم کو امام شافعیؒ نے قدرے وضاحت کے ساتھ اپنے الرسالہ کی ابتدا میں یوں ادا کیا ہے، لسان العرب اوسع الالسنۃ مذھبا واکثرھا الفاظا ولا نعلمہ انہ یحیط بجمیع علمہ انسان غیر نبی "یعنی عربوں کی زبان تمام زبانوں سے زیادہ وسیع ہے، اور اس کے الفاظ بھی مقابلۃً زیادہ ہیں، اور ہمیں معلوم نہیں کہ کوئی انسان سوائے ایک نبی جیسے عبقری، کے اس کے تمام علم کا احاطہ کر سکتا ہو"

عربی زبان کا ظرف بہت وسیع ہے، چنانچہ اس نے غیر زبانوں کے سینکڑوں الفاظ کو معرب کر کے یعنی اپنے قالب میں ڈھال کر اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے، اس قسم کے

متعدد معرّب الفاظ قرآن مجید میں بھی آئے ہیں۔ مقالۂ ہٰذا میں اسی قسم کے چند کلمات کی لغوی تشریح مقصود ہے۔ اور یہ تشریح اُن کی Etymology یعنی اُن کے اصول و ماخذ کی تحقیق تک محدود ہے[1]

اس لغوی تشریح سے پہلے اس اہم مسئلہ کا تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آیا قرآن مجید میں عجمی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ یا وہ "عربی مبین" میں نازل ہونے کی وجہ سے ایسے خارجی عناصر سے پاک ہے۔ اس مسئلہ پر علمائے اسلام دو گروہوں میں منقسم ہیں، اور اپنی اپنی رائے کے حق میں دلائل رکھتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، عکرمہ اور مجاہد اس بات کے قائل تھے کہ قرآن پاک میں عجمی زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اور انھوں نے متعدد الفاظ مثلاً سجّیل، مشکوٰۃ، یمّ، طور، استبرق اور اباریق کے متعلق تصریح کی ہے کہ یہ الفاظ عجمی ہیں۔ بعض دیگر مفسرین بھی اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ کہ قرآن پاک میں عجمی الفاظ کے وجود کا اعتراف کریں، کیونکہ اُن کی رائے میں جو عجمی الفاظ معرّب بن جائیں۔ یعنی عربی قالب میں

---

[1] علمائے لغت کی اصطلاح میں معرّب کسی عجمی زبان کا وہ کلمہ ہے جسے عربی میں لیتے وقت حروف کی تبدیلی یا کمی بیشی سے عربی قالب میں ڈھال لیا جائے۔ اور وزن اور ہیئت کے اعتبار سے اسے عربی شکل و صورت دے دی جائے۔ اس قسم کے معرّب الفاظ ذیل کی کتابوں میں مدوّن ہیں۔

(۱) کتاب المعرب من الکلام الاعجمی تالیف الشیخ ابی منصور الجوالیقی متوفی سنہ ۵۲۹ھ (مطبوعہ لائپزگ تصحیح و تحشیہ ایڈورڈ زخاؤ۔ نیز مطبوعہ قاہرہ)

(۲) شفاء الغلیل فیما فی کلام العرب من الدخیل تالیف شہاب الدین

ڈھل جائیں، اور قریب الفہم بن جائیں۔ اُن کا استعمال مُخل فصاحت نہیں ہو سکتا،

اس کے مقابلہ میں بہت سے ائمہ مثلاً امام شافعیؒ، امام ابن جریر طبریؒ، ابو عبید معمر بن المثنیٰ، ابن فارس قزوینی اور قاضی ابو بکر باقلانی قرآن مجید میں عجمی کلمات کے منکر ہیں، ان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے، کہ قرآن حکیم نے بہ تکرار فرمایا ہے، کہ اُس کی زبان "عربی مبین" ہے۔ یعنی ایسی واضح زبان میں نازل ہوا ہے جس کو عرب لوگ بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ اس رائے کے حق میں وہ اس آیت کا حوالہ دیتے ہیں، وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا أَعْجَمِيًّا لَقَالُوا لَوْلَا فُصِّلَتْ آيَاتُهُ أَأَعْجَمِيٌّ وَعَرَبِيٌّ

اس کے علاوہ خداوند کریم فرماتا ہے،

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ،

ان کے ہم خیال علماء نے یہ دلیل بھی پیش کی ہے، کہ قرآن مجید میں عجمی الفاظ کے وجود کو تسلیم کرنے سے عربی زبان پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے، کہ وہ ناقص اور ناکمل اور آسمانی پیغام کے ادا کرنے سے قاصر ہے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ نے اپنے پیغام کے لئے ایسی زبان اختیار کی جو سب زبانوں سے اکمل ہے، اور ادائے مطلب کے لئے نبطی، فارسی اور سریانی زبانوں کی محتاج نہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اگر قرآن میں غیر عربی الفاظ آئے ہیں تو اس سے یہ شبہ پیدا ہوگا کہ عربی

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۹) احمد الخفاجی متوفی ۱۰۶۹ھ مطبوعہ قاہرہ ۱۲۸۲ھ

(۳) امام جلال الدین سیوطی نے بھی "اتقان" میں غیر عربی الفاظ کو ایک مستقل فصل میں جمع کیا ہے اور اس کے علاوہ اپنی دو دیگر کتابوں یعنی المہذب اور المتوکل میں بھی معربات سے بحث کی ہے۔

دیگر زبانوں کے مقابلہ میں اکمل ہے[1]

امام طبری نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ قرآن کے بعض الفاظ کی تفسیر میں جو یہ کہا گیا ہے کہ ابن عباسؓ اور دوسرے مفسرین نے بعض الفاظ کو فارسی اور بعض کو حبشی یا نبطی بتایا ہے، تو درحقیقت یہ الفاظ کا توارد اور توافق ہے یعنی عربوں، ایرانیوں اور حبشیوں نے یکساں الفاظ کو اتفاقاً استعمال کیا ہے۔ لیکن امام موصوف کی یہ توجیہ تسلی بخش نہیں ہے۔ کیونکہ بیسیوں الفاظ کے متعلق متعدد قوموں کا توارد تجربہ اور قیاس کے خلاف ہے، خصوصاً جب کہ مختلف قوموں کے باہمی اتصال اور الفاظ کے انتقال کے بارہ میں تاریخی حقائق موجود ہوں،

ابو منصور الثعالبی (متوفی ۴۲۹ھ) نے کتاب الجواہر میں اس مسئلہ کو یہ کہکر سلجھانے کی کوشش کی ہے کہ "قرآن مجید مبین یعنی صاف اور واضح زبان میں نازل ہوا، اور اس میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو عربی نہ ہو یا جسے کسی غیر زبان کی مدد کے بغیر سمجھا نہ جا سکے، قدیم عربوں کے شام اور حبشہ کے ملکوں کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم تھے، اور وہ ان ملکوں میں سفر کیا کرتے تھے، انھوں نے عجمی کلمات اخذ کئے۔ مگر ان میں چند تبدیلیاں کر دیں، مثلاً بعض حروف کو گرا دیا، اور بعض الفاظ میں جو ثقالت تھی اسے دور کر دیا، اور ان الفاظ کو اپنی شاعری اور گفتگو میں استعمال کیا، اس طرح وہ الفاظ خالص عربی الفاظ کی مانند بن گئے، اور عربی شاعری کے علاوہ قرآن پاک میں بھی استعمال ہوئے، اس لئے حقیقت یہ ہے کہ

---

[1] ابو الحسین احمد بن فارس بن زکریا القزوینی متوفی ۳۹۵ھ، مؤلف مقاییس اللغۃ مطبوعہ قاہرہ ۱۹۰۰ء بحوالہ الاتقان للسیوطی، مطبوعہ قاہرہ، جلد اول ص ۳۱۵

یہ الفاظ پہلے عجمی تھے۔ لیکن جب عربوں نے اُن سے کام لیا، اور اُن کو معرب بنالیا تو وہ الفاظ اس طریق سے عربی بن گئے۔"

امام جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) نے بھی تقریباً اسی رائے کا اظہار کیا ہے، اور اتقان میں اس بحث کو ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا ہے، کہ میرے نزدیک صحیح رائے وہ ہے جس سے دونوں قولوں کی تصدیق ہوتی ہے، یہ الفاظ اپنی اصل کے لحاظ سے عجمی ہیں، لیکن جب وہ عربوں کے استعمال میں آئے، اور انھوں نے اُن کو معرّب بنا لیا یعنی ان کو بدل کر اپنے الفاظ کی صورت دے دی تو وہ الفاظ عربی بن گئے، اور جب قرآن نازل ہوا تو یہ الفاظ عربوں کے کلام میں مخلط ہو چکے تھے، اس لئے جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ الفاظ اپنی موجودہ معرّب صورت میں عربی ہیں تو وہ بھی سچا ہے، اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ وہ اپنے اصلی ماخذ کے لحاظ سے عجمی ہیں، وہ بھی سچا ہے"[۱]

ابوعبید، ابو منصور الجوالیقی (متوفی ۵۳۹ھ) مؤلف کتاب المعرب اور ابن الجوزی بغدادی (متوفی ۵۹۷ھ) اور دیگر علما کے اقوال بھی اسی قول کے قریب قریب ہیں،

اب ہم ناظرین کرام کی خدمت میں چند ایک ایسے قرآنی الفاظ کی لغوی تشریح پیش کرتے ہیں، جن کے متعلق اکثر محققین متفق الرائے ہیں کہ وہ اپنے اصلی ماخذ کے لحاظ سے عجمی ہیں، لیکن معرّب بننے کے بعد عربی زبان کا جزو لاینفک بن چکے ہیں۔ قرآن پاک نے اُن کو جس بے تکلفی سے استعمال کیا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصرین اُن کے مفہوم و معنی سے بخوبی آگاہ تھے

[۱] الاتقان، جلد ۱، ص ۱۳۵، مطبوعہ مصر ۱۳۰۲ہجری

لہذا اُن کا استعمال نہ تو قرآن حکیم کی فصاحت میں مخل ہوا، اور نہ اس کی زبان کے مُبین ہونے میں خارج وحائل ہوا۔

(۱) انجیل - از روئے قرآن مجید انجیل وہ آسمانی کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو عطا فرمائی تھی، انجیل کا لفظ قرآن پاک کی چھ مختلف سورتوں میں بارہ ۱۲ مرتبہ استعمال ہوا ہے، سورۃ المائدہ میں انجیل کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:-

"وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِمْ بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَآتَيْنَاهُ الْإِنْجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ	ہم نے اُن (انبیاء) کے قدم بقدم عیسیٰ فرزند مریم کو بھیجا، جس نے پیش نظر تورات کی تصدیق کی، اور ہم نے اُسے انجیل دی، اس میں ہدایت اور روشنی ہے۔"

قرآن پاک کے باقی مقامات میں بھی جہاں کہیں انجیل کا ذکر آیا ہے، اُسی طور پر ایک الہامی کتاب کی حیثیت سے آیا ہے۔

لیکن جو انجیل آج کل عیسائیوں کے ہاں متداول ہے، وہ ایک انجیل نہیں بلکہ چار الگ کتابیں ہیں - جن میں سے ہر ایک انجیل کہلاتی ہے، اور اپنے مؤلف کی طرف منسوب ہے، ان اناجیل اربعہ کو متّی، مرقس، لوقا اور یوحنّا نے (مغربی علماء کی تحقیق کے مطابق) حضرت عیسیٰؑ کے تقریباً ایک سو سال بعد تالیف کیا تھا، اُن میں حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے چند متفرق واقعات اور اُن کے معجزات و کرامات کا ذکر آیا ہے، اور اُن کے علاوہ اُن کی تعلیم و تلقین بھی شامل ہے، جو بیشتر امثال اور

وعظ و نصیحت کی صورت میں ہے، اور جس میں پہاڑی والے وعظ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

بعض عرب علماء نے لفظ انجیل کو عربی قرار دیا ہے۔ اور اسے مادہ "نجل" سے مشتق کرنے کی کوشش کی ہے، اور اس کا وزن افعیل بتایا ہے[1] لیکن علامہ زمخشری نے اس قول سے اختلاف کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ

"تورات اور انجیل دونوں عجمی لفظ ہیں، اور تکلف سے کام لے کر ان کو وری اور نجل سے مشتق بتایا اور ان کا وزن تفعلہ اور افعیل بیان کرنا اس وقت صحیح ہو سکتا ہے، جب یہ دونوں لفظ عربی ہوں"

ابو منصور جوالیقی اور شہاب الدین احمد خفاجی نے انجیل کو معرب بتایا ہے لیکن اس لفظ کی نشاندہی نہیں کی جس کی تعریب کی گئی ہے، ابو السعادات ابن الاثیر الجزری نے النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر میں لکھا ہے کہ یہ کلمہ عبرانی ہے یا سریانی یا عربی۔ علامہ زبیدی صاحب تاج العروس نے بھی علمائے لغت کے اس اختلاف کا ذکر کیا ہے کہ بعض لوگ انجیل کو عبرانی کہتے ہیں، بعض سریانی اور بعض عربی، لیکن انھوں نے خود اس بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کہی، علمائے لغت کے نزدیک قول راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ انجیل کسی غیر زبان کا لفظ ہے، جسے معرب کر لیا گیا ہے، لیکن وہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ لفظ کس زبان سے آیا ہے، اور اس کی اصلی صورت کیا تھی،

متاخرین میں سے غیاث اللغات کے مؤلف اس سے آگاہ تھے کہ انجیل انگلیون کا معرب ہے، لیکن انھوں نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ انگلیون آخر کار کس زبان

[1] کتاب المعرب للجوالیقی، طبع لائپزگ ص ۱۷،

کا لفظ ہے، اور اس کا لغوی معنی کیا ہے،

لفظ انجیل کے بارے میں مغربی علماء کی تحقیق یہ ہے کہ یہ لفظ دراصل یونانی کلمہ Euaggelion ہے، جو غالباً آرامی کے توسط سے عربی میں آیا ہے اور جس کے لغوی معنی بشارت ہیں، مروجہ اناجیل کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اپنے پیغام کو آسمانی بشارت کہتے تھے۔ جسے انھوں نے گلیل اور فلسطین کے دیگر شہروں اور قریوں میں چل پھر کر سنایا اور اپنے حواریوں سے بھی کہا کہ جاؤ اور لوگوں کو خوشخبری دو کہ آسمانی بادشاہت کا وقت قریب آ پہنچا ہے۔ لوقا کی انجیل (باب چہارم) میں ہے کہ ایک دن حضرت عیسیٰؑ شہر ناصرہ میں یہودیوں کی عبادت گاہ میں گئے، اور اشعیاء نبی کی کتاب کھول کر یہ عبارت پڑھی کہ "خدا کی روح مجھ پر غالب ہے کیونکہ اس نے مجھ کو مسح کیا ہے تاکہ میں مسکینوں کو یہ بشارت سناؤں کہ اس نے مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ میں دل شکستہ لوگوں کو شفا دوں، اسیروں کی آزادی کی منادی کروں جو اندھے ہیں اُن کو بینائی دوں، اور جو مظلوم ہیں، اُن کو آزاد کروں" چونکہ حضرت مسیح نے اپنی تعلیم اور اپنے پیغام کو بشارت سے تعبیر کیا تھا، اس لئے وہ کتاب بھی جس میں اُن کی سیرت اور تعلیم مدون ہوئی، انجیل یعنی بشارت کہلائی۔

اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور اُن کے ہم وطنوں کی زبان آرامی تھی، پھر اُن کے پیغام کے لئے ایک یونانی کلمہ کیوں استعمال ہوا، اس کی توجیہ یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کے زمانے میں فلسطین اور مشرق وسطیٰ کے اکثر ملکوں میں اسکندر اعظم کی فتوحات کے بعد کئی صدیوں سے یونانی علمی زبان کی حیثیت سے رائج چلی آ رہی تھی، اگرچہ قدیم یونانی قوم کی حکومت پر زوال آ چکا تھا لیکن اُن کے

علوم کا سکہ ابھی تک جاری تھا۔ اور اُن کی زبان کا علمی تسلط بہت سے ملکوں پر ہنوز قائم تھا، اس لئے حضرت عیسیٰ ؑ کے مقلدوں اور مبلغوں نے اپنے دین کی اشاعت کے لئے اسی عالمگیر علمی زبان سے کام لیا، چنانچہ اناجیل اربعہ یونانی زبان ہی میں قلمبند ہوئیں، اور چونکہ حضرت عیسیٰ ؑ نے اپنے پیغام کو بار بار بشارت کہا تھا، اس لئے وہ انجیل کے نام سے موسوم ہوئیں جس کے معنی خوشخبری کے ہیں،

انگریزی زبان میں انجیل کے لئے گاسپل (Gospel) کا جو لفظ مستعمل ہے اس کے معنی بھی بشارت ہیں، گاسپل گویا "انجیل" کا لفظی ترجمہ ہے،

انگریزی لفظ (Evangel) بھی مذکورۂ بالا یونانی کلمہ سے ماخوذ ہے، چنانچہ اناجیل اربعہ کے مؤلفین Four Evangelists کہلاتے ہیں،

(۲) بعل: بعل سامی زبانوں کا ایک عام اور مشترک لفظ ہے جس کے لغوی معنی رب، مالک، خداوند یا آقا کے ہیں،

جلال الدین سیوطی نے اتقان میں لکھا ہے کہ ملک یمن اور قبیلہ ازد کی زبان میں بعل کے معنی رب کے ہیں، اور جنوبی عرب میں گلازر (Glaser) نے حمیری زبان کے جو کتبات دریافت کئے تھے، اُن سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، کیونکہ ان میں بھی بعل کا لفظ مالک یا حاکم کے معنوں میں استعمال ہوا ہے،

کنعانی لوگ بالخصوص بعل کے لفظ کو اپنے خداوند کے لئے استعمال کرتے تھے اور یہ وہ قوم ہے جو بلاد عرب سے نکل کر عبرانیوں سے بھی پہلے ملک شام میں آباد ہو چکی تھی، اور جسے یونانیوں نے فنیقی (Phoenician) کہا ہے، اسی

قوم نے سرزمین صیدا سے نکل کر افریقہ کے شمالی ساحل پر قرطاجنہ (کارتھیج) کا شہر آباد کیا تھا۔ چنانچہ قرطاجنہ کے کتبوں میں بھی بعل کا لفظ بکثرت ملتا ہے۔

بعل کا لفظ، بصیغہ مفرد و جمع، تورات میں بھی کئی جگہ آیا ہے، اور اس سے عبرانیوں کے مخالف قبیلوں اور قوموں (مثلاً کنعانیوں) کے معبود مراد ہیں۔

بعل کا لفظ ذیل کے مرکبات کا ایک جزو ہے۔

بَعلَبَکّ :۔ شام کا ایک قدیم تاریخی شہر ہے، جو اب ویران ہو چکا ہے۔ اس کے معنی غالباً "بعل کا شہر" ہے۔ یونانیوں نے اُسے Heliopolis (یعنی مدینۃ الشمس) کہا ہے کیونکہ وہاں سورج دیوتا کی پوجا ہوتی تھی۔

ہنی بعل Hannibal قرطاجنہ والوں کا ایک مشہور سپہ سالار تھا جس نے مدت دراز تک اپنے حریف رومیوں کے ساتھ جنگ جاری رکھی اور شہرت دوام پائی۔ لفظی معنوں کے لحاظ سے ہنی بعل وہ شخص ہے جس کو بعل نے برکت دی ہو۔

عربوں کے ہاں بھی ایک نام مُعْتَنٰی آیا ہے۔ میرے خیال میں اس کا مفہوم بھی ہنی بعل کے مفہوم سے بہت قریب ہے۔

بعل کے اصلی معنی تو مالک یا معبود ہیں، لیکن عربی میں مجازی طور پر شوہر کو بھی بَعل کہہ دیتے ہیں، قرآن مجید میں بعل کا لفظ ان دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ سورۂ الصّٰفّٰت میں ہے:۔

اَتَدْعُوْنَ بَعْلاً وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِیْنَ، — کیا تم (اپنے دیوتا) بعل کو پکارتے ہو۔ اور بہترین پیدا کرنے والے کو چھوڑ رہے ہو،

سورۂ ہود میں بعل کا لفظ اس کے مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہے

قَالَتْ یٰوَیْلَتٰٓی ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّھٰذَا بَعْلِیْ شَیْخًا ؕ اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ عَجِیْبٌ ۝ — اس نے (یعنی ابراہیمؑ کی زوجہ نے) کہا کہ ہائے افسوس کیا میں جنوں گی، حالانکہ میں بڑھیا ہوں اور میرا شوہر بھی بوڑھا ہے، بیشک یہ ایک عجیب بات ہے،

بعل کی جمع بُعُولہ ہے جو اسی مجازی معنی میں دیگر تین سورتوں میں چار مرتبہ استعمال ہوئی ہے،

ڈاکٹر ہوروولٹس (Horovitz) نے اس امکان کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بعل کا لفظ عربوں نے شاید حبشی زبان سے اخذ کیا ہو، لیکن اس رائے کی تردید اس سے ہوتی ہے کہ بعل کا لفظ دیار عرب کے اس قدیم دور کے کتبوں میں پایا گیا ہے جب اہل حبشہ جنوبی عرب میں وارد بھی نہیں ہوئے تھے۔ یا اُن کتبوں کے علاقوں میں ان کی کبھی رسائی نہیں ہوئی،

اسی طرح پروفیسر جیفری نے لکھا ہے کہ عربوں نے بعل کا لفظ غالباً سُریانی زبان سے لیا ہے، لیکن واقعات سے اس رائے کی تائید نہیں ہوتی، کیونکہ سریانی زبان عربی کے مقابلہ میں حدیث العہد ہے۔ اور اس زبان کا لٹریچر بھی حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش

کے بعد وجود میں آیا، حالانکہ بعل کا لفظ بلادِ عرب کے ایسے کتابات میں پایا گیا ہے، جو حضرت عیسیٰؑ کے عہد سے قدیم ترہیں، اسی لئے پروفیسر نولڈکے اور پروفیسر ولنازن نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ جہاں تک بلادِ عرب کا تعلق ہے بَعل کا لفظ مقامی اور ملکی ہے یعنی ٹھیٹھ عربی ہے،

۳- جبریل یہ نام عبرانی ہے، جو جبر اور ایل سے مرکّب ہے،۔ جبر بمعنٰے جبروت یعنی قوت وطاقت اور ایل بمعنٰے اِلٰہ، لہٰذا جبریل کے معنی ہوئے قدرت اللہ یا قدرتِ خدا،

جبریل کا لفظ تورات (Pentateuch) میں نہیں آیا، لیکن صحیفۂ دانیال میں ہے، دانیال ایک رویا کا ذکر کرتا ہے کہ ایک غیبی آواز سُنی جو جبریل کو مخاطب کر کے کہتی تھی کہ دانیال کو اس رویا کی تعبیر بتا دے"
(دانیال ۸/۱۶)

متی کی انجیل (باب اول) میں بھی جبریل کا ذکر ہے، جبریل حضرت زکریّاؑ کو یحییٰؑ کی پیدائش اور حضرت مریمؑ کو عیسیٰؑ کی ولادت کی بشارت دیتا ہے۔

قرآن مجید میں جبریل کا صرف دو تین مرتبہ ذکر ہے، سورۂ بقرہ میں جبریل کا ذکر یوں آیا ہے:-

"قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ مَن كَانَ عَدُوًّا لِّلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِينَ ۝ (بقرہ - ۱۱)

پھر سورۃ التحریم میں ہے:-

"اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ" (تحریم - ۱)

(۴) جزیہ :- جزیہ وہ ٹیکس ہے جو اسلامی حکومت ذمیوں یعنی اپنی غیر مسلم رعایا پر اُن کے جان و مال کی حفاظت کے بدلے میں عائد کرتی تھی۔

جزیہ کا لفظ قرآن مجید (سورۃ براءت) میں صرف ایک مرتبہ آیا ہے:-

"قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ" (توبہ - ۴)	اُن لوگوں سے جنگ کرو جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اور نہ یوم آخرت پر، اور نہ اُس چیز کو حرام سمجھتے ہیں جس کو اللہ اور اُس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اور نہ وہ دینِ حق کی پیروی کرتے ہیں، ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی ہے، یہاں تک کہ وہ مطیع ہو کر جزیہ دیں،

امام راغب اصفہانی نے مفردات فی غریب القرآن میں جزیہ کو جزی سے مشتق بتایا ہے، اور لکھا ہے کہ اسے جزیہ اس لئے کہتے تھے کہ وہ ذمیوں پر اُن کے مال و جان کی حفاظت کے "بدلے" میں عائد کیا جاتا تھا۔ لسان العرب کا بیان بھی

اسی کے قریب قریب ہے، جوالیقی اور خفاجی نے بھی جزیہ کو معربات میں شمار نہیں کیا، غالباً اس لئے کہ جزیہ اُن کے نزدیک ایک خالص عربی لفظ ہے،

لیکن اس کے برعکس ابوعبداللہ محمد بن احمد خوارزمی (متوفی ۳۸۷ھ) نے اپنی تالیف "مفاتیح العلوم" (مطبوعہ لائیڈن ۱۸۹۵ء) میں جزیہ کے متعلق لکھا ہے:-

هُوَ مُعَرَّبُ گزیت وَهُوَ　　　یعنی جزیہ اگزیت کا معرب ہے،

الخَرَاجُ بالفارسیة،　　　اور فارسی میں اس کے معنی خراج کے ہیں،

علامہ شبلی نعمانی نے اسی قول کو قبول کیا ہے، اور اس کی تائید میں متعدد فارسی لغت نگاروں کی تصریحات کو بطور سند پیش کیا ہے مفصل بحث کے لئے ملاحظہ ہو ممدوح کا رسالہ "الجزیہ" جو "رسائل شبلی" کے علاوہ اُن کے مجموعۂ مقالات میں بھی دوبارہ طبع ہو چکا ہے،

۵- جُناح　جناح کا لفظ قرآن مجید میں گناہ کے معنی میں بکثرت استعمال ہوا ہے اور مختلف سورتوں میں پچیس مرتبہ آیا ہے، اور لا جناح علی کی ترکیب بہت عام ہے

عربی لغت نویسوں نے جناح کو ٹھیٹھ عربی لفظ قرار دیا ہے، اس لئے اس کے اصل ماخذ کے متعلق بحث کی ضرورت محسوس نہیں کی، بعض نے صرف اس بات پر اکتفا کی ہے کہ جناح جُنوح سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ایک طرف مائل ہونے کے ہیں،

عربی لفظ جُناح اور فارسی گناہ کے درمیان جو واضح اور حیرت انگیز مشابہت پائی جاتی ہے، اس کی بنا پر یہ سوال قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں لفظوں کا باہمی تعلق اور اُن کی مشابہت کی نوعیت کیا ہے، کیا یہ مشابہت محض اتفاقی ہے یا فی الواقع اس لفظ کو ایک زبان نے دوسری زبان سے مستعار لیا ہے، اگر مستعار لیا ہے

تو کیا یہ لفظ عربی سے فارسی میں آیا ہے۔ یا فارسی سے عربی میں دخیل ہوا ہے،

اس سوال کے جواب میں جرمن مستشرق ہبس من (Hubschmann)

نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ جُناح در اصل فارسی لفظ گناہ ہے، جسے معرّب کرلیا

گیا ہے[1] اس قول کو اس سے تقویت ملتی ہے کہ قرآن مجید میں اس قسم کے متعدد الفاظ

ہیں مثلاً ابریق، سجّیل، زمہریر اور فردوس جو قطعی طور پر فارسی الاصل ہیں فارسی الفاظ کی تعریب عربوں

کا معمول رہا ہے، اس لئے اگر جُناح کی اصل فارسی ہے تو یہ کوئی خلاف معمول یا بعید از

قیاس امر نہیں ہے۔ (باقی)

---

[1] Hubschmann, Persische Studien P. 162. 1895 A.D.

سیاست میں اسلام

افغانستان

ترجمہ حافظ محمد نعیم صدیقی ندوی رفیق دارالمصنفین

انگریزی کے مشہور سہ ماہی رسالہ "دی مسلم ورلڈ" نے چند سال قبل "سیاست میں اسلام" کے عنوان سے ایک سمپوزیم منعقد کیا تھا، اور اس پر مختلف ماہرین سے مضمون لکھائے گئے تھے، بعد میں ان تمام مضامین کو رسالہ کے ایک خاص نمبر میں شائع کر دیا۔ ان سے مختلف ملکوں کے مسلمانوں کے مذہبی و سیاسی رجحانات پر روشنی پڑتی ہے، اسلئے معارف میں ان کا ترجمہ شائع کیا جاتا ہے۔ "م"

افغانستان کی مجموعی آبادی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہے، جس میں کئی قومیں مختلف رنگ کے طبعی حالات اور متعدد زبانیں پائی جاتی ہیں، وہاں کا سب سے زیادہ نمایاں فرقہ پختونوں کا ہے، اور سرکاری زبان پشتو ہے، مسلمان ۹۹ فی صد ہیں، جن میں سے ۸۰ فی صد حنفی المسلک ہیں، باقی میں قابل ذکر اسماعیلیوں کا ایک چھوٹا سا فرقہ اور اثنا عشری اامیوں کا فرقہ ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ افغانستان کے دیہاتوں، جرگوں اور اکثر شہری علاقوں میں اسلام جس شکل و صورت میں موجود ہے۔ اس کی شناخت ایک مسلمان عالم کے لئے نہایت مشکل ہے۔ دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح افغانستان میں بھی اسلام کی دو شکلیں نظر آتی ہیں، ایک تو وہ جو خواندہ اور روشن خیال طبقہ میں رائج ہے، اور دوسری وہ جس پر ناخواندہ لوگ عمل کرتے ہیں، افغانی سوسائٹی میں کئی عقائد ایسے ہیں جو اسلامی تعلیمات کی ضد قرار دیئے جا سکتے ہیں، مثلاً پختون ولی" یا پہاڑی علاقوں کا روایتی اصول "خون کا بدلہ خون" وغیرہ

افغانستان کے دیہاتوں میں پیروں، جادو، ٹونے ٹوٹکے اور تعویذ بہت رائج ہیں، ہر مشکل اور مصیبت کے وقت پیروں سے مدد لیجاتی ہے، یہاں کے ناخواندہ اسلام کو ایک آزاد اصول زندگی کی حیثیت سے نہیں مانتے، بلکہ اسے ایک نادیدہ شے قسمت کے ہاتھوں بے بسی، اور بے چون وچرا تسلیم برضائے الٰہی کا نمونہ سمجھتے ہیں، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان نظریات کا سیاست پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے، خاص کر ایک ایسے ملک میں جہاں کی اکثریت ناخواندہ ہے، افغانستان میں زیادہ تر دیہاتی ملا جاہل کسان ہیں، جو ملا گیری کے ذریعہ اپنی آمدنی بڑھاتے ہیں۔

موجودہ تاریخی تبدیلیاں | افغانستان میں قومیت کا جنم ۱۸۸۰ء میں ہوا جب عبدالرحمن خان امیر کابل ہوئے، انھوں نے تمام اوقاف پر قبضہ کرکے ان کے متولیوں کا حکومت کی جانب سے وظیفہ جاری کردیا، یہ بالکل صحیح کہا جاتا ہے کہ امیر عبدالرحمن خاں اپنے عالم سوسائٹی کے جابرترین فرد تھے۔ وہ مذہبی قائدین کی مخالفت قطعی برداشت نہیں کرسکتے تھے، اُن کے بعد اُن کے ولی عہد بیٹے امیر حبیب اللہ کے دور حکومت (۱۹۰۱ء تا ۱۹۱۹ء) میں مذہبی رہنماؤں کو پھر فروغ حاصل ہوا، امیر حبیب اللہ نے اوقاف اُن کے متولیوں کو واپس کردیئے۔ امیر حبیب اللہ کے قتل کے بعد اُن کے تیسرے بیٹے امان اللہ خان تخت وتاج کے وارث ہوئے، انھوں نے دس سال (۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۹ء) تک افغانستان کو بڑے خلفشار میں مبتلا رکھا، امان اللہ خان افغانستان کو جدید رنگ دینا چاہتے تھے لیکن بدقسمتی سے نہ تو عوام پر اُن کو مکمل قابو حاصل تھا اور نہ فوج زیادہ مضبوط تھی، اور اپنی ترقی پسندانہ اسکیموں کو چلانے کے لئے انھوں نے فوج میں تخفیف بھی کردی تھی، انھوں نے اپنے آئین اور قوانین کے ذریعہ افغانی زندگی

کو کافی حد تک سیکولر بنانے کی کوشش کی، پردہ کا رواج ختم کیا، مخلوط تعلیم کے سیکولر اسکول قائم کئے، کابل کے لوگوں کو مغربی لباس پہننے کا پابند بنایا، سب سے بڑھ کر یہ کہ روس کی ٹیکنیکی امداد قبول کر لی، عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ افغانستان کو روسی امداد ۱۹۵۵ء کے بعد ملنا شروع ہوئی، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ سنہ ۱۹۵۵ء کے بعد وہ دوبارہ جاری ہوئی تھی،

بہرحال افغانستان کا مذہبی طبقہ اور قدامت پرست گروہ اپنی آزادروی پران غاصبانہ کوششوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا تھا، جس سے بالآخر افغانستان میں بغاوت ہوگئی، اس بغاوت کے پس پشت نہ تو فوج تھی، اور نہ عوام کی اکثریت صرف وہ قبیلے تھے جن کو قدامت پرست مذہبی رہنماؤں اور انگریزوں کے تربیت یافتہ دیوبندی علماء نے بھڑکایا تھا۔ اس لئے امان اللہ خاں اپنی ترقی پسندی کا آپ شکار ہوگئے، افغانی علماء کے خیال میں امان اللہ خاں کی پالیسی غیر اسلامی تھی، اس لئے خدا نے اپنی پشت پناہی ان سے چھین لی جس کی بل پر وہ حکومت کر رہے تھے،

اس کے بعد ۹ مہینے تک ایک تاجک سپردبچہ سقہ جو اپنے کو حبیب اللہ غازی کہتا تھا۔ افغانستان پر حکومت کرتا رہا۔ ۱۹۲۹ء میں امان اللہ کے ایک دور کے چچا زاد بھائی جنرل محمد نادر خاں (جن کو امان اللہ خان کی ترقی پسندی کی مخالفت کے باعث ملک بدر کر دیا گیا تھا) نے اس غیر پختونی غاصب کو تخت سے اتار دیا اور ۲۹ سنہ ء سے سنہ ۱۹۳۲ء تک خود شاہ محمد نادر شاہ کے نام سے حکومت کرتے رہے، سنہ ۱۹۳۳ء میں وہ قتل کر دیئے گئے۔

قتل سے پہلے سنہ ۱۹۳۱ء میں انھوں نے ایک دستور جاری کیا تھا، جو ترکی،

ایران، اور فرانس کے دستوروں کا مرکب تھا، مگر افغانیوں نے اس کو کبھی مکمل طور سے نافذ نہ ہونے دیا۔ اور مذہبی رہنما اپنی قدامت پسندی کے باعث سیکولر نظریات کی ہمیشہ مخالفت کرتے رہے

ان کی وفات کے بعد ان کے تین پسماندہ بھائیوں (محمد ہاشم، شاہ محمود اور شاہ ولی) نے انیس ۱۹ سالہ ولی عہد شہزادے کی پشت پناہی کی، جو افغانی تاریخ میں نیا واقعہ تھا، کیونکہ افغانستان اور مشرق وسطیٰ کے دیگر مسلم ممالک میں حکمراں کی موت کے بعد اس کے بھائیوں اور بیٹوں وغیرہ میں ہمیشہ تخت کے لئے جنگ ہوتی آئی ہے، محمد ہاشم ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۶ء تک اور شاہ محمود ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۳ء تک اس وقت تک شہزادے کے سرپرست رہے، جب تک وہ پختہ کار نہ ہوگیا، مسلم معاشرہ کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ باپ کی موت کے بعد چچا ولی، اور نگران ہوتا ہے ۱۹۴۲ء سے ۱۹۵۲ء تک افغانستان میں پارلیمانی طرز حکومت کے لئے ہلکی پھلکی کوششیں ہوتی رہیں، لیکن افغانستان اپنی قدامت پرستی پر قائم رہا۔ ترقی کی رفتار بہت سست رہی، اور مذہبی رہنماؤں کی طاقت میں کوئی کمی نہ ہوئی،

جدیدیت کی طرف نئے قدم ۱۹۵۳ء میں افغانستان کے حالات نے ایک نئی کروٹ لی، جنرل محمد داؤد خاں نے جو بادشاہ اور وزیر دفاع کا چچا زاد بھائی تھا، اپنے چچا شاہ محمود سے خون خرابہ کئے بغیر اقتدار چھین لیا، اور وزیر اعظم کی حیثیت سے مشرقی اور مغربی ممالک سے بیش از بیش امداد حاصل کرنا شروع کر دی، اور ۱۹۶۳ء میں جب وہ اپنے عہدہ سے مستعفی ہوا، تو افغانستان کو ایسے معاشی، اقتصادی اور سماجی خلفشار میں مبتلا کر دیا تھا۔ جس کے نتیجہ میں صحیح آئینی حکومت کا قیام عمل میں آیا،

وزیر اعظم داؤد نے اپنے دس سالہ دور حکومت میں بڑے بڑے مذہبی ملاؤں سے
بار ٹکر لی، اور ہر بار کامیاب رہا، کیونکہ اس کا زیادہ تر انحصار فوجی طاقت پر
، قدامت پرست علماء ہر موڑ پر اس کی مخالفت کرتے رہے، انھوں نے نظام تعلیم کو
لر بنانے اور بہت سی قانونی و سیاسی اصلاحات کی شدید مخالفت کی ۔ ١٩٥٩ء
پردہ کا رواج ختم کر دینے پر دینی رہنما نہایت برہم ہوئے لیکن داؤد نے اپنے مخالف
ٹیا پچاس سرغنہ لوگوں کو جو اس اقدام کو غیر اسلامی تصور کرتے تھے، بلا تامل جیل میں
ے دیا۔ ان ملاؤں پر غداری اور کفر کا الزام لگایا گیا، افغانستان کے نوجوان
، نیز الازھر اور کولمبیا اسکول کے فارغین نے بھی حکومت کے موقف کو حق بجانب
بت کیا۔ انھوں نے بتلایا کہ "پردہ بازنطین اور ساسانی دور کا ایک شہری رواج تھا،
سلمان فاتحین نے اختیار کر لیا تھا" ان توضیحات اور بحثوں نے ملاؤں کو پردہ کی تنسیخ
ما کرنے پر مجبور کر دیا، مگر اکثر و بیشتر دل سے اس کے لئے رضا مند نہیں ہو سکے ہیں ناخواندہ
ن کے مذہبی عقائد کو دلائل سے بدلنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے،

داؤد نے ١٩٥٩ء میں جدیدیت کی مخالفت کی تحریک کو فوجی طاقت سے کچلنے میں
پس وپیش نہیں کیا، اور مالگزاری نہ دینے والوں اور قندھار کے مذہبی فسادات
حصہ لینے والوں کی بھی سرکوبی کی، اس سے قدامت پرست طبقہ بے اثر ہو کر رہ گیا،

وزیر اعظم داؤد کا زوال پختونستان کی تحریک کی حمایت کی وجہ سے ہوا، اس مسئلہ کی
جہ سے ١٩٦١ء سے ١٩٦٣ء تک افغانستان پاکستان سرحد بند رہی، اور وہ دوبارہ
وقت کھل سکی، جب محمد ظاہر شاہ نے داؤد کو آزاد پختونستان کی حمایت کے باعث استعفا
ینے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد شاہ نے ایک عارضی وزارت کی تشکیل کی جس کے سربراہ

ڈاکٹر محمد یوسف سابق وزیر معدنیات وصنعت تھے، نئے وزیراعظم کو شاہ نے ایک ایسا آئین تیار کرنے کی ہدایت کی جو آئینی بادشاہت کے لئے فضا ہموار کرسکے، اس طرح کا آئین شاہ محمود اور داؤد خاں کے زیر غور بھی تھا، اور اب وہ وقت آچکا تھا جب شاہ کو اپنے اختیارات کا کچھ حصہ عوام کو منتقل کرنا ضروری ہوگیا تھا، نیا آئین یکم اکتوبر ۱۹۶۴ء کو نافذ کیا گیا، اس میں اسلام کو جدیدیت کے لئے ایک حربہ اور آلہ کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔

اس آئین کے بانی وہ نوجوان تھے جنھوں نے افغانستان کی بہترین مذہبی درسگاہوں یا الازہر اور مغربی لا اسکولوں میں تعلیم حاصل کی تھی، لویا جرگا" (قومی آئین ساز اسمبلی) کے قدامت پرست لوگوں کے ہر اعتراض کو ان تربیت یافتہ افغانی وکلاء و علماء نے بے اثر بنا دیا، اور متشدد قسم کے قدامت پسندوں کو شاہ نے خود بہلانے کی کوشش کی کچھ لوگ مخالفت سے باز بھی آگئے، پھر بھی بڑا طبقہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔

ذیل میں ہم اس آئین کے بعض ان حصوں کا جائزہ لیتے ہیں، جن کا اسلام سے براہ راست تعلق ہے آئین کی دفعہ (۱) و (۲) بتلاتی ہے کہ افغانستان ایک آئینی بادشاہت ہے، ایک آزاد اور غیر منقسم ملک ہے اور اسلام حکومت کا سرکاری مذہب ہے ۱۹۳۱ء کا آئین حنفی اصولوں کو ملک کا مذہب بنانے پر مبنی تھا، اس میں شیعوں اور غیر حنفی سنیوں کے لئے کوئی جگہ نہ تھی، لیکن ۱۹۶۴ء کا آئین صرف حنفی مذہب کی روشنی میں حکومت کو عمل درآمد کرنے کا پابند بناتا ہے، اس میں غیر مسلموں کو بھی اس حد تک مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے، جس سے امن عامہ یا حکومت کا قانون متاثر نہ ہو دفعہ (۷) اور (۸) بادشاہ کو اسلام کے مقدس اصولوں کا محافظ مقرر کرتی ہے

اس کے لئے ضروری ہے، کہ وہ قوماً افغان، مذہباً مسلمان اور مسلکاً حنفی ہو، یہ اس لئے کیا گیا ہے تاکہ اسلام کی بقا کے لئے شاہی خاندان میں ہی حکومت کا سلسلہ چلتا رہے آئین کی دفعہ (۲۴) شاہی خاندان کے افراد کو سیاسی پارٹیوں کا ممبر بننے، وزارتی یا عدالتی عہدہ سنبھالنے اور پارلیمنٹ کا ممبر بننے سے باز رکھتی ہے، یہ چیز اگرچہ افغانی حکومت کو سیکولر بناتی ہے لیکن اس سے ملک کا اصل اقتدار بادشاہ کے ہی ہاتھوں میں رہتا ہے، جیسا کہ آئین کی دفعہ (۴۳) میں بصراحت مذکور ہے کہ:۔

"بادشاہ اپنے حکم خاص کے ذریعہ پارلیمنٹ یا مجلس شوریٰ کو ختم بھی بھی کر سکتا ہے"،

آئین کے چند دوسرے اہم نکات یہ ہیں، سماجی انصاف، قانون کی نظر میں مساوات شخصی آزادی، ذاتی جائداد کا تحفظ، عقیدہ و تقریر کی آزادی تعلیم کا حق صحت کے لئے سہولتیں فراہم ہونا اور سیاسی پارٹیاں بنانے کے حقوق۔ یہ تمام چیزیں اسلام کی روح کے عین مطابق ہیں،

آئین کی سب سے اہم دفعات (۶۹) اور (۱۰۲) ہیں، دفعہ (۶۹) کے مطابق "اس آئین میں درج تفصیلات کے علاوہ وہ تجاویز بھی قانون کا درجہ رکھتی ہیں، جسے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں نے پاس کیا ہو، اور جسے شاہ کی منظوری حاصل ہو، ان خطوں میں جہاں اس طرح کا کوئی قانون نہ نافذ ہوا ہو حنفی اصولوں ہی کو قانون تسلیم کیا جائے گا۔" دفعہ (۱۰۲) کی تفصیل یہ ہے، کہ

"عدالتیں اپنے زیر سماعت مقدمات میں آئین اور حکومت کے قوانین کا استعمال کریں گی، لیکن اگر زیر سماعت مقدمہ آئین یا قانون کے حدود میں نہ آتا ہو تو حنفی قانون

کی رو سے آئین کے حدود کا لحاظ رکھتے ہوئے مقدمہ کا فیصلہ کیا جائے گا، تاکہ دیانت سے انصاف مل سکے"

یہ دونوں دفعات افغانستان کو بڑی ہوشیاری کے ساتھ سیکولر قومیت کا رنگ دیتی ہے، دفعہ (۶۹) کا تعلق مقننہ سے ہے، اور دفعہ (۱۰۲) کا عدلیہ سے ہے، یہاں سیکولر قوانین کو مذہبی اصولوں پر فوقیت حاصل ہو جاتی ہے، اور اب تو افغانی پارلیمنٹ ۳۲ ایسے قوانین بنا رہی ہے، جو سیکولر عدالتوں میں مذہبی اصولوں کی جگہ لے لیں گے، ان قوانین کا تعلق انتخابات، پریس، سیاسی جماعتوں، سرمایہ کاری، آمدنی اور ٹیکس، تعلیم، صوبائی و میونسپل حکومت، ولسی جرگہ (ایوان زیریں) کے اندرونی نظام، تعزیری اقدامات اور شادی و وراثت سے ہے،

ان کی تکمیل تو مستقبل میں ہو گی لیکن آئین افغانستان نے قومیت کا ایک تصور ضرور قائم کر دیا، پھر بھی یہ تلخ حقیقت ہمیں کسی وقت فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ سیاسی ناخواندگی اور قدامت پرست قبائل کے کسان عوام مستقبل قریب میں ان کوششوں کو ہرگز کامیاب نہ ہونے دیں گے،

انتخابات، شادی اور اخبارات | افغانستان کا پہلا آزادانہ انتخاب اگست ستمبر ۱۹۶۵ء میں بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر ہوا، اس میں تعلیم کی کوئی قید نہ تھی، انتخابات کے لئے خفیہ ووٹ کا طریقہ اختیار کیا گیا لیکن ووٹ دینے والوں کی فیصد تعداد بہت کم رہی ہے اگرچہ عورتوں کو بھی الیکشن میں کھڑے ہونے کا حق حاصل تھا لیکن کسی خاتون امیدوار نے گاؤں سے پرچہ نامزدگی داخل نہیں کیا، البتہ کابل سے تین عورتیں ایوان زیریں کے لئے منتخب ہوئیں، اس وقت افغانستان کی وزارت میں وزارت صحت عامہ ایک عورت

کے ہاتھ میں ہے، ایوانِ زیریں کے تمام ممبر عوام کے منتخب کردہ ہوتے ہیں۔........
.... یوانِ بالا (مشرانو جرگہ) کے ایک تہائی ممبر
منتخب کئے جاتے ہیں، ایک تہائی صوبائی کونسلوں کے منتخب کردہ ہوتے ہیں،.....
.... اور ایک تہائی بادشاہ نامزد کرتا ہے لیکن قانون
سازی کا اصل اختیار ایوانِ زیریں کے ہاتھ ہے، ان دونوں ایوانوں میں علماء بھی بیٹھتے ہیں،
اور ایوانِ زیریں کا سکرٹری ایک ممتاز مذہبی لیکن جدید نظریات کا حامل شخص ہوتا ہے،
موجودہ افغانی پارلیمنٹ سیاسی میدان کی وسعت کا بہترین نمونہ ہے، روایت پسند، وہ
ترقی پسند علماء سیکولر نظریات رکھنے والے دائیں اور بازو کے ممبران سب بحث میں حصہ
لیتے ہیں، مگر پاس شدہ تجاویز پر جدیدیت (Modernism) کا رنگ غالب
رہتا ہے، لیکن روایت پسندوں کی طاقت بھی کچھ کم نہیں، اور پارلیمنٹری نظام کے تحت
اُن کی تنظیم اب پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہو گئی ہے، اور یہ بڑی عجیب بات معلوم ہوتی
ہے کہ سیکولر نظریات کی ابتداء نے مذہبی طبقہ کو سیاسی طور پر منظم ہونے کا موقع فراہم کیا ہے
جیسا کہ کئی حالیہ واقعات سے ظاہر ہے، مثلاً مئی ۱۹۶۹ء میں ایوانِ زیریں نے ایک قانون پاس
کیا جس کی رو سے طالبات کو قومی لباس پہننا ضروری اور برقع ممنوع قرار دیا گیا تھا،
لیکن سر پر رومال باندھنا لازمی تھا، ایوان کی خاتون ممبران کو اس کے خلاف بولنے
کی جرأت تو نہ ہو سکی لیکن اُن میں سے ایک رونے لگی،

۷ار جولائی ۱۹۶۵ء کا پریس قانون اب بھی بحث کا موضوع بنا ہوا ہے، جدیدیت
کے علمبردار اس کو زیادہ نرم بنانے کے حامی ہیں، اور قدامت پرست اور سخت کرنا چاہتے
ہیں، اس قانون کی رو سے عوام کو اخبارات نکالنے کی مکمل آزادی ہے، ایا میں بارہ ایک

ہفت روزہ اخبار خلق "ایرانی کمیونسٹ پارٹی (جواب غیر قانونی قرار دی جا چکی ہے) تودہ" کی حمایت کرتا ہے، مئی ۱۹۶۶ء میں ایوان بالا کے بعض قدامت پرست اور مذہبی رہناؤں نے اخبار مذکور کے خلاف تحقیقات کا مطالبہ کیا، ایوان زیریں نے بھی ۲۲ مئی کو اسی قسم کی ایک تجویز منظور کی، پریس قانون واضح طور سے بتلاتا ہے کہ "اخبارات کو اسلام کے اصولوں آئینی شہنشاہیت اور آئین کے دوسرے پہلوؤں کا تحفظ کرنا چاہیئے" خلق کے ایڈیٹر اور پبلشر نے اپنے ایک اداریہ میں لکھا کہ "یہ اخبار اسلام کا مخالف نہیں ہے، اور موجودہ حالات کے تحت وہ آئینی شہنشاہیت کی تائید کرتا ہے"

اس بیان نے قدامت پرستوں کو برافروختہ کردیا، انھوں نے اخبار مذکور سے اور زیادہ اسلام موافق بیان دینے کا مطالبہ کیا۔ ترقی پسندوں نے کہا کہ اتنا کافی ہے کہ خلق "اسلام مخالف ہونے سے انکار کرتا ہے" حالانکہ اخبار خلق نے بھی ملکیت ختم کئے جانے کا مطالبہ کیا تھا جو اسلامی اصول اور ملکی آئین کے صریح خلاف ہے، یہ ہنگامہ ۲۴ مئی کو اس وقت فرو ہوسکا جب اٹارنی جنرل نے پریس قوانین کے خلاف ورزی کے جرم میں خلق پر پابندی عائد کردی،

افغانستان میں طلبہ کے ذریعہ پہلا فساد اکتوبر ۱۹۶۵ء میں ہوا جب نئی پارلیمنٹ کا آغاز ہوا تھا، اس کے نتیجہ میں وزیر اعظم یوسف کو اپنے عہدہ سے ہٹنا پڑا، ان فسادات میں بائیں بازو کا ہاتھ ہونے کا شبہہ تھا، اس سے مذہبی طبقہ کو اس وقت بہت تقویت حاصل ہوئی، آئین اگرچہ سیکولر انصاف مہیا کرنے کا مدعی ہے لیکن قاضی زیادہ تر مقدمات کا فیصلہ شریعت کے مطابق کرتے ہیں، اس لئے ابھی اقتدار کو صحیح معنوں میں سیکولر ججوں کے ہاتھوں میں آنے کے لئے کافی عرصہ درکار ہے، حال میں افغان گورنمنٹ نے خود اعتراف

وفیات

ڈاکٹر سیّد محمود

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جناب ڈاکٹر سید محمود .... کو .... مرحوم .... لکھتے وقت قلم تھرتھرا رہا ہے، ہاتھ کانپ رہا ہے، دل رو رہا ہے، اُن کی وفات غیر متوقع نہیں ہوئی، انھوں نے کافی عمر پائی، ریڈیو اور اخباروں میں تو اُن کی عمر ۸۰ سال بتائی گئی ہے، مگر وہ غالباً اس سے بھی زیادہ عمر کے تھے، لمبی عمر پائی، مگر وہ خود بھی دنیا چھوڑنے کو تیار نہ تھے، اور نہ ہم لوگ ان سے اتنا جلد جدا ہونا چاہتے تھے، وہ مئی کے آخر میں اپنے ڈرائنگ روم میں اپنی پوتی سے پیار محبت کی باتیں کر رہے تھے، کہ اٹھے، اٹھنے میں پوتی سے ٹکرا کر قالین پر گر پڑے، تو اُن کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی، اسپتال لے جائے گئے، لیکن یہی موت کا بہانہ بن گیا، ٹوٹی ہوئی ہڈی علاج سے تو درست ہو گئی، مگر اور دوسرے امراض پیدا ہوتے گئے، پیشاب بند ہو گیا، آپریشن ہوا، اور نلکی سے پیشاب جاری کیا گیا، بیہوش رہنے لگے، نلکی کے ذریعہ غذا پہنچائی جانے لگی، ہوش آجاتا، تو پہلے کی طرح باتیں کرنے لگتے، ہمت کی [illegible]، ان کے تمام اعزہ و اقربا اُن کی عیادت کو جمع ہو گئے، اُن کی ایک صاحبزادی پاکستان میں ہیں، وہ آ گئیں، [illegible] ایک صاحبزادے سید احمد جرمنی میں ہیں، وہ بھی آگئے، [illegible] کے بعد [illegible]

گذشتہ ۵۰ سال سے اُن کے تعلقات اس ادارہ سے تھے، اس لئے میں اور شاہ صاحب
دونوں ۲۶ جولائی کو اُن کی عیادت کے لئے دہلی پہنچے، وہاں تین روز قیام رہا لیکن وہ
ہوش میں نہیں آئے، اُن سے کوئی بات نہ ہو سکی اور نہ ان کو معلوم ہو سکا کہ ہم لوگ اُن کی
محبت و شفقت کا حق ادا کرنے آئے ہیں، تین روز کے بعد ہم لوگ بڑی افسردگی کے ساتھ
ان کے اعزہ سے رخصت ہو کر واپس ہو گئے، خطوط کے ذریعہ اُن کی حالت معلوم ہوتی رہی
کبھی امید و بیم ہو جاتی لیکن ۲۸ ستمبر کی صبح کے ریڈیو سے یکایک خبر ملی، کہ وہ اللہ
کو پیارے ہو گئے، آنکھیں اشکبار ہوئیں، دل رویا، رواں رواں رویا، رونے کے
کے اسباب تھے، ادھر گذشتہ دس بارہ سال سے انھوں نے دار المصنفین کو اپنی توجہ او
محبت کا خاص مرکز بنایا تھا، اور بیڑا اٹھایا تھا کہ وہ اپنی وفات سے پہلے دار المصنفین کے
سرمایۂ محفوظہ کے لئے کئی لاکھ روپیے اپنی مساعی جمیلہ سے جمع کر کے رہیں گے، اسی کوشش کے
سلسلہ میں سعودی عرب کے سفیر کے ذریعہ سے پچاس ہزار روپیے دار المصنفین کو دلوائے،
پھر اسی اکتوبر میں مجھ کو اپنے ساتھ لیکر کویت تشریف لے جانے والے تھے، اس سفر کے
لئے تیاری بھی شروع کر دی تھی، لیکن خداوند تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ وہ دنیاوی سفر
کرنے کے بجائے سفر آخرت کریں، انھوں نے یہ بھی خواہش ظاہر کی تھی، کہ اب وہ
دہلی چھوڑ کر دار المصنفین چلے آئیں گے جہاں رہکر وہ اپنے علمی کاموں کی تکمیل کریں گے لیکن یہ ارمان انکے
دل ہی دل میں رہ گیا اور وہ سپرد خاک ہو گئے، ان کی وفات سے دار المصنفین والوں کو ایسا معلوم
ہوا کہ اس کا ایک بڑا سہارا ہی نہیں اٹھ گیا، بلکہ وہ بے سہارا ہو گیا، جنازے میں ہم لوگوں
کی شرکت ممکن نہ تھی، ریڈیو سے خبر ملی کہ شاہ ولی اللہؒ کے خاندان کے قبرستان میں سپرد
خاک کئے گئے، جنازے میں کافی لوگ تھے، وزراء بھی، سفراء بھی، صدر جمہوریہ ہند کی بھی

نمایندگی تھی، وزیر اعظم اندرا گاندھی روس میں تھیں لیکن وہیں سے ان کا پیام تعزیت
شائع ہوا، وہ سیاست سے کنارہ کش ہو چکے تھے، آنکھوں کی بینائی بھی کم ہو گئی تھی بہت
اونچا سننے لگے تھے، پیروں کی وجہ سے زیادہ دور تک پیدل نہیں چل سکتے تھے لیکن سفر اور کام
کرنے میں جوانوں کو مات کرتے، سفر میں گرمی، سردی، دن، اور رات کا کوئی خیال نہ کرتے
ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ کا سفر بے تکلف کرلیتے، مسز اندرا گاندھی سے اپنی بچی ہی کی
طرح محبت کرتے، گذشتہ انتخاب میں اُن کی خاطر اپنی آخری علالت سے گویا تین ہفتے پہلے
یو۔ پی۔ اور بہار کا سفر ایک طوفانی پروگرام کے ساتھ کیا، دہلی سے لکھنؤ، رائے بریلی، فیض آباد،
جونپور، غازی پور، پٹنہ، مظفر پور، چھپرہ کا دورہ چند روز میں ختم کر لیا، اُن کے ساتھی تھک تھک کر
اُن کو چھوڑتے گئے، لیکن وہ تازہ دم دہلی واپس ہوئے، پھر فوراً اپنے بعض کاموں کے لئے دیوریا،
غازی پور، اعظم گڈھ اور جونپور آئے، یہاں سے واپس ہوئے، تو جیسا کہ ذکر آیا ڈرائنگ روم
میں اتفاقاً گر پڑے، اور گرے تو پھر نہ اٹھے، وہ تقریباً پانچ ہفتے ولنگڈن اسپتال میں رہے،
اتنی طویل علالت میں لوگوں نے اُن کو نظر انداز نہیں کیا، اُن کی عیادت کے لئے صدر جمہوریہ
وی۔ وی۔ گری، وزیر اعظم اندرا گاندھی، اور شہر کے اکابر، علماء اور دانشور برابر آتے
رہے، سعودی عرب کے سفیر اُن کی عیادت کے لئے آئے، تو اُن کے اعزہ سے فرمایا کہ دنیا
میں اگر کوئی قیمتی سے قیمتی دوا ایسی ملتی ہو جس سے اُن کی صحت ہو جائے، تو وہ منگوائی جائے،
اس کے اخراجات وہ برداشت کریں گے، لیکن کارکنان قضا و قدر کی طرف سے پیام اجل
پہنچ چکا تھا، اس لئے کوئی تدبیر کارگر نہ ہو سکی، اور وہ اپنے عزیزوں اور عقیدت مندوں
کو تڑپتا چھوڑ کے اور اپنی قربانیاں یاد کرنے کیلئے چھوڑ گئے،
اس مضمون میں ان کی زندگی کے سیاسی حالات لکھنے کا موقع نہیں ہے،

کے پیرہن کا ٹکڑا تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک اور پیرہن کی بیگ
خط کوفی میں لکھا ہوا کلام پاک کا ایک نسخہ تھا۔ ان تبرکات کی نمائش گاؤں میں
برابر ہوتی رہی، مولانا وارث علی شاہ ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی کے استاد تھے، ایک
بار وہ اس گاؤں میں آئے، تو ان تبرکات کو دیکھا تو ان پر جذب کا عالم طاری ہو گیا،
ایک چیخ مار کر بولے واللہ یہی چیز ہے یہی چیز ہے، حفاظت کرو، حفاظت کرو، اس کے بعد
انھوں نے بیعت و ارادت کا سلسلہ شروع کیا، ڈاکٹر صاحب کے دادا حضرت سید احمد شہید
بریلویؒ کی تحریک سے بھی متاثر تھے، انھوں نے اپنے ایک لڑکے یعنی ڈاکٹر صاحب کے بڑے
چچا کو جہاد کے لئے حضرت سید احمد شہیدؒ کے سپرد کر دیا، ایک موقع پر انھوں نے اُن کی
خدمت میں ایک لاکھ کی رقم بھی پیش کی، حضرت سید احمد شہیدؒ کو بھی اُن سے بڑی محبت
تھی، جب وہ حج سے واپس ہوئے تو غازی پور کے ایک گاؤں میں پہونچے، یہاں
پہونچتے ہی فرمایا "بوئے دوست می آید، بوئے دوست می آید" یہ کہکر یوسف پور کی
طرف پا پیادہ چل کھڑے ہوئے، جہاں اُس وقت ڈاکٹر صاحب کے دادا علیل تھے
لیکن علالت کے باوجود انھوں نے حضرت سید احمد شہیدؒ کا خیر مقدم بڑے جوش و
خروش سے کیا، ان کو غازی پور لے گئے، اُن کے پورے قافلے کی خاطر و مدارات میں کوئی
کسر اٹھا نہ رکھی، بہت سے تحفے تحائف پیش کئے، اس سے متاثر ہو کر سید صاحب نے اپنے
ساتھیوں سے فرمایا، تم نے میرے دوست کو دیکھا،

ڈاکٹر صاحب کے والد ماجد فدا حسین صاحب نے خالص دینی تعلیم پائی تھی، اسی لئے
القاب کے نام کا جزو ہو گیا تھا، وہ مولانا عبد العلیم آسی غازی پوری کے تلامذہ میں تھے اور
سلسلۂ چشتیہ کی بزرگی ... حضرت قطب الدین ... حضرت شاہ [illegible]

کہیں جھوٹی باتیں مجھ سے منسوب کی جا رہی ہیں، کہیں [illegible]
ہو رہے ہیں، چھوٹی چھوٹی باتوں کو طول دیا جاتا ہے اور آپس میں لڑتے ہیں، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کو سخت تکلیف دہ ہے، وہاں سے آپ اٹھ کر کہیں جا کر تشریف فرما ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس خواب کا ذکر کر کے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دکھانا
تھا کہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ سے آپ کا کیا تعلق ہے، شیعوں کے جھگڑے سے جو شیعہ
سنیوں کے باہمی جھگڑے ہیں اور آپ کا وہاں سے اُٹھ جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ مسلمانوں کے
جھگڑے سے اسلام کی جو تضحیک و تذلیل ہو رہی ہے اس سے آپ کو سخت تکلیف ہو رہی ہے
اور آپ ناراض ہیں، اس خواب کا ذکر انہوں نے اس پمفلٹ میں بھی کیا ہے جو انہوں نے
شیعہ سنی کے اتحاد کے سلسلہ میں "سنی مسلمانوں سے ایک دردمندانہ اپیل" کے عنوان سے ہندو
کے شائع کیے، مختلفوں میں تقسیم کر دیا تھا لیکن اس میں اپنا نام ظاہر کرنا پسند نہیں کیا۔

ان کو اپنی مذہبیت کی بنا پر کلام پاک سے بڑا شغف رہا، جب تک اُن کی بینائی
کام کرتی رہی اس کی تلاوت بھی کرتے رہے، اس کی تفسیریں بھی پڑھتے، اس کے پڑھنے اور
سمجھنے سے متعلق اُن کے جو خیالات تھے اس کا اظہار دارالمصنفین کی مجلسوں میں برابر کرتے
رہتے، کہتے کہ مسلمانوں نے قرآن پاک کو جزدانوں میں لپیٹ کر رکھ دیا ہے، وہ اسلام کو
قرآن پاک کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ اپنے ماضی قریب کی روایات ہی
کو مذہب سمجھتے ہیں، قرآن پاک کا مخاطب سارے انسان ہیں، لیکن ہم نے مذہب کو ایسا
محدود کر دیا ہے کہ صرف مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے، اسی لئے ہمارے علما اپنے اپنے
حلقہ میں [illegible] بنا رہے ہیں، وقت آ گیا ہے کہ [illegible] اپنے پیغام کو عام [illegible]
کہ مسلمانوں [illegible] [illegible]

جیسی شخصیتیں نہیں پیدا ہوئیں، جو قرآن پاک کی آیات کی روشن تعبیر کریں اور اس دور کے مسائل کی گرہیں کھولیں۔ قرآن مجید کی آخری تفسیر و تشریح کبھی نہیں ہو سکتی، یہ بڑا معنی خیز، جامع العلوم اور عظیم المرتبت کلام ہے، ہر دور میں یہ سائنٹفک حقائق سے ہم آہنگ رہا ہے، ہر دور کے محقق اور سائنس دان نے اس کے اندر وہ صداقتیں دیکھی ہیں جو کائنات میں بکھری ہوئی ہیں، ضرورت ہے کہ ہم اس کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی صلاحیت پیدا کریں"۔ اپنی وفات سے چار مہینے پہلے اپنے ایک مضمون میں یہ تحریر فرمایا:

"کلام پاک کو اس سائنٹفک دور میں سائنٹفک طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے، ایک یوروپین سائنسداں نے لکھا ہے کہ قرآن کو سمجھنے کے لئے صرف عربی کا جاننا کافی نہیں، سائنس کے علوم کو بھی جاننا لازمی ہے، موجودہ دور کے سائنس دانوں نے یہ اعلان کیا ہے کہ اوپر کے سیاروں تک پہونچنے میں دور حاضرہ کی بجلی کام نہیں دے سکتی، اس لئے وہ اور طاقت ور بجلی کے انکشاف میں لگے ہوئے ہیں، اگر ہمارے رسول صلعم کی معراج جسمانی تسلیم کرلی جائے، تو کیا عجب ہے کہ اُن کا براق دراصل وہی برق ہو جس کے انکشاف کی کوشش آج کل کے سائنسدان کر رہے ہیں، اسی طرح کے اور بہت سے قرآنی اشارے ہیں، جو سائنس کے نہ جاننے کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آتے، قرآن کے الفاظ سخر الشمس والقمر کی تائید سائنس کے موجودہ انکشافات سے ہو رہی ہے، اسی لئے قرآن پاک کو سمجھنے کے لئے سائنس کے علوم کی واقفیت اگزیر ہو گئی ہے۔ یاد آتا ہے کہ سر شاہ سلیمان نے اپنی سائنسی تحقیقات کے سلسلہ میں کہا تھا کہ سائنس کے علوم جتنے زیادہ ہوتے جائیں گے، اتنا ہی ذات باری کا یقین بڑھتا جائے گا۔

خدا کے وجود کے متعلق شکوک اس لئے ہیں کہ ابھی سائنس کی تحقیقات مکمل نہیں ہو سکی ہیں .... قرآن پاک میں ذوالقرنین کے متعلق جیسی باتیں لکھی ہوئی ہیں، وہ موجودہ تحقیقات سے صحیح ثابت ہو رہی ہیں، قرآن پاک کا یہ دعویٰ کہ اس کی تعلیم ہر زمانہ کے لئے ہے مزید تحقیقات سے اور بھی مستحکم ہو جائے گا۔

اُن کو اس کی بھی لگن رہی کہ قرآن پاک کی تعلیمات زیادہ سے زیادہ عام کی جائیں حیدرآباد کے ڈاکٹر عبداللطیف نے جب مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا، اور ایک سوسائٹی کی تشکیل کر کے قرآنی تعلیمات کو انگریزی زبان کے ذریعہ سے زیادہ سے زیادہ ترویج دینے کی اسکیم بنائی تو ڈاکٹر صاحب نے اپنی کوششوں سے ان کے لئے ایک گرانقدر رقم فراہم کرائی،

اُن کو اپنے خاندانی اثرات کی وجہ سے صوفیائے کرام سے بھی بڑی عقیدت رہی، کہا کرتے کہ مجھکو بچپن میں حضرت قطب الہند مولانا غلام معین الدین (عرف شاہ امید علی) کی گود میں کھیلنے کا فخر حاصل ہوا، جونپور جاتے تو ان کی خانقاہ میں ضرور حاضری دیتے، اس کی مالی امداد بھی کیا کرتے، ان کی خواہش یہی رہی کہ وہ اپنی وفات کے بعد جونپور ہی میں سپرد خاک ہوں، اس سلسلہ کے بزرگوں کے قبرستان میں اپنی جگہ بھی متعین کر دی تھی، مگر مشیت ایزدی کچھ اور تھی، ایک بار میں ان کے ساتھ جونپور میں تھا، تو اس قبرستان میں اُن کے ساتھ گیا، یہیں ان کے والد بزرگوار اور والدہ بھی مدفون ہیں اپنے والدین کی قبروں کے علاوہ اور دوسرے بزرگوں کے مزاروں پر علیحدہ علیحدہ جا کر غایت عقیدت اور احترام سے فاتحہ پڑھتے رہے، دار المصنفین آتے تو صوفیائے کرام کے واقعات شوق سے سنتے، اور خود بھی بیان کرتے، ایک دفعہ میری کتاب بزم صوفیہ سے حضرت

نصیرالدین چراغ دہلوی کے حالات شروع سے آخر تک پڑھوا کر سنے اور جب میں نے ختم کر کے ان کے چہرے کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے،

اُن کو اپنے والد بزرگوار کے استاد شاہ عبدالعلیم آسی سے بھی بڑی عقیدت رہی، کہتے تھے اُن سے بیعت تو نہیں ہوا لیکن اُن کا صحبت یافتہ ہوں، مگر اپنی بعض تحریروں میں اُن کے نام کے ساتھ پیر و مرشد بھی لکھا ہے، ان کے کلام کے مجموعہ کو سفر میں برابر ساتھ رکھتے، اس مجموعہ کے بہت سے اشعار اُن کو زبانی یاد تھے، جو سنایا کرتے، پھر بھی تشفی نہ ہوتی، تو مجموعہ سے اشعار پڑھوا کر سنتے، دارالمصنفین کے قیام کے زمانے میں ایک رات اپنی اٹیچی سے کلام آسی نکال کر مجھ کو دیا، اور کہا کہ اس کو پڑھ کر سناؤ۔ میں نے یہ مجموعہ کھولا، تو یہ غزل پڑھنے لگا۔

کبھی میری بھی تجھے چاہ تھی، ترے دل میں میری بھی راہ تھی
کبھی اس طرف بھی نگاہ تھی کہ یہ سب خیال ہے خواب ہے

دلِ مبتلا ہے ترا ہی گھر اسے رہنے دے کہ خراب کر
کوئی میری طرح تجھے مگر نہ کہے کہ خانہ خراب ہے

یونہیں اپنے کوچہ میں رہنے دے، نہ جفا اٹھا کے ستا مجھے
جو اٹھے تو در دِ جگر اٹھے، کہیں مجھ میں اٹھنے کی تاب ہے

اگر آنکھ کھول کے دیکھئے، نہیں اثر دجود جز وفنا
ہے سواد ہستی بے بقا کہ بیاضِ چشم حباب ہے

ہر شعر پر وجد کرتے، کبھی تکیہ کے سہارے لیٹ جاتے کبھی اٹھ بیٹھتے، ہر شعر کو سمجھاتے بھی جاتے، کہتے کہ اشعار میں تغزل، موسیقی، جذبہ سب کچھ ہے، پھر کیا کہنا قافیہ اور ردیف میں کیفِ عشق کے عنوان سے بھی آسی کے اشعار ہیں، وہ بھی پڑھو،

نہ کبھی کے بادہ پرست ہم نہ ہمیں یہ کیف شراب ہے

لب یار چوسے تھے خواب میں وہی جوشِ مستیِ خواب ہے

وہی پیشِ چشم ہیں ہر نظر مگر اب بھی شوقِ نقاب ہے

وہی میری ہر رگ و پے میں ہیں مگر اب بھی مجھ کو حجاب ہے

انھیں کبرِ حسن کی نخوتیں مجھے فیضِ عشق کی حیرتیں

نہ کلام ہے نہ پیام ہے نہ سوال ہے نہ جواب ہے

اُن کو مولانا آسی کے مجموعۂ کلام کے تمام عنوانات یاد تھے، کبھی کبھی اُس کے صفحے بھی بتا دیتے، کہتے کہ مولانا آسی کے بہت سے اشعار میں کسی نہ کسی آیت قرآنی یا حدیث کی طرف اشارہ ہے، پھر وحدت الوجود پر ان کے اشعار سناتے رہتے، اس شعر کو بار بار پڑھتے

بجز تمھارے کسی کا وجود ہو یہ محال گر تمھیں نظر آنے ہو ماسوا ہو کر

مولانا آسی کے یہ اشعار بھی انہی کی زبان سے سُنے :۔

بلندی اُس کی اسی کی پستی ہر ایک شے میں اسی کی ہستی

عروج اُسی کا رسول ہو کر، نزول اسی کا کتاب ہو کر

ان کی ابتدائی تعلیم جونپور میں ہوئی، پھر اپنے بہنوئی سید محمد عمر صاحب کے ساتھ بنارس چلے گئے، یہاں مولوی محمد عمر صاحب نے اُن کے والد کی مرضی کے خلاف انگریزی تعلیم دلانی شروع کی، یہیں کے قیام کے زمانہ میں ان کو مولانا شبلی کی تصانیف سے دلچسپی ہوئی، پھر یہ دلچسپی عقیدت میں ایسی تبدیل ہوگئی کہ ان کے شاگردوں سے بھی گہرے تعلقات پیدا کئے، اور پھر دارالمصنفین سے وابستہ ہوئے تو اس سے ہر طرح کی محبت کا اظہار کرتے رہے، وہ مولانا شبلی کو بہت بڑا عالم، ادیب، مورخ، شاعر سمجھتے تھے، ان کی

بصیرت فکر اور نظر کے بہت قائل تھے، سیرۃ النبی اور الفاروق کی بہت تعریف کرتے، البتہ مضامین عالمگیر کی بعض باتوں سے اختلاف کرتے، کہتے کہ یہ بہت ہی اچھی کتاب ہے اورنگزیب کے خلاف جو زہر پھیلایا گیا ہے اس کا یہ تریاق ہے، مگر مولانا نے اورنگزیب کو سراہنے میں کہیں کہیں شاہ جہان اور جہانگیر وغیرہ کو جو مجروح کیا، وہ نہ کرتے، تو اچھا تھا،

مولانا شبلی کو بھی اُن سے لگاؤ رہا، دونوں میں برابر خط وکتابت رہی، مولانا شبلی اُن سے علمی خط وکتابت بھی کرتے، اپنے خط میں ان کو محبی لکھتے، اور جب آخر میں مجلس تالیف سیرت قائم کی تو ان کا نام بھی اس میں رکھنا چاہا، مولانا شبلی کا ایک خط ان کے نام سے یہ ہے،

محبی! سلام شوق!

آپ سے تو میں نے امید وں کا بڑا سلسلہ قائم کیا تھا، جو بیچ میں ذرا منقطع ہوگیا تھا،

یہ سچ ہے کہ جرمن پر نظر ڈالنی چاہئے لیکن نظر کہاں سے آئے میں بالکل تیار ہوں، آپ جب اکی پوچھیں تو مجھ کو لکھیں، میں دو ایک مہینہ کے بعد ضرور آجاؤنگا،

مرگولیس، نولدکی وغیرہ سے بہت کچھ نقل کرتا ہے لیکن وہ سب مضحکہ انگیز ہوتے ہیں، آج جو مقام زیر قلم تھا، وہ یہ کہ نولدکی نے آنحضرتؐ کا فاطمی النسب ہونا ثابت کیا ہے، دلائل سخت حیرت انگیز ہیں، قرآن مجید میں ایک آیت ہے'

وقالوا لولا نزل ھذا القرآن یعنی کفار کہتے ہیں کہ قرآن دو
علی رجل من القریتین عظیم شہروں میں کسی رئیس پر کیوں نہ اترا

عظیم کا لفظ رئیس اور صاحب دولت واقتدار کے لئے آتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دولت اور ریاست حاصل نہ تھی اتنی بات

کمال ثابت ہوتی ہے یہ تو لذیک کا اعلال ہے،

میں نے بعض ذریعہ کتابیں پڑھی ہیں، رہنمان کا ایک رسالہ تھا پڑھا عجیب مضامین
باتیں پائی ہوں یہاں نے ثابت کیا ہے کہ علم اور اسلام جمع نہیں ہو سکتے، تو اس رسالہ اس بحث پر ہے

ذالک مبلغھم من العلم ۔۔۔۔ مجھ کو تو اس حمام میں سب ننگے
نظر آتے ہیں

آپ کا خط بھی چاہتا ہے الہلال وغیرہ میں شائع کر دوں کل یا جزاً
یہ میں چاہتا ہوں کہ مجلس تالیف سیرت میں آپ کا نام شامل کروں"
شبلی ۔ لکھنؤ،

۱۵ اکتوبر ۱۹۱۲ء

۱۹۰۹ء میں وہ مزید تعلیم کے لئے اٹاوہ بھیجے گئے جہاں مولوی بشیر الدین صاحب نے اپنا مشہور اسکول کھول رکھا تھا، انھوں نے کئی بار اُن سے گفتگو میں بیان کیا کہ جب انھوں نے پہلی دفعہ مولوی بشیر الدین کو دیکھا تو ان کو مسلمانوں کا اتنا بڑا محسن سمجھنے کے بجائے اسکول کا کوئی ادنی ملازم سمجھا، وہ اپنے لباس اور وضع قطع سے بے نیاز رہتے، خود سادہ رہ کر مسلمان طلبہ کو سادگی اور کفایت شعاری کی تلقین کرتے رہے، ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ جب وہ پہلی دفعہ آئے تھے تو وہ دوڑ کر ایک نوکری میں چنے لائے، اور کہا کہ یہ ناشتہ تمہیں کرنا ہوگا، وہ اٹاوہ میں دو تین مہینے سے زیادہ نہ رہے، وہاں سے علی گڑھ چلے گئے، مگر مولوی بشیر الدین سے بہت متاثر ہو چکے تھے کہ ان کے اخبار البشیر کی حیثیت اس زمانہ میں ٹائمس آف لندن کی تھی، وہ انگریزوں اور خصوصاً یو۔ پی کے گورنر کے خلاف برابر مضامین لکھا کرتے، اُن کے اخبار میں گاندھی اور صاحب سنڈن کے خلاف بھی مضامین لکھتے تھے، ڈاکٹر صاحب کو اپنی

اس کم سنی میں بھی ان مضامین سے دُکھ ہوتا تھا، مولوی بشیر الدین کے یہاں روزانہ شام کو "جبل مرکب" کے نام سے ایک اجتماع ہوا کرتا تھا جس میں ہر قسم کے مسائل پر گفتگو ہوتی تھی ڈاکٹر صاحب بھی اس اجتماع میں شریک ہونے لگے، انھوں نے اس میں ان مضامین پر سخت نکتہ چینی کی، ان کا خیال تھا کہ قومی تحریک کے لئے ایسے مضامین مضر ہوں گے اس ملک میں رہ کر ہندوؤں کو اپنے سے دور کرنے کے بجائے اُن کو اپنے سے قریب تر کرنا ضروری ہے اگر ہندوؤں کو مسلمانوں کی طرف سے شکوک ہیں، تو اُن کو دور کرکے ان کو اپنی طرف مائل کرتے رہنا چاہئے، ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ انھوں نے اس سلسلہ میں اور بھی جو دلائل پیش کئے، ان سے مولوی بشیر الدین صاحب خوش ہوئے، اور وہ روزانہ اپنے ساتھ ان کو ٹہلنے کے لئے لے جاتے، ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر جو کچھ کہا تھا وہی اُن کے ذہن کا خمیر بنا رہا

وہ سنہ ۱۹۱۰ء میں مزید تعلیم کیلئے علی گڑھ گئے جہاں سنہ ۱۹۱۴ء میں بی ائے کیا، اور درسگاہ کی محبت ان کے دل میں ایسی سرایت کیے ہوئی تھی، کہ آخر وقت تک اس کے خلاف کوئی بات سننا پسند نہ کرتے، سرسید سے تو اُن کو ملنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن وہ اُن کو مسلمانوں کا بہت بڑا محسن سمجھتے، ان کے متعلق ان کے جو خیالات رہے، وہ ان کی اس تحریر کے ٹکڑے سے ظاہر ہونگے جو انھوں نے اپنی وفات سے پانچ مہینے پہلی لکھی، وہ لکھتے ہیں:-

"سرسید سند یافتہ عالم تو نہ تھے لیکن ان کے جو کارنامے ہیں ان کی وجہ سے کینٹول اسمتھ نے ان کو حضرت مجدد الف ثانی کی صف میں لا کھڑا کیا ہے، شبلی، حالی، نذیر احمد، آزاد کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں سے مسلمانوں کو نشاۃ الثانیہ عطا کی، لیکن ان سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اردو کے یہ عناصر اربعہ سرسید کے خیالات و تحریکات سے متاثر نہیں ہوئے، شبلی کا سلسلہ نام [illegible]

سرسید ہی کی صحبت کی وجہ سے شروع ہوا، ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں اور لیکچروں میں سرسید کے خیالات کی پوری عکاسی ہے اور آج یہ بحث جاری ہے کہ اُن کے ناول ابن الوقت کا ہیرو دراصل سرسید ہی کا کیرکیٹر ہے، ابن الوقت انگریزوں کے تمدن میں ضرور رنگ گیا ہے، لیکن اس کی خودداری اور غیرت کی جو تصویر کشی کی گئی ہے وہ ضرور قابلِ قدر ہے، حالی نے گلِ گشتِ رندانہ اور زنانہ مشاعرہ لانے کے بعد جب سرسید کو اپنا رہبر تسلیم کر لیا، تو پھر ان کا ملی درد، مذہبی جوش اور ایمانی ولولہ مسدس حالی کی شکل میں ظاہر ہوا، اور یہ وہ کتاب ہے، جس نے مسلمانوں میں غیر معمولی معاشرتی، تعلیمی، دینی اور مذہبی انقلاب پیدا کیا، اس کے مفید اثرات اس وقت تک باقی رہیں گے جب تک مسلمان ہندوستان میں اردو پڑھتے رہیں گے یہ مسدس دراصل سرسید ہی کے جذبات کی صحیح تصویر ہے اور یہ ان ہی کا کارنامہ ہے، ہندوستان کی گذشتہ تین صدیوں کے اندر مسدس حالی جیسی کوئی اور کتاب گذشتہ تین صدیوں کے اندر ....

.... نہیں لکھی گئی جس سے مسلمان اتنا زیادہ متاثر ہوئے ہوں، اور انھیں ہر شعبۂ زندگی میں اتنے فوائد پہونچے ہوں، خود مولانا ابوالکلام آزاد سرسید کے کارناموں سے متاثر رہے ہیں، یہ اور بات ہے کہ اُن کے سیاسی خیالات سے متفق نہ تھے، میں تو اقبال کو بھی سرسید ہی کی تحریکات کا علم بردار سمجھتا ہوں سرسید کے مذہبی خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انھوں نے اس سائنٹفک اور اسپرٹ دور سے پہلے کلام پاک کو سائنٹفک طریقہ سے سمجھنے کی کوشش کی بنیاد ڈالی تھی لیکن اُن پر کفر کے اتنے فتوے صادر ہوئے کہ اپنے کا بچ

کے مشاعرے کی خاطر اس خشش کو بہت زیادہ بارآور نہ کرسکے، وہ کافر تو ضرور بن گئے لیکن انہی کے یہ اشعار بھی ہیں،

خدا دارم دلِ بریاں زعشقِ مصطفےٰ دارم

ندارد ہیچ کافر سازو سامانے کہ من دارم

زجبریل امین قرآن بہ پیغامے نمی خواہم

ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم

اپنے سینے میں اسلام کی آتش فروزاں رکھنے والا ہی یہ اشعار کہہ سکتا ہے،"

ان کی وطنی محبت کا جذبہ علی گڈھ میں اتنا ابھرا کہ وہ وہاں قوم کے نام سے یاد کئے جانے لگے، اپنی ایک تحریر میں اپنے زمانہ کے کالج کے ساتھیوں کو یاد کرکے لکھتے ہیں:۔

"مہندر وپرتاب، تصدق احمد، حیات، جواہر لال (جواہر لال نہرو نہیں) مجید، احمد، شیو پرشاد، باقی محسن، شمشاد، مسعود، یہ سب طلبہ علی گڈھ کے مشہور کالج میں انٹرنس میں تعلیم پاتے تھے، یہ ہندوستان کے مختلف صوبوں کے رہنے والے تھے لیکن ایک دوسرے کے ہمدرد، غمخوار اور آپس میں سب دوست تھے، روزانہ شام کو مارین کورٹ (جہاں ان میں سے اکثر رہتے تھے) کے کمرہ نمبر ۴ میں جمع ہوتے تھے، اور دیر تک ہنستے بولتے اور آپس میں گپ شپ کرتے رہتے، مہندر وپرتاب، جواہر، شیو پرشاد ایک علٰحدہ بنگلہ میں رہتے تھے، جو بورڈنگ ہاؤس میں خاص کر ہندو طلبہ کے لئے متعین کر دیا گیا تھا، شام کو یہ سب دوست مل کر کبھی کبھی پرانے قلعہ کی طرف سیر و تفریح کے لئے چلے جاتے، اونچے درجے کے طلبہ میں انکے دوست عبدالرحمن (بجنوری) عزیز الرحمن، احمد بدرالدین ان کے

کچھ دوست تھے، عبدالرحمٰن ایم۔ اے میں پڑھتے تھے، اور عزیز الرحمٰن اور بدرالدین ایف اے میں، کبھی کبھی یہ دونوں بھی اپنے دیگر دوستوں کے ساتھ مل کر مختلف مضامین پر گفت گو کیا کرتے تھے، مندرو پرتاپ اپنے درجہ میں محنتی لڑکوں میں شمار ہوتے تھے، لیکن ان کو تاریخ نہیں یاد ہوتی تھی، اور نہ دل اپنا اس مضمون میں لگاتے تھے، جو اسرار احمد کو اپنے درجہ میں تاریخ سب سے اچھی یاد تھی، حیات اور شیو پرشاد کو ہندو اور مسلمانوں کے زمانہ کی تاریخ سے دلچسپی نہ تھی، لیکن انگریزوں کے زمانہ کی تاریخ کو وہ شوق سے یاد کرتے تھے، تمام وایسرائوں کے شاندار نام ان دونوں کو ازبر یاد تھے، ہمارے میر ولایت حسین صاحب جن کا انتقال ۱۸ر جولائی ۱۹۳۹ء کو ہوگیا، تاریخ کے استاد تھے، ہر چند کوشش کرتے کہ مندرو پرتاپ کو کسی طرح تاریخ یاد ہوجائے، تاکہ وہ امتحان میں کامیاب ہوجائیں لیکن ان کی ساری کوششیں رائگاں جاتیں۔"

مندرو پرتاپ سے مراد راجہ مندرو پرتاپ ہیں، جو ابھی تک زندہ ہیں، اور انقلابی ہونے کی وجہ سے انگریزوں کی حکومت کے زمانے میں بہت دنوں تک جلاوطن رہے، تصدق سے مراد تصدق احمد شروانی ہیں، جو اپنے زمانہ کے مشہور کانگریسی لیڈر اور یو۔ پی میں وزیر بھی رہے، عبدالرحمٰن سے مراد ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ہیں، جو غالب پر اپنے ایک مضمون کی وجہ سے اردو ادب میں ایک مستقل جگہ بنا گئے ہیں، مجید سے مراد عبدالمجید خواجہ ہیں، جو بیرسٹر ہوکر کانگریسی لیڈر اور جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر بھی ہوئے، حیات بعد میں لارڈ حیات کے نام سے مشہور ہوئے، وہ نواب بھوپال کے پرائیوٹ سکریٹری بنے، عزیز الرحمٰن جمیعۃ العلماء کے مشہور رہنما مولانا حفظ الرحمٰن کے بڑے بھائی تھے، بدرالدین ان کے

رہنے والے تھے، کمیونسٹ خیالات رکھتے تھے، انھوں نے چھ جلدوں میں میرا سپلا گنا تو کے نام سے ایک کتاب لکھی، اُن کا بعد میں قتل ہو گیا۔

ان کے ہم جماعت سرسید کے پوتے سر راس مسعود اور قاضی تلمذ حسین مصنف مرآۃ المثنوی بھی تھے، سر راس مسعود کو سیاست سے کوئی غیر معمولی دلچسپی نہیں رہی، اس کے باوجود دونوں کے تعلقات برابر خوشگوار رہے، البتہ قاضی تلمذ حسین اُن کی سیاسی سرگرمیوں کے ناقد رہے، اُن کے خلاف کچھ مضامین بھی لکھے۔

علی گڈھ میں رفتہ رفتہ اُن کے ساتھیوں کا ایک ایسا گروپ بن گیا، جو ہندوستان میں برطانوی حکومت کے خلاف رہا، اس گروپ نے طلبہ پر انگریزوں کی جو مرعوبیت چھائی ہوئی تھی، اس کو وطنی محبت کے جذبے میں دور کر کے ہندو مسلمان کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کی کوشش کی، ان کے ہم خیال طلبہ نے ایک خفیہ سوسائٹی اخوان الصفا کے نام سے قائم کی، اس میں جو بحث مباحثے ہوتے، اس کا اندازہ ان کی کتاب "آج سے قبل کا ہندوستان" سے ہوگا، اس میں انھوں نے اپنے زمانہ کے علی گڈھ کے طلبہ کی گفتگو کے حوالے سے اُن کی ذہنیت کو بھی پیش کیا ہے، اس کتاب کا ذکر آگے آئے گا۔

اس زمانہ میں ام۔ او۔ کالج میں انگریز اساتذہ میں مارلین، کارنا، اور براؤن تھے، اُن کے خلاف طلبہ میں بے چینی پیدا ہوئی، تو انھوں نے اور مطالبات کے ساتھ یہ بھی مطالبہ کیا کہ بورڈنگ ہاؤس اور ڈائننگ ہال انگریز اساتذہ کے سپرد نہ کئے جائیں، اور اگر وہ اساتذہ کی حیثیت سے نااہل ثابت ہوں تو رو رعایت کے بغیر برطرف کر دیئے جائیں، یہ بے چینی ۱۹۰۷ء میں ایک اسٹرائک میں منتقل ہو گئی، ڈاکٹر سید محمود نے اس میں نمایاں حصہ لیا، وہ اور طلبہ کے ساتھ کالج سے نکالے گئے، مگر اس سے اسٹرائک کرنے والوں کی اَنا بھی زیادہ

بے چینی بڑھی، حکیم اجمل خاں بیچ میں پڑے، اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب چند طلبہ کے ساتھ اردو ادب کے مشہور مصنف ڈپٹی نذیر احمد سے بھی جا کر ملے، ڈپٹی نذیر احمد اپنے خاص انداز میں گفتگو کرنے کے عادی تھے، انھوں نے طلبہ سے ہمدردی کا اظہار تو ضرور کیا، مگر اور باتوں کے ساتھ یہ دلچسپ باتیں بھی کہیں،

"تم جانتے نہیں انگریز کتے کی ذات ہے، جہاں ایک کتے نے پیشاب کیا، پیشاب لگے یا نہیں، ہر کتا وہاں آکر ضرور پیشاب کرے گا،

"بدماشو، سودیشی سوجھی ہے، سودیشی سوت کہاں سے آئے گا، کیا تمھاری خالائیں سوت کاتیں گی، انگریز کا مقابلہ کرنے چلے ہو"

اسٹرائک ختم ہوئی تو ڈاکٹر صاحب پھر کالج میں داخل کر لئے گئے، اور اس کے یونین پر انہی کا قبضہ رہا، جس سے انگریز اساتذہ ان سے بدظن رہے،

وہ اپنے کالج کے ساتھیوں میں ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری، تصدق احمد شروانی اور خواجہ عبدالمجید سے زیادہ متاثر تھے، کئی بار مجھ سے کہا کہ فرصت ہو گی تو دارالمصنفین میں آکر ان دوستوں پر ایک مستقل کتاب لکھواؤں گا، میں بونتا جاؤنگا تم لکھتے جانا" ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کی علمی و ادبی صلاحیت کے بلند معترف رہے، اپنے ایک مضمون میں اُن کے متعلق لکھتے ہیں،

"اس نئے دور میں مغربی تعلیم نے ہندستان میں ایک ایسا نوجوان پیدا کیا تھا جس نے مرزا غالب کی عظمت حقیقی معنوں میں پہچان لی تھی، اور جو کلام غالب کو اسی حسن معانی کیساتھ ملک کے سامنے پیش کرنے والا تھا جس سے فلسفی ہو یا شاعر اور سائنس داں سب ہی متحیر ہو جاتے، آہ عبدالرحمن، عمر نے تیرے ساتھ وفا نہ کی، تو ملک و قوم کی عظیم الشان خدمت انجام نہ دے سکا"

میرا خیال ہے کہ ان ہی کی صحبت میں ڈاکٹر صاحب کو غالب سے دلچسپی پیدا ہوئی، ان کو غالب

کے بکثرت اشعار یاد تھے، اور اپنے بڑھاپے میں بھی اُن کا کلام سُناتے تو سُناتے ہی چلے جاتے تھے ۱۹۲۲ء
غالب پر انھوں نے ایک مضمون لکھ کر اُن کے اشعار سے سیاسی نتائج نکالے جس سے ایک خاص قسم کی دلچسپی پیدا
ہوگئی، اس کا ذکر آگے آئیگا، تصدق احمد شروانی کے صاحبزادے جناب مصطفیٰ رشید شروانی ہیں جو الہ آباد ٹینری
کمپنی کے مالک ہیں، اُن سے ڈاکٹر صاحب کے بہت ہی عزیزانہ تعلقات رہے، خواجہ حبیب صاحب کے گھر والوں سے
بھی آخر وقت تک اُن کا گہرا لگاؤ رہا،

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو ان سے پہلے ڈاکٹر صاحب
کا نام بھی وائس چانسلری کے لئے اخباروں میں آیا، اسی زمانہ میں جب وہ علی گڈھ گئے، تو طلباء ان کو ایک
بہت ہی شاندار جلوس میں اسٹیشن سے یونیورسٹی لے گئے، انھوں نے اس موقع پر علی گڈھ سے اپنی محبت کا
پورا اظہار کیا لیکن وائس چانسلری کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کیا،

وہ علی گڈھ کے کسی اولڈ بوائے کی تعریف سنتے تو ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہوجاتی،
ایک بار دارالمصنفین میں ان کا قیام تھا، رات زیادہ گذر چکی تھی، میں اُن کے پاس بیٹھا باتیں کررہا تھا، اثنائے گفتگو
میں منشی ذکاء اللہ کے لائق فرزند جناب عنایت اللہ صاحب بی اے علیگ، سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد
کا ذکر آگیا، میں اُنکے ساتھ دہرہ دون میں کچھ دنوں رہ چکا تھا، اُن کی شرافت، اخلاق، وضعداری، نیت اور
اور محبت کے کچھ واقعات سُنائے، تو وہ سُن کر بہت ہی خوش اور شگفتہ ہوگئے، مجھ سے اور کہتے اُن کے کچھ اور
واقعات سناؤ، بستر سے اُٹھ کر بیٹھ جاتے اور کہتے کہ ان واقعات کو سُنا کر تم نے میری آج کی رات کیسی
خوشگوار بنا دی ہے، پھر یکایک دیکھا کہ اُن کے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اُٹھ گئے، اور وہ کچھ پڑھ رہے
ہیں، جب پڑھ چکے تو کہا میں عنایت اللہ صاحب پر فاتحہ پڑھ رہا تھا، اور اللہ تعالیٰ سے ان کی
مغفرت کے لئے دعائیں مانگی ہیں:

ان کی وفات کے بعد ان پر اخباروں میں اب تک مضامین آرہے ہیں، [illegible]

میں ان پر ایک مضمون "ڈاکٹر سید محمود کی کچھ یادیں" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، اس میں ہے:۔

"مسلم یونیورسٹی سے انھیں عشق تھا، اور ہر وقت وہ اس غم میں گھلا کرتے تھے، کہ یہ تعلیم گاہ کسی طرح سے کالر ری دست برد سے بچے، جس زمانے میں مسٹر چھاگلا وزیر تعلیم تھے، انھوں نے لوک سبھا میں علی گڑھ یونیورسٹی پر ایک انتہائی زہریلی تقریر کی جس میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ ترقی پسندانہ اور سیکولر جذبات رکھتے ہیں، اسی لئے مسلمان ان کے مخالف ہیں، ڈاکٹر سید محمود راجیہ سبھا کے ممبر تھے، لیکن اس تقریر کو سننے کے لئے وہ لوک سبھا کی گیلری میں بیٹھے تھے، چھاگلا صاحب کی تقریر کو سن کر وہ گیلری میں زور زور سے غصے میں اپنا بید فرش پر مارتے تھے، اور کہتے جاتے تھے کہ جھوٹ ہے، بدمعاشی ہے، شرارت ہے، یہ بات لوک سبھا کے آداب کے خلاف بھی، لیکن کسی کو اُن سے کچھ کہنے کی جرأت نہ تھی"

۱۹۰۷ء کے بعد وہ مزید تعلیم کے لئے یورپ گئے، انگلستان میں ان کا قیام تین سال تک رہا، کیمبرج سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی، پھر جرمنی گئے، وہاں ان کو تاریخ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی، عام طور سے مشہور رہا کہ انھوں نے مولانا شبلی کی کتاب مضامین عالمگیر کا جرمن زبان میں ترجمہ کرکے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کرلی تھی، مگر یہ شہرت ان کے حریفوں نے دی، ورنہ محبت خود انھوں نے بیان کیا کہ انھوں نے "مغلوں کی سیاسی نظام سلطنت" پر مقالہ لکھا تھا۔

وہ انگلستان اپنی وطنیت کے جذبہ میں سرشار ہوکر انگریزوں کے خلاف ایک زہریلا ذہن لے کر گئے تھے، مگر وہاں کے قیام میں انگریزوں کی شرافت اخلاق سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، اور یہ اثر ان کی زندگی کے آخری وقت تک رہا۔ مگر انھوں نے اپنے ذہن کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا، سیاسی طور پر تو انگریزوں کے مخالف رہے، لیکن اس سے ہٹ کے

وہ انگریزوں کو ہر طرح پسند کرتے تھے، اُن کی قومی اور معاشرتی خوبیوں کے معترف رہے
انگلستان میں اپنے دو انگریز استاد پروفیسر ایڈورڈ براؤن، اور ولفرڈ بلنٹ سے
زیادہ متاثر ہوئے پروفیسر براؤن کو ایرانی ادب اور تہذیب سے بڑا شغف رہا، انھوں
نے اپنی تصانیف (A history of persian Literature The-
press and poetry of Modern persia.
The wit and Humour of the persians کی وجہ سے علمی دنیا میں ہمیشہ کیلئے
ایک مستقل جگہ بنالی ہے، وہ ایرانی تہذیب کی دلدادگی میں کبھی کبھی ایرانی لباس پہنے اور ایرانی
حقہ بھی پیتے دکھائی دیتے، مسٹر بلنٹ نہ صرف ممتاز اہل علم بلکہ سیاسیات اور خصوصاً مسلم
ممالک کی سیاسیات کے ماہر سمجھے جاتے تھے، وہ اپنی تصانیف -India under
Ripon' Future of Islam- اور
The secret History of the English-
Occupation of Egypt کے لئے ہندوستان
اور اسلامی ممالک میں بہت مشہور رہے، ان کی شادی انگریزی زبان کے مشہور شاعر
لارڈ بائرن کی نواسی سے ہوئی تھی، ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لٹن کے سمدھی
بھی تھے، ایک انگریزی رسالہ بھی نکالا کرتے، کلام پاک برابر مطالعہ میں رکھتے، کہتے
کہ اسلام قبول کرنے کا دل چاہتا ہے، مگر مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں کو دیکھ کر
مسلمان ہونے سے باز آجاتا ہوں، عرابی پاشا کو جب پھانسی کی سزا دی گئی تو ان
ہی کی کوشش سے وہ پھانسی کے تختے سے اترے، ان کو سیلون جلا وطن کردیا

گیا تو مسٹر بنٹ وہاں جا کر اُن سے ملے۔ مگر اُن کو وہاں مصریوں میں آپس میں لڑتے دیکھ کر بڑا دُکھ ہوا، انھوں نے پانچ سال عرب میں بدوؤں کے ساتھ بھی گذارے تھے، عربی گھوڑوں کو پسند کرتے تھے۔ اُن کی برائی سننا پسند نہیں کرتے،
ایک بار ڈاکٹر صاحب کے ایک دوست نے اُن کے سامنے کہہ دیا کہ انگریزی گھوڑے زیادہ تیز ہوتے ہیں تو انھوں نے برجستہ کہا کہ مگر عربی گھوڑے سے زیادہ شریف ہوتے ہیں،

ڈاکٹر صاحب مسٹر بلنٹ کی خوبیوں کا ذکر برابر کرتے رہتے، انھوں نے اس کا بار بار اعادہ کیا کہ مسٹر بلنٹ ہی نے سیاسیات میں ایمانداری کے اصول پر استوار رہنے کا نکتہ ذہن نشین کرایا، اُن کی یہ تلقین کچھ ایسی موثر رہی کہ وہ سیاسیات میں ایمانداری کا ثبوت آخر آخر وقت تک دیتے رہے جس سے اور دوسرے رہنماؤں کی کی طرح وہ زیادہ کامیاب سیاست داں نہ ہو سکے، کہتے کہ کسی انگریز ہی نے کہا ہے کہ Consistency in politics is the virtue of an ass
مگر وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں خوش تھے، کہ سیاسی دیانت داری اور وضعداری کا دامن ان کے ہاتھ سے کسی حال میں نہیں چھوٹا،، گو لوگوں کو اُن سے بہت کچھ اختلاف ہوتا رہا۔ ان کا بیان ہے کہ مسٹر بلنٹ اُن سے برابر کہتے رہتے کہ

"ہندوستان کی قومی تحریکوں میں مسلمان برابر شریک ہوتے رہیں، ورنہ اُن کی حیثیت باعزت نہیں رہ سکے گی"

یہ نصیحت اُن کے ذہن پر برابر چھائی رہی، (باقی)

غزل

ازجناب ڈاکٹر ولی الحق صاحب انصاری

بخشی یہ قدرت نے ہر چیز کو زیبائی — پھولوں کو ملی نکہت تاروں نے چمک پائی

اس حسن مجسم کی اللہ رے رعنائی — بن جائے تماشا خود ہر ایک تماشائی

کچھ ایسی خبر گلشن میں باد سحر لائی — شبنم کے بہے آنسو پھولوں کو ہنسی آئی

کی لاکھ جگر کاوی، کی لاکھ جبیں سائی — تدبیر نہ ماتھے کی تحریر مٹا پائی

جب تک تھی سکوں پایا ہر دل کو شناسائی — جلتے ہوئے انگاروں پر بھی ہمیں نیند آئی

ہر پھول کو گلشن میں ہے دعویٰ رعنائی — حیراں ہے کہ دیکھے کیا کیا چشم تماشائی

تا مرگ نہ مٹ پایا جو درد ملا ہم کو — جو پھانس چبھی دل میں وہ پھر نہ نکل پائی

ہے فیضِ تبسم سے کس کی یہ فضا رنگیں — بستر سے یہ کون اٹھا لیتا ہوا انگڑائی

یہ دورِ زبوں حالی اور شوقِ غزلخوانی — بیٹھے ہو وفا لیکر بے وقت کی شہنائی

غزل

ازجناب ڈاکٹر محمد منشاء الرحمن خاں منشا

خوش بخت وہی ہے جو ہی قسمت کا دھنی ہو — دولت جسے سوزِ غم الفت کی ملی ہے

بے تابیِ پیہم سے ہے سرگرمیِ ہستی — سرمایۂ جاں تابِ تبِ زندہ دلی ہے

راضی برضا رہنا ہے معراجِ محبت مرنا رہِ الفت میں حیاتِ ابدی ہے
ہر دم یہ رہے دھیان کہ اک ہستیٔ مطلق ہر حال میں ہر وقت ہمیں دیکھ رہی ہے
ملتی ہے ہمیں اس سے بڑی دولتِ تسکین کیا فیضِ رساں اپنا یہ دامانِ تہی ہے
بن بن کے جو بگڑے وہ ہے تقدیر ہماری جو لاکھ بگڑ کر بھی بنے زلف تری ہے
ہرگز نہ تھی محفل میں لبِ گویا کے بس کی وہ بات جو خاموش نگاہی نے کہی ہے
جینے کو بہر حال جئے جاتے ہیں لیکن دو روزہ حیات ہم کو بہت تنگی پڑی ہے
تم قسمِ بہاراں کے امیں ہو تو بتاؤ کیوں آبِ رخِ لالہ و نسریں سے اڑی ہے
کچھ دل کو جلا کر ہی اجالا کر و یارو اک تیرگی سی چار دن طرف پھیلی ہوئی ہے
مستقبلِ دوراں کے ہیں مختار وہی لوگ گرمیٔ عمل جن کے رگ و پے میں بسی ہے

غزل

از جناب بدر الزماں صاحب ایڈوکیٹ لکھنؤ

ایک لغزش باعثِ تکوینِ عالم بن گئی نیکیاں کچھ اس طرح بدلیں کہ عصیاں ہو گئیں
ہم نہ کہتے تھے کہ یہ عالم فریبِ زیست ہے ساری امیدیں سمٹ کر نذرِ حرماں ہو گئیں
حسن روداد نہاں تھی حریمِ عشق میں اک تڑپ تھی دل کی سب شمعیں فروزاں ہو گئیں
کون سمجھائے انھیں اس قلبِ مضطر کی فغاں ان کے اک ہلکے تبسم سے شگفتہ دل کی کلیاں ہو گئیں
الفتِ آدم کی راہیں خلد میں مستور تھیں ایک لغزش نے نقاب الٹی تو عریاں ہو گئیں
طور اور موسیٰ کا قصہ راز دارِ عشق تھا لن ترانی سے امنگیں صرفِ نسیاں ہو گئیں

کون کہتا کس سے کہتا قیس کی روداد عشق
چاک کی سب دھجیاں تارِ گریباں ہو گئیں

مطبوعات جدیدہ

فی ملکوت اللہ، تالیف اسلم عبدالحمید الفراہی تقطیع کلاں، کاغذ عمدہ، خوبصورت ٹائپ صفحات، ۴ قیمت عہ پتہ: مکتبہ دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ۔

یہ رسالہ ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تفسیر نظام القرآن کا دیباچہ اور ملکوت اللہ کی تشریح و وضاحت پر مشتمل ہے، اس میں علم ملکوت اللہ کی دین میں اہمیت، نفوس کی تربیت اعمال کی اصلاح اور دینی و دنیاوی امور کے فہم میں اس کے فوائد اور عقلی نقلی اور تاریخی حیثیت سے اس کا ثبوت پیش کیا گیا ہے، مصنف کے نزدیک خدا کی حاکمیت کے اعتقاد اور ملکوت اللہ کی معرفت کا اہم فائدہ حکومت الٰہیہ کے موافق ان قوانین کی تشکیل ہے، جن سے دنیا امن و خیر کا گہوارہ بن جاتی ہے، خلافت کی بحث اور خلیفہ کے اوصاف کے ذکر میں بتایا گیا ہے کہ کب کیوں خدا اس نعمت سے کسی قوم کو سرفراز کرتا ہے، اور کیوں کسی قوم سے اس کو سلب کر لیتا ہے حواشی میں جابجا ان مباحث سے ملتے جلتے نوٹ بھی ہیں، اگرچہ یہ رسالہ اصل تصنیف کا خاکہ اور اس سے متعلق منتشر یادداشتوں اور اشارات کا مجموعہ ہے تاہم حقائق و معارف قرآنیہ اور مولانا کے تدبر فی القرآن کا نچوڑ ہے، اُن کی دوسری تصنیفات کی طرح اس کو بھی قرآن کے مطالعہ میں ضرور مدد ہونا چاہئے، اس کی اشاعت ایک مفید علمی و قرآنی خدمت ہے۔

رویت ہلال کا مسئلہ:- مرتبہ مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت

اوسط صفحات ۱۴۴۔ قیمت ۱۵ روپیہ، پتہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹۔ لکھنؤ۔

رویتِ ہلال کا مسئلہ دورِ حاضر کے ان اہم اور پیچیدہ مسائل میں ہے، جو مسلمانوں میں بڑے نزاع و انتشار کا باعث بنا ہوا ہے، اس پر ہندو پاک کے اصحاب علم لاتفا مختلف و متعین میں اپنی رائے کا اظہار کرتے رہے ہیں، زیرِ نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اور ابھی تک اس موضوع پر اس قدر مبسوط اور جامع تحریر نہیں لکھی گئی، اس میں پہلے رویت کے مسئلہ میں شریعت کی اصل روح بیان کی گئی ہے، پھر قدیم فقہی کتابوں میں ریڈیو، ٹیلیفون، تار اور وائرلس کے نظائر تلاش کرکے ان کی روشنی میں ان جدید وسائل کے ذریعہ چاند کی خبروں کے ثبوت و عدم ثبوت پر محققانہ بحث کی گئی ہے، آخر میں مطالع کے متعلق فقہاء و مجتہدین کے پرانے اختلافات بیان کرکے اس عہد کے اعتبار سے اس کی حدبندی کی گئی ہے، ہر بحث میں قدیم علماء و فقہا کیساتھ ساتھ جدید مفتیوں اور عالموں کے اقوال بھی تحریر کئے گئے ہیں، گو مصنف کے بعض قیاسات اور رایوں سے اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن یہ کتاب اُن کی تلاش و تحقیق اور فقہی بالغ نظری کا پورا ثبوت ہے، انھوں نے اس میں بڑے گوناگوں معلومات جمع کر دیئے ہیں، رویتِ ہلال کا مسئلہ عوام و خواص دونوں اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے الجھن کا باعث بنا ہوا ہے، لیکن یہ خالص فقہی و فنی بحث ہے، اور کتاب فقہی حوالوں سے اس قدر گرانبار ہے کہ اس سے علماء ہی پوری طرح مستفید ہو سکتے ہیں، آخر میں مجلس تحقیقات شرعیہ کے اجلاس منعقدہ مئی ۱۹۶۷ء کی رویتِ ہلال کے بارہ میں منظور کردہ تجویز بھی درج ہے،

"ض"

مصنفات سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم اے

۱- بزم تیموریہ: تیموری بادشاہوں شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے شعراء و فضلاء کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل ۶۴۲ صفحے قیمت [illegible]

۲- بزم مملوکیہ: ہندوستان کے غلام سلاطین کی علم نوازی، علم پروری، اور اس دور کے علماء و فضلاء و ادبا کے علمی کمالات و ادبی و شعری کارنامے، ۳۵۰ صفحے قیمت [illegible]

۳- بزم صوفیہ: عہد تیموریہ سے پہلے کے اہل قلم و صاحب ملفوظات صوفیائے کرام کے حالات و تعلیمات و ارشادات بکثرت اضافوں کے ساتھ نیا اڈیشن قیمت

۴- ہندوستان عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک: تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی سیاسی تمدنی و معاشرتی تاریخ، ہندو مسلمان مورخوں کے قلم سے، ۷۰۰ صفحے، قیمت: [illegible]

۵- ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام: اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے فوجی اور حربی نظام کی تفصیل ملیگی، ۵۰۰ صفحے قیمت: [illegible]

۶- ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے: اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے مختلف تمدنی جلوے پیش کئے گئے ہیں، ۵۰۰ صفحے، قیمت: [illegible]

۷- ہندوستان کے سلاطین علماء و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ضخامت: ۲۲۰ صفحے، قیمت: [illegible]

۸- ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں: ہندوستان سے متعلق امیر خسرو کے جذبات و تاثرات قیمت: [illegible]

۹- ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (جلد اول) ۲۴۲ صفحے، قیمت: [illegible]

۱۰- عہد مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں

مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارنامے مغلیہ عہد کے مسلمان اور ہندو مورخین کی اصلی تحریروں اور کتابوں کی روشنی میں، ۵۲۶ صفحے، قیمت: [illegible]

منیجر دار المصنفین اعظم گڑھ

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

مجلسِ ادارت

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات و احکام و قوانین کے لحاظ سے بلا تفریق مذہب ملت نسل و رنگ زاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے، اور اسی کو اختیار کرنے اور اسی کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے یہاں سے اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے حقوق جن میں اہل کتاب اور مشرکین عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب داخل ہیں، اور حیوانات کے حقوق، اور ان سب کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات، ان کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں ان کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا ہے۔

...... (مرتبہ) ......

شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت :- ۳۲۰ صفحے قیمت :- عہ

جلد ۱۰۸ - ماہ شوال المکرم ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۷۱ء - عدد ۶

مضامین

مقالات

وفیات

ادبیات

شذرات

ہماری بزم علمی کی پرانی یادگاریں روز بروز اٹھتی جاتی ہیں اور ہر مہینہ کسی نہ کسی کا ماتم کرنا پڑتا ہے، گذشتہ مہینہ دو نامور اہل علم نے وفات پائی، ہندوستان میں ڈاکٹر سید عبد اللطیف نے اور پاکستان میں غلام رسول مہرنے، ڈاکٹر صاحب اس دور کے نامور فاضل اور انگریزی کے مشہور اہل قلم تھے، ان کی پوری زندگی علمی و تعلیمی مشاغل میں گذری، وہ جامعہ عثمانیہ میں انگریزی یا فلسفہ کے پروفیسر تھے، اس سے رٹائر ہونے کے بعد ان کا سارا وقت تالیف و تصنیف میں گذرتا تھا، وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے، ان کے دل میں مذہب و ملت کا درد تھا، اسلامیات پر بھی ان کی نظر وسیع تھی، کلام مجید سے خاص شغف تھا، انکی بیشتر تصانیف اور مضامین کلام مجید اور اسلامی تعلیمات اور تہذیب و ثقافت کے کسی نہ کسی پہلو پر ہیں، انھوں نے کلام مجید اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن کا انگریزی ترجمہ کیا، یہ دونوں شائع ہو چکے ہیں، انگریزی تصانیف میں The Mind Al-Quran Builds زیادہ مشہور ہے، اس کا اردو ترجمہ چھپ چکا ہے، ایک کتاب اردو میں "اساس تہذیب" کے نام سے لکھی اس میں کلام مجید اور احادیث نبوی سے عالمگیر انسانی تہذیب کے عناصر دکھائے گئے ہیں، اردو شعر و ادب سے بھی ذوق تھا، انھوں نے غالب پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی، اس میں ان کی زندگی کے وہ پہلو بھی دکھائے گئے ہیں، جن سے ان کے سوانح نگار اغماض برتتے ہیں، ان مستقل تصانیف کے علاوہ انھوں نے مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت؛

بکثرت مضامین لکھے، ان کا آخری کارنامہ یہ ہے کہ اپنی وفات سے پہلے انھوں نے قرآنی ٹرسٹ کے نام سے ایک ٹرسٹ قائم کیا اور اس کو اپنی تمام تصانیف کا حق اشاعت اور بیس ہزار روپئے نقد دیے، ایسے اہل علم مسلمانوں میں اب مشکل سے ملیں گے۔ اللہ تعالیٰ علم دین کے اس خادم کو اپنی بے پایاں رحمتوں سے سرفراز فرمائے۔

غلام رسول مہر صاحب کی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا، وہ ایک زمانہ تک اخبار زمیندار کے عملۂ ادارت میں رہے، پھر مولانا ظفر علی خاں سے اختلاف کی بنا پر عبدالمجید سالک سے مل کر انقلاب کے نام سے اپنا مستقل اخبار نکالا جو اپنے دور کا مشہور اخبار تھا، اس میں اور زمیندار میں نوک جھونک چلتی رہتی تھی، انقلاب کے فکاہات جو سالک صاحب کے قلم سے ہوتے تھے، خاص چیز تھے، اس کو لوگ بڑے ذوق سے پڑھتے تھے، مہر صاحب تنہا صحافی ہی نہیں تھے، ان کا علمی و تحقیقی ذوق بھی بلند تھا، انھوں نے حضرت سید احمد شہید بریلوی اور غالب پر بڑی مبسوط اور محققانہ کتابیں لکھیں، ان کے علاوہ بھی بعض چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں، دارالمصنفین سے ان کو خاص تعلق تھا، ان سے کبھی کبھی خط و کتابت ہوتی تھی، ان کی موت سے ایک نامور اہل قلم اٹھ گیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

اس سے پہلے بھی ہم ناظرین کو دارالمصنفین کی طرف توجہ دلا چکے ہیں، کہ اس کی آمدنی کا بڑا ذریعہ کتابوں کی تجارت تھی، اور ہندوستان اور پاکستان کی آمدنی کو ملا کر کام چلتا تھا ادھر کئی سال سے پاکستان کی تجارت کی بندش کی وجہ سے تنہا ہندوستان کی آمدنی پر

دار ہو گیا ہے، جو اس کے مصارف کے لیے بالکل ناکافی ہے، اور روز افزوں گرانی کی وجہ سے اخراجات برابر بڑھتے جاتے ہیں، ابتک کسی نہ کسی طرح کام چلتا رہا، لیکن اگر مستقل قرض یعنی آمدنی میں اضافہ کی کوئی شکل نہ نکلی تو اس کے چلنے کی کوئی صورت نہیں ہے، معارف بھی کئی سال سے خسارہ سے چل رہا ہے، اگر وہ دارالمصنفین کا رسالہ نہ ہوتا تو ابتک بند ہو گیا ہوتا۔

دارالمصنفین نے آجتک کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا اس نے آمدنی میں اضافہ کی لائف ممبری اور عام ممبری کی شکل نکالی تھی، لائف ممبری کی فیس ایک ہزار تھی اور عام ممبری کی پچاس، لائف ممبروں کو دارالمصنفین کی تمام گذشتہ اور آیندہ شائع ہونے والی مطبوعات اور عام ممبروں کو ممبری کے وقت سے شائع ہونے والی مطبوعات پیش کیجاتی ہیں، اس سے دارالمصنفین کی مدد بھی ہو جاتی تھی اور ممبروں کو انکی رقم کا قریب قریب پورا معاوضہ مل جاتا تھا، ابتدا میں تو کچھ ممبر بنے مگر اسکا سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا، دارالمصنفین کی خدمات ملک کے سامنے ہیں، اگر اسکی ضرورت ہے تو اس کو قائم رکھنے کی ذمہ داری بھی قوم پر عائد ہوتی ہے۔

کچھ تنہا دارالمصنفین پر موقوف نہیں، مسلمانوں کے سارے اداروں کا یہی حال ہے، یہ نہیں کہ مسلمان بالکل تہی مایہ ہیں، انکے ایک طبقہ کے پاس اب بھی اتنی دولت ہے کہ وہ تفریحی بلکہ مضر مشغلوں میں اتنا روپیہ برباد کرتا ہے کہ اس سے بہت سے ادارے چل سکتے ہیں، مگر اس کی توفیق نہیں ہوتی، جن لوگوں میں لائف ممبری کی استطاعت نہیں ہے، وہ پچاس روپیہ سالانہ کے ممبر بن سکتے ہیں، انہیں اسکے بدلے معارف اور سال بھر کی نئی مطبوعات دیجائیں گی، اگر وہ پچاس سے کم ہونگی تو اس کے بدلے میں دوسری کتابیں لے سکتے ہیں۔

مقالات

اقبال کی تعلیمات پر ایک نظر

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

(۳)

مغربی تہذیب اور مغربی علوم مسلمانوں کے زوال کا ایک بڑا سبب دوسری قوموں کی اندھی تقلید ہے، ایک زمانہ تک وہ خود دنیا کی قوموں کے معلم اور ان کو علم و عرفان اور تہذیب و تمدن کا درس دیتے رہے، اس زمانہ میں دوسری قومیں ان کی تہذیب کو فخریہ اختیار کرتی تھیں، انھوں نے دوسری تہذیبوں کے اچھے عناصر کو اپنایا بھی، مگر اس کو اسلامی قالب میں ڈھال لیا، ابتدا میں انھوں نے ایرانی تمدن کو اختیار کیا، لیکن ایرانیوں کو اسلام کی دولت دے کر ان کے تمدن پر اسلام کی ایسی چھاپ لگا دی کہ وہ اسلامی تمدن کہلانے لگا۔

اس زمانہ میں مسلمانوں کو سب سے زیادہ مغربی تہذیب کی اندھی تقلید سے نقصان پہنچا، جو ایسے زمانہ میں پیدا ہوئی جب مسلمانوں پر زوال طاری ہو چکا تھا، ان کی قوت ختم ہو چکی تھی اور ان کی خصوصیات مٹ چکی تھیں، اس کے مقابلہ میں مغربی تہذیب بالکل تازہ دم تھی، علوم اور سائنس کی قوتوں سے مسلح اور ظاہری حیثیت سے بڑی دلکش و دلفریب تھی، اس لیے مسلمانوں نے اس کے مقابلہ میں سپر ڈال دی، اور اس کی خوبیوں اور خرابیوں سب کو اختیار

کیے بغیر آنکھ بند کرکے اس کو قبول کر لیا، بلکہ اس کی خرابیاں زیادہ اختیار کیں جس سے ان کی ملی حیثیت کو بڑا نقصان پہنچا، اس کی کمزوریوں پر اقبال کی بڑی گہری نگاہ تھی، اور وہ اس کو عالم انسانیت کے لیے مہلک سمجھتے تھے، انھوں نے اس کی خرابیوں کو پوری طرح بے نقاب کیا ہے،

مغربی تہذیب اور مغربی قوموں کی بعض خوبیوں سے انکار نہیں، ان کا جوش عمل، علم و فن کی خدمت، سائنسی تحقیقات میں ان کی جانفشانی و محنت، قوم و ملک کی راہ میں ایثار و قربانی ان سب سے بڑھ کر سائنسی اکتشافات و ایجادات اور اس قبیل کے دوسرے کارنامے مسلّم اور قابلِ تقلید ہیں، بلکہ ان کے بغیر آج کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ دنیا کا سارا اخلاقی بگاڑ اسی خدا فراموش تہذیب کا نتیجہ ہے،

اس کی سب سے بڑی خرابی اس کا مادی تصورِ حیات ہے، اس نے انسانی زندگی کی غرض و غایت کو مادیات تک محدود کر دیا ہے، اور قومی شکوہ و عظمت اور دنیاوی عیش و تنعم اس کا نصب العین بن گیا ہے، اس تصور نے مغربی قوموں کو اخلاقی قیود سے آزاد، مادی تعیشات میں غرق، اور انسانی شرف و عظمت سے محروم کر دیا ہے، جس تصورِ حیات کی بنیاد خالص مادیت پر ہوگی، اور وہ خدا کے تصور اور اخلاق و روحانیت سے خالی ہوگا، اس سے کبھی انسانیت کی فلاح نہیں ہو سکتی، اس سے انکار نہیں کہ اس نے انسانوں کے لیے راحت اور تعیش کے اتنے سامان فراہم کر دیے ہیں اور ایسے ایسے حیرت انگیز ایجادات کیے ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، اور مادی حیثیت سے انسانیت کی بڑی خدمات انجام دی ہیں، لیکن اس کے مادی تصورِ حیات کی بنا پر اخلاقی اقدار کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہی، ہر قوم عیش و تنعم میں غرق ہے، سائنس کی ترقی جو انسانیت کے لیے سراسر خیر ہو سکتی تھی، اس کی تباہی کے سامان فراہم کر رہی ہے، بڑی قوموں

میں قوت و اقتدار کی مسابقت برپا ہے، جس نے دنیا کا امن و امان خطرہ میں ڈال دیا ہے، جس سے
خود یورپ کے مفکرین مضطرب اور اخلاق و روحانیت کے دامن میں پناہ ڈھونڈھ رہے ہیں،
لیکن مغربی قوموں کے سائنسی کارنامے اتنے حیرت انگیز ہیں اور ان کی تہذیب اتنی نظر فریب ہے
اور اس میں نفس کے مطالبات کی آسودگی کا اتنا سامان ہے کہ اس کی خرابیوں اور ان کے
نتائج پر بہت کم نظر جاتی ہے، اور ایک دنیا اس کے سیلاب میں بہی چلی جا رہی ہے، اقبال
اس تہذیب کے بڑے نباض تھے، اس کی خوبیوں اور خرابیوں دونوں پر انکی گہری نظر تھی،
اس لیے انھوں نے اس کی خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ اس کی خرابیوں کو بھی بے نقاب
کیا ہے، اور مسلمانوں کو اس سے بچنے کی تلقین کی ہے، مغربی علوم اور اہل مغرب کی عقل و
دانش، ایجادات و اختراعات، تدبیر و سیاست اور جمہوری نظام کا بڑا شہرہ ہے، لیکن
اخلاق و روحانیت اور نور بصیرت سے محرومی کی بنا پر یہ سارے کمالات انسانیت کے لیے
خطرہ بن گئے ہیں، اقبال نے علم کی عظمت و شرف، اس کے کمالات اور غرض و غایت کو
گوناگوں پیرایوں میں بڑی خوبی سے واضح کیا ہے اور دکھایا ہے کہ علم جیسے اعلیٰ و اشرف عطیۂ الٰہی
کو جس کا مقصد انسانیت کی تکمیل، اس کی دنیاوی و اخروی فوز و فلاح اور اخلاقی فضائل
سے وابستگی ہے، مغرب نے اس کو مادیات میں محدود کر کے اس قدر پست کر دیا ہے کہ وہ
انسانی فلاح و سعادت کے بجائے اس کے فساد اور بگاڑ کا ذریعہ بن گئے،
دنیا کی ساری خرابیوں کی بنیاد مادی نقطۂ نظر ہے، اس کا علاج یہ ہے
کہ ان علوم کو مسلمان بنا لیا جائے۔

گفت حکمت را خدا "خیر کثیر" ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر
علم حرف و صوت را شہپر دہد پاکی گوہر بہ ناگوہر دہد

علم را بر اوج افلاک است رہ　　تا ز چشم مہر بر کند نگہ

نسخۂ او نسخۂ تفسیر کل　　بستۂ تدبیر او تقدیر کل

دل اگر بندد بحق پیغمبری است　　ور ز حق بیگانہ گردد کافری است

علم را بے سوز دل خوانی شر است　　نور او تاریکی بحر و بر است

سینۂ افرنگ را نارے ازوست　　لذت شب خون و یلغارے ازوست

قوت ابلیس را یارے بود　　نور نار از صحبتش نارے بود

کشتن ابلیس کارے مشکل است　　زانکہ او گم اندر اعماق دل است

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی　　کشتۂ شمشیر قرآنش کنی

کور را بینندہ از دیدار کن　　بولہب را حیدر کرار کن

یعنی علم اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا عطیہ ہے، اس نے علم و حکمت کو خیر کثیر فرمایا ہے، جہاں بھی یہ خیر ملے اس کو حاصل کرنا چاہیے، علم حرف اور آواز کو پرِ پرواز دیتا ہے۔ اور بد گہر اور نا اہل کو بھی اپنے فیض سے گوہر بنا دیتا ہے، علم کی راہ آسمانوں کی بلندیوں پر ہے۔ وہ مہر و ماہ کی نگاہ کو چھین لیتا ہے، وہ پوری کائنات کی تفسیر ہے اور اس کی تدبیر سے کائنات کی تقدیر وابستہ ہے۔ دل اگر حق سے وابستہ ہے تو پیغمبری ہے، اور اگر اس سے بیگانہ ہو تو کافری ہے، اسی طرح علم اگر بغیر سوز دروں کے حاصل کیا جائے تو سراسر شر ہے، اور اس کی روشنی بحر و بر کے لیے تاریکی بنجاتی ہے، بقول مولانا روم

علم را بر تن زنی یارے بود　　علم را بر دل زنی مارے بود

ایسے ہی علم سے افرنگ کا سینہ آگ کی بھٹی بن گیا ہے، اور اس کو قوموں پر یلغار اور ان کے کشت و خون میں لطف آنے لگا ہے، اس کی قوت ابلیس کی یار و مددگار ہے

اور نور بھی اس کی صحبت سے نار بنجاتا ہے، مگر یہ ابلیس دل کی گہرائی میں سرایت کئے ہوئے ہے، اس لیے اس کو مارنا تو مشکل ہے، اس کی صورت یہی ہے کہ اس کو مسلمان بنا کر قرآن کا تابع بنا لیا جائے، یعنی مغربی علوم کو اسلامی رنگ میں رنگ لیا جائے اور ان اندھے علوم میں قوت دیدار پیدا کر کے بولہب کو حیدر کرار بنا دیا جائے،

ایک نظم میں علم کے خیر و شر کے پہلوؤں کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے

علم اشیا خاک ما را کیمیاست　　آہ در افرنگ تاثیرش جداست

عقل و فکرش بے عیار خوب و زشت　　چشم او بے نم دلِ او سنگ و خشت

علم ازو رسواست اندر شہر و دشت　　جبرئیل از صحبتش ابلیس گشت

دانشِ افرنگیاں تیغے بدوش　　در ہلاکِ نوعِ انساں سخت کوش

گرگے اندر آستین برّہ　　ہر زماں اندر کمینِ برّہ

آہ از افرنگ و از آئینِ او　　آہ از اندیشۂ لادینِ او

علمِ حق را ساحری آموختند　　ساحری نے کافری آموختند

مشکلات حضرت انساں ازوست　　آدمیت را غمِ پنہاں ازوست

ہر طرف صد فتنہ می آرد نفیر　　تیغ را از پنجۂ رہزن بگیر

اے کہ جاں را باز می دانی ز تن　　سحر ایں تہذیب لادینی شکن

یعنی علم جو ہماری خاک کے لیے کیمیا کا کام کرتا ہے، افرنگ میں اس کی تاثیر جدا ہے، اس کی عقل و دانش میں اچھے برے کا کوئی معیار نہیں، اس کی آنکھیں گداز قلب کی نمی سے محروم اور اس کا دل سنگ و خشت کی طرح سخت ہے، علم کو اس نے ساری دنیا میں رسوا کر ڈالا ہے، علم کا جبریل اس کی صحبت میں ابلیس بن گیا ہے، فرنگیوں کی عقل و دانش تیغ بدوش ہو ع

انسانی کی ہلاکت کے درپے ہے۔ بڑہ کی آستین میں بھیڑیا چھپا ہوا ہے، جو ہر وقت دوسرے بڑہ کی تاک میں لگا رہتا ہے، افرنگ، اس کا آئین اور اس کی لادینی کس قدر افسوسناک ہے، اس نے علم حق کو ساحری اور ساحری کو کافری سکھائی۔ انسانیت کی ساری مشکلات اور آدمیت کے سارے غم پنہاں کا سبب وہی ہے، اس نے سیکڑوں فتنے بپا کر رکھے ہیں۔ اے مردِ مومن! بڑھکر رہزن کے ہاتھ سے تلوار چھین لے اور اس لادینی تہذیب کا سر توڑ دے۔

ایک نظم میں علم کی حقیقت اور اس کا مرتبہ ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے،

علم اگر کج فطرت و بدگوہر است — پیش چشم ما حجابِ اکبر است
علم را مقصود اگر باشد نظر — می شود ہم جادہ وہم راہ بر
می نہد پیش تو از قشر وجود — تا تو پرسی چیست این راز وجود
جادہ را ہموار سازد این چنیں — شوق را بیدار سازد این چنیں
درد و داغ و تاب و تب بخشد ترا — گریہائے نیم شب بخشد ترا
علم تفسیرِ جہانِ رنگ و بو — دیدہ و دل پرورش گیرد ازو
بر مقام جذب و شوق آرد ترا — باز چون جبریل بگذارد ترا
عشق کس را کے بخلوت می برد — او ز چشم خویش غیرت می برد

یعنی جس علم کا مقصد صحیح نہ ہو، وہ انسان کے لیے حجاب اکبر ہے، اور جس کا مقصد صحیح نظر پیدا کرنا ہو، وہ راہ بھی ہے، اور رہنما بھی، وہ انسان کے سامنے وجود کی حقیقت کھول کر رکھ دیتا ہے، انسان کے لیے راہ کو ہموار اور اس کا شوق بیدار کرتا ہے، اسکے دل میں درد و داغ اور تب و تاب پیدا کرتا اور گریۂ نیم شب کی دولت بخشتا ہے، ایسا علم اس جہانِ رنگ و بو کی تفسیر ہے، اور اسی سے دیدہ و دل کی تربیت ہوتی ہے۔

وہ جذب وشوق کے مقام پر پہنچ کر جبریل کی طرح خود الگ ہو جاتا ہے یعنی جیسے طرح جبریل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام شوق میں پہنچا کر خود الگ ہو گئے تھے ۔

اگر یک سرموئے برتر پرم
فروغ تجلی بسوزد پرم

اسی طرح علم انسان کو مقام شوق میں پہنچا کر الگ ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ عشق بڑا غیور ہے ، وہ اپنی آنکھ سے بھی غیرت کرتا ہے ، کسی دوسرے کو بزم خلوت میں کس طرح پسند کر سکتا ہے ، اس موقع پر حضرت بو علی قلندر کا ایک شعر بے اختیار یاد آ گیا ،

غیرت از چشم برم روے تو دیدن ندہم　　گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

انھوں نے علم وحکمت کو خدا کا انعام اور مسلمانوں کی میراث قرار دیا ہے اور اس کے حصول کی ترغیب دی ، لیکن مغربی علوم اور مغربی تہذیب کی مضرتوں سے بچنے کی تلقین کی ہے

برگ وساز ما کتاب وحکمت است　　این دو قوت اعتبار ملت است
آن فتوحات جہان ذوق وشوق　　این فتوحات جہان تحت وفوق
ہر دو انعام خدائے لایزال　　مومناں را آن جمال است ایں جلال
حکمت اشیا فرنگی زاد نیست　　اصل او جز لذت ایجاد نیست
نیک اگر بینی مسلمان زادہ است　　این گہر از دست ما افتادہ است
چوں عرب اندر اروپا پر کشاد　　علم وحکمت را بنا دیگر نہاد
دانہ آن صحرا نشیناں کاشتند　　حاصلش افرنگیاں برداشتند
این پری از شیشۂ اسلاف ماست　　باز صیدش کن کہ او از قاف ماست
لیکن از تہذیب لادینی گریز　　زانکہ او با اہل حق دارد ستیز

فتنہ ہا این فتنہ پرداز آورد — لات و عزیٰ در حرم باز آورد
از فسونش دیدۂ دل نابصیر — روح از بے آبی او تشنہ میر
لذتِ بیتابی از دل می برد — بلکہ دل زین پیکر گل می برد

یعنی ہمارا برگ و ساز کتاب اللہ اور دنیاوی علم و حکمت دونوں ہیں، انہی کی قوت ملت کا اعتبار قائم ہے، کتاب اللہ سے جان ذوق و شوق کی فتوحات حاصل ہوتی ہیں، حکمت سے اس مادی دنیا کی، دونوں خدائے لایزال کا انعام ہیں، ان میں سے ایک مومن جمال ہے، دوسرا جلال، علم و حکمت فرنگیوں کی میراث نہیں، وہ تو لذت ایجاد کا نام ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس کو پیدا کیا ہے اور وہ ہمارے ہی ہاتھوں سے گرا ہوا گوہر ہے جس کو دوسروں نے اٹھا لیا ہے، جب عرب یورپ پہنچے تو انھوں نے علم و حکمت کی نئی بنیاد رکھی، دانہ تو ان صحرانشینوں نے بویا، اور اس کی پیداوار فرنگیوں کے ہاتھ آئی، علم و حکمت ہمارے اسلاف کے شیشے اور ہمارے کوہ قاف کی پری ہے، اس لیے اس کو دوبارہ اپنے قبضہ میں کرنا چاہیے، لیکن اس لادینی تہذیب سے بچو، وہ اہل حق کے ساتھ برسر پیکار رہتی ہے، یہ فتنہ پرداز بڑے بڑے فتنے بپا کرتی ہے، وہ حرم سے نکالے ہوئے لات و عزیٰ کو پھر حرم میں واپس لاتی ہے، اس کے افسوں سے دل کی آنکھ بے نور ہو جاتی ہے، اور روح اس کی بے آبی سے پیاسی تڑپتی ہے، وہ دل کی بیتابی کی لذت چھین لیتی بلکہ دل ہی کو جسم سے نکال لیتی ہے،

ایک نظم میں بڑی خوبی سے دکھایا ہے کہ مغربی علم و حکمت نو مومن کو مسخ کر کے رکھ دیتی ہے اس علم و حکمت کا نام انھوں نے حکمت فرعونی رکھا ہے، اس کی خصوصیات اور کارنامے یہ ہیں:

حکمت از بندِ دیں آزادۂ او | از مقامِ شوق دور افتادۂ او
مکتب از تدبیر او گیرد نظام | تا بکامِ خواجہ اندیشد غلام
شیخِ ملت با حدیثِ دلنشیں | بر مرادِ او کند تجدیدِ دیں
وائے قومے کشتۂ تدبیرِ غیر | کارِ او تخریبِ خود تعمیرِ غیر
می شود در علم و فن صاحب نظر | از وجودِ خود نہ گردد باخبر
از حیا بیگانہ پیرانِ کہن | نوجواناں چوں زناں مشغولِ تن
دخترانِ او بزلفِ خود اسیر | شوخ چشم و خود نما و خورده گیر
ساعدِ سیمیں شاں عیشِ نظر | سینۂ ماہی بموج اندر نگر
ملتے خاکسترِ او بے شرر | صبحِ او از شامِ او تاریک تر
ہر زماں اندر تلاشِ ساز و برگ | کارِ او فکرِ معاش و ترسِ مرگ
قوتِ فرمانروا معبودِ او | در زیانِ دین و ایماں سودِ او
دینِ او عہدِ وفا بستن بغیر | یعنی از خشتِ حرم تعمیرِ غیر

آہ قومے دل ز حق پرداختہ
مُرد و مرگِ خویش نشناختہ (مسافر)

یہ حکمت دین کی قید سے آزاد اور مقامِ ذوق و شوق سے دور ہے اور تعلیم کا

۱؎ اس خیال کو انھوں نے اردو کے ایک قطعہ میں بھی ظاہر کیا ہے:

حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں | آہ محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں | ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب | کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

نظام اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے، تاکہ غلام آقا کے مصالح و مفاد کو پیش نظر رکھے، شیخ ملت بھی دلنشین انداز میں اس کے مفاد کے مطابق دین کی تجدید کرتا ہے، اس قوم کی حالت قابل افسوس ہے، جو دوسروں کی تدبیر کی کشتہ ہے، اور اس کا کام اپنی تخریب اور دوسروں کی تعمیر ہو، اس علم سے اگرچہ علم و فن میں صاحب نظر ہو جاتی ہے لیکن اپنے وجود اور اپنی انفرادیت سے بے خبر رہتی ہے، اس کے بوڑھے حیا و شرم سے بیگانہ اور عورتوں کی طرح اپنے جسم کی آرایش میں مشغول رہتے ہیں، ان کی لڑکیاں اپنی کنگھی چوٹی میں گرفتار رہتی ہیں، شوخ چشم، خود نما اور خوردہ گیر ہوتی ہیں، ان کے ساعد سیمیں دوسروں کے ذوق نظر کا سامان فراہم کرتے ہیں، اور موجوں کے اندر سینۂ ماہی کا منظر پیش کرتے ہیں، ایسی ملت کی خاکستر میں زندگی کا کوئی شرر نہیں ہوتا، اس کی صبح اس کی شام سے زیادہ تاریک ہوتی ہے، وہ ہر وقت دنیاوی ساز و سامان کی تلاش میں رہتی ہے اس کا کام صرف فکر معاش اور موت کا خوف ہے، فرمانروا کی قوت اس کی معبود ہوتی ہے، اور دین و ایمان کے نقصان میں اس کو فائدہ نظر آتا ہے، اس کا مذہب دوسروں کی وفاداری یعنی حرم کی اینٹ سے دیر کی تعمیر ہے، اس قوم کی حالت کس قدر عبرتناک ہے، جس نے حق سے دل موڑ لیا ہے، وہ مر چکی ہے لیکن اپنی موت کو نہیں پہچانتی،

یہ محکوم اور غلام قوموں کی کیسی مکمل تصویر ہے، گو یہ تصویر انگریزوں کے دور کی ہے لیکن آج کے حالات بھی اس سے مختلف نہیں ہیں،

مغربی قوموں کی ترقی کا حقیقی سبب | مغربی تہذیب کا سب سے بڑا سحر اس کی مادی ترقی اور سائنس کی ایجادات و اکتشافات ہیں، جس سے کسی کو بھی انکار نہیں، لیکن مغربی قوموں کی ترقی کا سبب ان کے عیوب نہیں، بلکہ ان کی خوبیاں، انکے کمالات اور علم و فن میں ان کی جانکاہ محنت ہے، مشرق

ۤموں میں سہل پسندی کی بنا پر ان کمالات کو حاصل کرنے کی تو ہمت نہیں ہوتی محض مغربی تہذیب کی خرابیوں اور اس کی ظاہری چمک دمک کی تقلید میں مبتلا ہیں ،

شرق را از خود برد تقلیدِ غرب ۔۔۔ باید ایں اقوام را تنقیدِ غرب
قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب ۔۔۔ نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب
نے ز سحرِ ساحرانِ لالہ روست ۔۔۔ نے ز عریاں ساق و نے از قطعِ موست
محکمی او را نہ از لادینی است ۔۔۔ نے فروغش از خطِ لاطینی است
قوتِ افرنگ از علم و فن است ۔۔۔ از ہمیں آتش چراغش روشن است
حکمت از قطع و برید جامہ نیست ۔۔۔ مانعِ علم و ہنر عمامہ نیست
علم و فن را اے جوانِ شوخ و شنگ ۔۔۔ مغز می باید نہ ملبوسِ فرنگ
اندریں رہ جز طلب مطلوب نیست ۔۔۔ ایں کلہ یا آں کلہ مطلوب نیست
فکرِ چالاکے اگر داری بس است ۔۔۔ طبعِ درّاکے اگر داری بس است
گر کسے شبہا خورد دودِ چراغ ۔۔۔ گیرد از علم و فن و حکمت سراغ
ملکِ معنی کس حدِّ او را نہ بست ۔۔۔ بے جہادِ پیہمے ناید بدست
بندۂ افرنگ از ذوقِ نمود ۔۔۔ می برد از غربیاں رقص و سرود
نقدِ جانِ خویش در بازد بہ لہو ۔۔۔ علم دشوار است می سازد بہ لہو
از تن آسانی بگیرد سہل را ۔۔۔ فطرتِ او در پذیرد سہل را
سہل جستن در دریں دیرِ کہن ۔۔۔ ایں دلیلِ آنکہ جاں رفت از بدن

یعنی مشرق کو مغرب کی تقلید نے از خود رفتہ کر دیا ہے، اس کا کام تو اس کی تنقید تھا، نہ کہ اندھی تقلید، مغرب کی قوت چنگ و رباب اور بے حجاب لڑکیوں کے رقص و سرود

لالہ رو و شیزاؤں کی ساحری، ان کی عریانی اور فیشن پرستی اور ان کا استحکام لادینی
اور ان کی ترقی لاطینی حروف کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ ان کی قوت کا راز ان کا علم
وفن ہے، اسی کی آگ سے ان کا چراغ روشن ہے، علم کسی خاص لباس کا پابند نہیں اور
عمامہ حصول علم میں مانع نہیں ہے، اصل مقصود علوم اور ان کی طلب ہے، لباس کوئی بھی ہو
اس کے لیے فکر چالاک اور طبیع رسا کی ضرورت ہے، علم جانکاہ محنت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا،
ملک معنی میں علوم کی کوئی حد وانتہا نہیں ہے، اور وہ مسلسل جد وجہد کے بغیر ہاتھ نہیں آتے
مگر فرنگیوں کے غلاموں نے نمود ونمایش کے لیے ان کے صرف رقص وسرود کی نقل وتقلید
کی، علم بڑی کٹھن چیز ہے، وہ جانکاہی چاہتا ہے، اور خون پسینہ ایک کیے بغیر حاصل نہیں
ہوتا، ہماری تن آسانی اور سہل پسند فطرت نے مشکل کے مقابلہ میں صرف آسان چیز کر لیا
حالانکہ دنیا میں آسانی کی تلاش کے معنی یہ ہیں کہ جسم میں جان باقی نہیں رہی۔

مغربی تعلیم علم وفن کے بارے میں مغربی قوموں کے نقطۂ نظر اور اس کی غرض وغایت میں
جو خرابیاں ہیں، وہی ان کے نظام تعلیم میں بھی ہیں، کیونکہ دونوں لازم ملزوم ہیں، بلکہ
اصل بنیاد جس سے انسان کے ذہن ودماغ کی تربیت ہوتی ہے، اور اس کے خیالات
بنتے اور بگڑتے ہیں، تعلیم ہی ہے، اس لیے انھوں نے مغربی علوم پر جو تنقید کی ہے، وہی
نظام تعلیم پر بھی ہے، جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے،

ان کے نزدیک اس نظام تعلیم کی سب سے بڑی خرابی اس کا مادی نقطۂ نظر ہے،
جو مشرقی قوموں خصوصاً مسلمانوں کے ملی مزاج اور اُن کی ضروریات سے مطابقت
نہیں کرتا، اور اس سے ان کی خصوصیات ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ تعلیم نہ صرف دینی روح
سے خالی ہے، بلکہ مذہب واخلاق کے بھی سراسر خلاف ہے،

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم　　ایک سازش ہے فقط دین و مروت کیلیے

وہ دینی روح کو ختم کر دیتی ہے

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا　　کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

اس کا نتیجہ الحاد و بے دینی ہے،

تعلیم پیر فلسفۂ مغربی ہے یہ　　ناداں ہیں جنکو ہستیٔ غائب کی ہو تلاش

محسوس پہ بنا ہے علوم جدید کی　　اس دور میں ہو شیشۂ عقائد کا پاش پاش

مذہب ہو جس کا نام وہ ہو اک جنون خام　　ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انتعاش

کہتا مگر ہے فلسفۂ زندگی کچھ اور　　مجھ پر کیا یہ مرشد کامل نے راز فاش

باہر کمال اندکے آشفتگی خوش است　　ہرچند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش

یہ تعلیم عقل کو تو آزاد کر دیتی ہے لیکن خیالات کو بے لگام چھوڑ دیتی ہے۔

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر　　چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

اگر انسان میں صحیح فکر و تدبر کا سلیقہ نہیں ہے تو آزادی افکار اس کی تباہی کا سامان... اور اس کو حیوان بنانے کا طریقہ ہے،

آزادی افکار سے ہے انکی تباہی　　رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ

ہو فکر اگر خام تو آزادی افکار　　انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

قوموں سے زندگی کی روح ختم کر دیتی ہے،

مباش ایمن ازاں علمے کہ خوانی　　کہ از وے روحِ یک قومے تواں کشت

اس کی خصوصیات چھین کر اس کو بے جان کر دیتی ہے،

نوا از سینۂ مرغ چمن برد　　ز خونِ لالہ آں سوزِ کہن برد

یہ ایں مکتب بہ ایں دانش چہ نازی / کہ نان در تن نداد و جان زتن برد

زندگی کی ضروریات اور تقاضوں سے مطابقت نہیں کرتی ہے اس لیے اس سے

ندگی کا چراغ روشن نہیں ہوتا،

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے / زندگی سوز جگر ہے علم ہے سوز دماغ

اہل دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہل نظر / کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ

شیخ مکتب کے طریقوں میں کشاد اکہاں / کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

اعلیٰ اخلاقی فضائل اور انسانی کمالات سے محروم کر دیتی ہے،

اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا / جو یہ کہتا ہے خرد سے کہ بہانے نہ تراش

فیض فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا / جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہ خفاش

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو / خلوت کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

اس تعلیم کا طالب علم اگرچہ دیکھنے میں زندہ نظر آتا ہے لیکن حقیقۃً وہ مردہ ہے،

ی کی سانس تک فرنگ سے مستعار ہے، اس کی صحیح تربیت مرد مومن کی نگاہ ہی کر سکتی ہے،

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے / مردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس

پرورش دل کی اگر مدنظر ہے تجھ کو / مرد مومن کی نگاہ غلط انداز ہے بس

اس کا مقصد قوموں کی خصوصیات کو مٹا کر ان کے دل و دماغ کو مفتوح کرنا اور

س کو فرنگی تہذیب کے قالب میں ڈھالنا ہے، اس راز کو ایک فرنگی مفکر کی زبان

سے افشا کرتے ہیں،

سینے میں رہے راز ملوکانہ تو بہتر / کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو / ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے ادھر پھیر

تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب — سونے کا پیالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

یعنی جو کام فوجی قوت انجام نہیں دے سکتی، وہ تعلیم انجام دیتی ہے، توپ اور تلوار جسم کو تو فتح کر لیتے ہیں، لیکن ذہن و دماغ کو فتح نہیں کر سکتے، اس کام کو تعلیم انجام دیتی ہے۔

اس موقع پر اکبر الہ آبادی کا ایک ظریفانہ مگر حکیمانہ شعر یاد آ گیا،

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے — جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

نوجوانوں کو تعیشات میں پھنسا کر ناکارہ بنا دیتی ہے، اقبال کس درد سے کہتے ہیں

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی — لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

امارت کیا، شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل — نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

ان خرابیوں کے باوجود وہ مغربی علوم کی طرح تعلیم جدید کے بھی مخالف نہیں، بلکہ اسکے مادی نقطۂ نظر کے خلاف ہیں، اور اس کی اصلاح کا ذریعہ ان کے نزدیک مذہب ہے، اگر دل میں دین کی حرارت موجود ہے، تو جدید تعلیم کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی، لیکن اگر اس سے خالی ہے تو ایک مسلمان کے لیے پیام موت ہے۔

جوہر میں ہو لا الٰہ تو کیا خوف — تعلیم ہو گو فرنگیانہ

کھلے ہیں سب کے لیے مغربیوں کے میخانے — علوم تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں

اسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تری — ترے بدن میں اگر سوز لا الٰہ نہیں

وہ جس قسم کی تعلیم چاہتے ہیں اس کا خلاصہ انھوں نے ایک قطعہ میں بیان کر دیا ہے،

بہ پور خویش دین و دانش آموز — کہ تابد چوں مہ و انجم نگینش

بدست او اگر دادی ہنر را — ید بیضا ست اندر آستینش

یعنی مسلمان نوجوانوں کی صحیح تعلیم و ترقی کے لیے دین اور علم و ہنر تینوں کی تعلیم ضروری ہے

سی سے وہ ماہ و انجم بن کر چمک سکتے ہیں۔

رنگی سیاست[1] اوپر مغربی علوم کے سلسلہ میں جو اشعار نقل کیے گئے ہیں، ان سے بھی مغربی سیاست کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے، اس پر اقبال نے مستقل نظمیں بھی لکھی ہیں، ان کے نزدیک مغربی سیاست سراسر ابلیسی ہے،

تری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ　　مگر ہیں اسکے پجاری فقط امیر و رئیس

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تونے　　بنائے خاک سے اس نے دوصد ہزار ابلیس

اس کا مقصد محض کمزور قوموں کو غلام بنانا اور ان سے تجارتی فوائد حاصل کرنا ہے، یورپ کی جمہوریت سے جس کا غلغلہ اتنا بلند ہے، مردہ قومیں اور زیادہ مردہ ہو جاتی ہیں، یورپ کے ڈپلومیٹوں اور مدبروں نے دنیا کی قوموں کو اپنی بساط سیاست کا مہرہ بنا رکھا ہے، اور ہر وقت ایک دوسرے کی گھات میں لگے رہتے ہیں، کسی کے حصہ میں مال و زر آتا ہے، کسی کے حصہ میں رنج و نامرادی، حقیقت یہ ہے کہ ہم سب مال تجارت ہیں، اور وہ اس کے سوداگر، اگرچہ افرنگیوں کے شیوے رنگا رنگ ہیں، لیکن ان سے عبرت کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا،

وائے بر دستورِ جمہورِ فرنگ　　مردہ تر شد مردہ از صورِ فرنگ

حقہ بازاں چوں سپہرِ گردگرد　　از امم بر تختۂ خود چیدہ نرد

شاطراں ایں گنج ور، آں رنج بر　　ہر زماں اندر کمینِ یک دگر

---

[1] یہ واضح رہے کہ یورپ کی سیاست کی نظمیں آج سے تقریباً نصف صدی پہلے کی ہیں، جبکہ بیشتر ایشیائی ملک یورپ کے غلام تھے، اب قریب قریب سب آزاد ہو چکے ہیں، اس لیے ان نظموں کو اس وقت کے حالات کی روشنی میں پڑھنا چاہیے، اگرچہ اب سیاست کی شکل بدل گئی ہے لیکن اس کی روح اب بھی وہی ہے۔

فاش باید گفت سرِ دلبراں | ما متاع و ایں ہمہ سوداگراں
گرچہ دارد شیوہ ہائے رنگ رنگ | من بجز عبرت نگیرم از فرنگ

ایک نظم میں اس کی تاجرانہ سیاست کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔

وائی از افرنگ و از کارِ فرنگ | تا کجا در قیدِ زنارِ فرنگ
زخم از و نشتر ازو سوزن ازو | ما و جوئے خون و امید رفو
خود بدانی پادشاہی قاہریست | قاہری در عصرِ ما سوداگری است
تختۂ دکاں شریکِ تخت و تاج | از تجارت نفع و از شاہی خراج
آں جہاں بانے کہ ہم سوداگر است | بر زبانش خیر و اندر دل شر است
وقت سودا خند خند و کم خروش | ما چو طفلانیم او شکر فروش
محرم از قلب و نگاہِ مشتری ست | یارب ایں سحر است یا سوداگری ست
تاجرانِ رنگ و بو بردند سود | ما خریداراں ہمہ کور و کبود
اے ز کارِ عصرِ حاضر بے خبر | چرب دستیہائے یورپ را نگر

یعنی کیا فرنگ کے کاروبار سے تم واقف نہیں، آخر اس کے سحر میں کب تک گرفتار رہیں گے، ہمارے سارے مصائب و مشکلات کا سبب اس کی تاجرانہ سیاست ہے۔ ہم اس سے چارہ گری کی امید رکھتے ہیں، اس زمانہ میں حکومت بھی تجارت بن گئی اور دکان داری بھی تاج و تخت میں شریک ہے، اس لیے وہ محکوم سے خراج حاصل کرتا ہے اور تجارتی نفع بھی، جو حکمراں تاجر ہو اس کی زبان پر تو خیر ہوتا ہے، لیکن اسکا دل شر سے معمور ہوتا ہے، وہ تجارت کے وقت ہنس ہنس کر میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے، اسکی حالت شکر فروش کی اور ہماری بچوں کی ہے، وہ خریدار کے مذاق اور طبیعت کے

رجحان سے خوب واقف ہوتا ہے، اس لیے اس کی سوداگری ساحری بن گئی ہے، ہم اندھے بہرے خریدار ہیں، اس لیے رنگ و بو کے یہ تاجر ہم کو خوب لوٹتے ہیں، عصر حاضر کے کاروبار سے بے خبر اور یورپ کی چرب زبانی اور چابک دستی سے ہوشیار رہنا چاہیے،
اس سیاست اور تجارت کے لیے انھوں نے بڑے خوش رنگ پھندے بنائے ہیں،
ان میں جمہوریت بھی ہے، مگر ان کی جمہوریت درحقیقت استبداد کے چہرے کی نقاب ہے،
جس کی آڑ میں دیو استبداد چھپا ہوا ہے، اور اس کی سیاست کے سارے روپ رنگ
کا سراب ہیں، جس کو نادان گلستان سمجھ رہے ہیں،

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردہ میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد ہے جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے کہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق — طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو — آہ! اے نادان قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

ایک دوسری نظم میں ایک دوسرے دام جمعیۃ الاقوام کا پردہ فاش کرتے ہیں،

می کند بند غلاماں سخت تر — حریت می خواند آں را بے بصر
گرمی ہنگامۂ جمہور دید — پردہ بر روے ملوکیت کشید
سلطنت را جامع اقوام گفت — کار خود را پختہ کرد و خام گفت
در فضایش بال و پر نتواں کشود — با کلیدش ہیچ در نتواں کشود
گفت با مرغ قفس اے دردمند — آشیاں در خانۂ صیاد بہ
ہر کہ سازد آشیاں در دشت و مرغ — او نباشد ایمن از شاہین و چرغ
از فسونش مرغ زیرک دانہ مست — نالہا اندر گلوئے او شکست

الحذر از گرمی گفتار او — الحذر از حرفِ پہلودار او
چشمہا از سرمہ اش بے نور تر — بندۂ مجبور از و مجبور تر
از خودی غافل نگردد مرد حر — حفظ خود کن حبِّ افیونش مخور

یعنی مغربی سیاست کے فریب سے جس چیز کو نادان آزادی سمجھتے ہیں، وہ غلامی کو اور زیادہ سخت کر دیتی ہے، اس کی جمہوریت کا شور ملوکیت کے چہرہ کی نقاب ہے، انھوں نے اپنی حکومت اور سیاست کو جمعیۃ الاقوام کا لباس پہنا کر اپنا کام اور پختہ کر لیا ہے، اس کی فضاؤں میں پرپرواز کھولنا ممکن نہیں ہے، اس کی کنجی سے کوئی دروازہ بھی نہیں کھل سکتا۔ اس کی گرمی گفتار اور پہلودار باتوں سے بچنے کی ضرورت ہے، اس کے سرمہ سے آنکھیں اور بے نور ہو جاتی ہیں، اور مجبور غلام اور بھی مجبور ہو جاتا ہے، لیکن مرد حر اپنی خودی سے غافل نہیں ہوتا، اس لیے اپنی حفاظت کا سامان کرنا اور اس کی افیون کے نشہ سے بچتے رہنا چاہیے،

پرانی مجلس اقوام کی حقیقت[1] اقبال نے جس طرح چار مصرعوں میں ظاہر کر دی ہے، وہ سیکڑوں اشعار پر بھاری ہے،

برفتد تا روشِ رزم دریں بزم کہن — دردمندانِ جہاں طرحِ نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند — بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

اس کا سبب یہ ہے کہ یورپ کی سیاست دین کی روح سے خالی اور ایک دیوِ بے زنجیر ہے،

مری نگاہ میں ہے یہ سیاستِ لادیں — کنیزِ اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر
ہوئی ہے ترکِ کلیسا سے حاکمی آزاد — فرنگیوں کی سیاست ہے دیوِ بے زنجیر

[1] موجودہ جمعیۃ الاقوام بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔

جو قوت دین سے خالی ہوگی وہ زہر ہلاہل اور دنیا کے لیے ہلاکت و تباہی کا پیام ہے، یہی قوت جب دین کے حصار میں آجاتی ہے تو تریاق بنجاتی ہے،

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں — سو بار ہوئی حضرت انساں کی قبا چاک
تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے — صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے — عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

لادین ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بڑھکر
ہو دیں کی حفاظت تو ہر زہر ہے تریاک

جو قوم خدائی نور سے محروم اور اکل حلال کے نکتہ سے ناواقف ہوگی وہ دوسروں کا جینا وبال کردیگی، فرنگی اس سے محروم ہیں، اس لیے ان میں حلال وحرام کی تمیز نہیں، اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کو چرتی ہے، ایک دانہ بوتی ہے، دوسری اس کی پیداوار پر قبضہ کرتی ہے، اس کے نزدیک کمزوروں کی روٹی چھیننا اور انکے جسم سے جان نکال لینا ہی حکمت ہے، اس تہذیب کا شیوہ آدم دری ہے، اور اسکا پردہ تجارت ہے،

تا ندانند نکتۂ اکل حلال — بر جماعت زیستن گردد وبال
آہ یورپ زین مقام آگاہ نیست — چشم او ینظر بنور اللہ نیست
او نداند از حلال و از حرام — حکمتش خام است و کارش ناتمام
امتے بر امتے دیگر چرد — دانہ این می کارد آن حاصل برد
از ضعیفاں نان ربودن حکمت است — از تن شان جان ربودن حکمت است
شیوۂ تہذیب نو آدم دری است — پردۂ آدم دری سوداگری است

ان ساری خرابیوں کی بنیاد دین و سیاست کی علیحدگی ہے، اور اس کا علاج یہ ہے کہ دونوں کو ملا دیا جائے۔ اسی میں انسانیت کی فلاح ہے، جس کا نمونہ اسلام پیش کر چکا ہے۔

سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا — چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی — ہوس کی امیری ہوس کی فقیری
دوئی ملک و دیں کیلئے نامرادی — دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا — بشیری ہے آئینہ دار نذیری

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

(باقی)

اقبال کامل

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین، رسالے، اور کتابیں لکھی گئیں، لیکن ان سے ان کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایاں نہ ہو سکی، یہ کتاب اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، اس میں ان کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل لکھی گئی ہے، سوانح حیات کے بعد پہلے ان کی اردو شاعری پھر فارسی شاعری پر ان کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور ان کے کلام کی تمام ادبی خوبیاں دکھائی گئی ہیں، پھر ان کی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی، نظریۂ ملیت، تعلیم، سیاست، صنف لطیف (یعنی عورت)، فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے۔ (طبع دوم)

(مرتبہ مولانا عبدالسلام صاحب ندوی مرحوم) قیمت: للعہ

چند قرآنی الفاظ کی لغوی تحقیق

از جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ پی، ایچ، ڈی (لنڈن) سابق پروفیسر پنجاب یونیورسٹی

(۲)

۶- درہم۔ درہم چاندی کا ایک چھوٹا سکہ تھا، جو ظہور اسلام کے وقت ایرانی سلطنت میں رائج تھا، اور عراق (مثلاً حیرہ وغیرہ) میں بھی مروج تھا، جو اس زمانے میں کسریٰ کے زیرنگیں تھا، درہم کا لفظ قدیم عربی شاعروں کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے، اور گمان غالب ہے کہ ایام جاہلیت کے عرب اس سکہ سے ایرانیوں ہی کے واسطہ سے واقف ہوئے تھے، کیونکہ ان کے اپنے ملک میں نہ کوئی دارالضرب تھا اور نہ کوئی اپنے مخصوص سکے تھے، ہمسایہ ملکوں میں جو درہم و دینار چلتے تھے انہی سے کام چلاتے تھے۔

درہم کا لفظ بصیغۂ جمع (یعنی بصورت دراہم) قرآن مجید میں صرف ایک جگہ استعمال ہوا ہے، سورۂ یوسف میں ہے

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ	اور انھوں نے اس کو (یعنی یوسفؑ کو)
مَعْدُودَةٍ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ	چند درہموں کے بدلے میں سستے داموں
الزَّاهِدِينَ .	بیچ ڈالا اور انھوں نے اسکی کچھ قدر نہ پہچانی ،

علمائے لغت میں سے کسی نے درہم کو یونانی اور کسی نے پہلوی بتایا ہے، یہ دونوں قول اپنی اپنی جگہ درست ہیں، کیونکہ درہم اگرچہ دراصل یونانی کلمہ Drachme سے

لیکن عربوں کے ہاں پہلوی کے واسطے سے ایران سے آیا ہے۔ اسکندر اعظم کی فتوحات کے بعد یونان اور ایران کے درمیان اختلاط بڑھ گیا تھا، اور اس کے ایک سپہ سالار سلوکس نے ایران میں ایک مستقل خاندان کی بنیاد ڈالدی تھی۔ ان حالات میں گمان غالب یہی ہے کہ درہم پہلے ایران میں یونانی حکومت کے اثر سے رائج ہوا، پھر وہاں سے عراق اور دیار عرب میں پہنچا۔ قدیم سکوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ درہم کو اختیار کرتے وقت ایرانیوں نے اس کے نقوش میں اپنے معاشرے کی مناسبت سے قدرے تبدیلی کر دی تھی، چنانچہ ساسانی عہد میں جو درہم مضروب ہوئے، اُن میں ایک طرف شاہ وقت کی شبیہ ہے اور دوسری طرف ایک آتشکدہ کا نقش ہے، جس کے دونوں طرف دو پروہت کھڑے ہیں۔

درہم کا رواج ایران کی فتح کے بعد اسلامی عہد میں کئی صدیوں تک جاری رہا اور خلیفہ عبد الملک اموی نے درہم و دینار پر عربی کلمات نقش کرائے۔ اگرچہ مشرقی ملکوں میں درہم ایک مدت سے متروک ہو چکا ہے، لیکن اپنے اصلی ملک یعنی یونان میں قومی سکہ کی حیثیت سے آج تک بدستور مروج ہے، یہ اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ درہم کی اصل یونانی ہے۔

تنبیہ:۔ شیخ غلام احمد پرویز اپنی "لغات القرآن" (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۱ء) میں درہم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "یہ رومی لفظ Drawburg کا معرب ہے"۔ معلوم نہیں کہ پرویز صاحب نے یہ بے سروپا بات کہاں سے اخذ کی ہے۔

یہ یونانی کلمہ تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ بعض مغربی زبانوں میں بھی دخیل ہو چکا ہے، چنانچہ انگریزی میں Dram کی صورت میں پایا جاتا ہے، جیسا کہ ذیل کے

نقشے سے ظاہر ہے۔

(درا خمہ) Greek : Drakhme

Latin : drachma — Pahlavi : درہم

Mid Latin : drarna — Arabic : درہم

Old French : dramc

English : dram

۷۔ دینار۔ دینار ایک طلائی سکہ تھا، جو ظہور اسلام کے وقت رومی سلطنت میں رائج تھا، ظہور اسلام سے پہلے عرب رومی مقبوضات یعنی شام اور فلسطین کے ساتھ تجارتی تعلقات رکھتے تھے، اس لیے دینار سے بخوبی واقف تھے، چنانچہ دینار کا ذکر قرآن مجید (سورۂ آل عمران) میں یوں آیا ہے:

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ	اہل کتاب میں سے بعض لوگ ایسے ہیں کہ
بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ	اگر تم ان کے پاس ایک قنطار امانت
مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ	رکھ دو تو وہ اسے واپس ادا کر دینگے
اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا	اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ اگر تم ان کے
	پاس ایک دینار بھی بطور امانت
	رکھو تو جب تک تم ان کے سر پر کھڑے
	نہ ہو تمہیں کبھی واپس نہ دیں گے۔

جیسا کہ علامہ زبیدی نے تاج العروس میں لکھا ہے کہ دینار کے بارے میں اختلاف ہے

علمائے لغت اس سے آگاہ تھے کہ دینار عجمی لفظ ہے، اور بعض نے اس کے ساتھ یہ ادعا بھی کیا ہے کہ فارسی زبان سے لیا گیا ہے، ابومنصور جوالیقی نے کتاب المعرب میں لکھا ہے کہ قیراط اور دیباج کی طرح دینار کی اصل عجمی ہے، لیکن عرب قدیم زمانے سے ان الفاظ کو بولتے آئے ہیں، اس لیے وہ عربی بن گئے ہیں"۔ راغب اصفہانی "مفردات القرآن" میں لکھتے ہیں کہ دینار اصل میں دنار تھا، اور اس بارے میں انھوں نے ایک اور قول بھی نقل کیا ہے کہ دینار فارسی "دین آر" کا معرب ہے، یعنی وہ چیز جسے شریعت لائی ہو، لیکن اس قول کا مہمل اور لایعنی ہونا عیاں ہے۔

اس مسئلہ کو سلجھانے کی شکل یہ ہے کہ اس معاملہ پر تاریخی لحاظ سے نگاہ ڈالیے، اور یہ دریافت کیا جائے کہ یہ سکہ سب سے پہلے کس ملک میں یا کس قوم کے ہاں جاری ہوا تھا، مغربی علماء کی تحقیق یہ ہے کہ دینار، لاطینی لفظ " Denarius " سے ماخوذ ہے، اور یہ لفظ رومیوں کے ہاں ایک طلائی سکے کے لیے مستعمل تھا، مورخین نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ سے دو سو برس پہلے دینار دارالسلطنت روما میں مضروب ہوا، اور بعد میں اس کا استعمال رومیوں کے ہاں بدستور جاری رہا، جب رومی سلطنت مشرق کی طرف پھیلی تو ان کی حکومت کے ساتھ ساتھ دینار کا رواج بھی مشرقی ملکوں میں پھیلتا گیا، چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں شام اور فلسطین میں (جو اس وقت رومیوں کے زیرنگیں تھے،) دینار کا عام رواج تھا، جو بعد کے زمانے میں بھی بدستور قائم رہا، ظہور اسلام سے پیشتر شام کے ساتھ عربوں کے تجارتی تعلقات قائم تھے، لہذا تجارت کے ذریعہ ان کا دینار سے آشنا ہونا طبعی اور یقینی امر ہے، اور قرآن پاک میں دینار کا لفظ جس بے تکلفی سے استعمال ہوا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ ظہور اسلام

کے وقت دینار عربوں کے ہاں ایک معروف چیز تھی،

جب عرب فاتحین نے رومیوں کو شام اور مصر سے نکال دیا، اُس وقت بھی ان ملکوں میں دینار کا رواج بدستور جاری رہا، مگر ایک اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ خلفائے اسلام نے آخر میں اپنے ہاں دارالضرب قائم کیے، اور خلیفہ عبدالملک اموی نے مروجہ سکوں پر عربی کلمات نقش کرائے۔ دینار کا استعمال رفتہ رفتہ تمام اسلامی سلطنت میں پھیل گیا، اور درہم و دینار کئی صدیوں تک اسلامی ملکوں میں ساتھ ساتھ رائج رہے۔

۸۔ زنجبیل۔ زنجبیل ادرک کا عربی نام ہے۔ ادرک جب خشک ہو جائے تو ہندی میں اُسے سونٹھ کہتے ہیں۔ ادرک ایک پودے کی خوشبودار گٹھلی جڑ ہے، جو مسالے کے طور پر کام آتی ہے، دواؤں میں بھی ڈالی جاتی ہے، اور اس کا مربا بھی بناتے ہیں، اگر ادرک کی گانٹھ کو غور سے دیکھا جائے تو اس پر سینگ کی طرح چھوٹے چھوٹے ابھار دکھائی دیتے ہیں، غالباً اسی وجہ سے ادرک کو سنسکرت میں شرنگ ویرا (Shrngvera) کہتے ہیں یعنی ایسا جسم جو سینگوں پر مشتمل ہے۔

زنجبیل کا لفظ قرآن مجید (کی سورۃ الانسان) میں جنت کی نعمتوں کے بیان میں ایک مرتبہ آیا ہے:

وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ	یعنی وہاں ان کو ایسا جام پلایا جائیگا
مِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا	جس میں زنجبیل کی آمیزش ہوگی۔

اکثر لغت نویس اس بات پر متفق ہیں کہ زنجبیل کا لفظ فارسی زبان سے آیا ہے، چنانچہ ثعالبی نے فقہ اللغہ میں اور جوالیقی نے کتاب المعرب میں اس کو اُن فارسی الفاظ میں شمار کیا ہے، جن کو معرب کر لیا گیا ہے، اور امام سیوطی اور قاضی خفاجی نے بھی اس

قول کو قبول کر لیا ہے، اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس کے ماخذ کے لیے پہلوی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، جو موجودہ فارسی کی قدیم صورت تھی، پہلوی میں ادرک کو سِنگبیر کہا گیا ہے، جس کا زنجبیل کی شکل میں تبدیل ہو جانا بعید از فہم نہیں۔

زنجبیل کا استعمال نہایت قدیم ہے، یونانی اور رومی اسے بحراحمر (یعنی بحر قلزم) کے راستے سے حاصل کرتے تھے، اور ان کا خیال تھا کہ زنجبیل جنوبی عرب کی پیداوار ہے، حالانکہ اس کا حقیقی وطن ہندوستان تھا، اور عرب اُسے فلفل (یعنی سیاہ مرچ) کے ساتھ ہندوستان کے مغربی ساحل یعنی مالابار سے برآمد کرتے تھے، چونکہ زنجبیل ہندوستان کی خاص پیداوار ہے، اس لیے عہد حاضر کے محققین کی یہ رائے ہے کہ اس لفظ کی اصل ہندوستان کی سرزمین میں تلاش کرنی چاہیے، ان کی رائے میں زنجبیل کے یونانی اور لاطینی نام یعنی Zingiber اور Zingiberi دونوں ہندوستان کی کلاسیکی زبان یعنی سنسکرت سے ماخوذ ہیں۔ زنجبیل کو سنسکرت میں شرنگ ویرا اور پالی زبان میں (جو لحاظ زمانہ اس سے متاخر ہے) سنگ ویرا کہتے ہیں۔ اس کا پہلوی نام یعنی سنگبیر اس کے پالی نام سے بہت مشابہت رکھتا ہے، اس لیے یہ بات قریب قیاس ہے کہ پہلوی نام پالی سے ماخوذ ہو

غیاث اللغات کے مؤلف نے رسالہ "معربات" اور "سروری" (عربی شرح گلستاں) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ زنجبیل زنگوبیرا کا معرب ہے، لیکن اس نے اس کی صراحت نہیں کی ہے کہ زنگوبیرا پالی زبان کا لفظ ہے۔

اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ہے، جس کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، عربوں کے تجارتی تعلقات براہ راست جنوبی ہند کے ساتھ قائم تھے، اس لیے اس کا بھی قوی

احتمال ہے کہ انھوں نے زنجبیل کا نام جنوبی ہند کی اہم زبان یعنی تامل سے لیا ہو۔ تامل میں اسے Inchevar کہتے ہیں۔

زنجبیل کو لاطینی میں Zingeber اور فرانسیسی میں Gingembra کہتے ہیں، انگریزی لفظ Ginger ان ہی سے ماخوذ ہے۔[له]

زنجبیل کے لیے مختلف زبانوں میں جو الفاظ پائے جاتے ہیں، ان کے اشتقاق اور باہمی تعلقات کی وضاحت کے لیے ذیل کا شجرہ ملاحظہ ہو:-

Sanskrit : Shrangvera
|
Pali Singivera
|
Pahlavi Singaber
|
Latin : Zingiber — Arabic : Zanjabil
|
Old French : Gengiber
|
English : Ginger
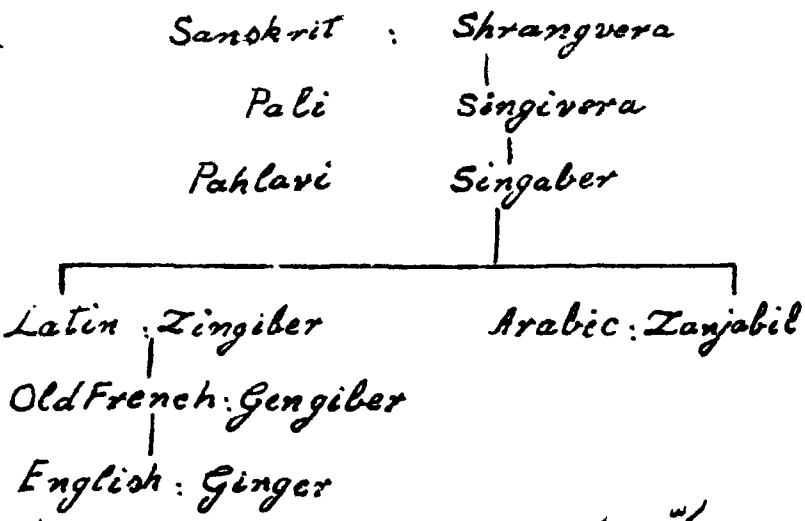
۹- سکّین: سکین کا لفظ قرآن پاک میں چھری کے معنے میں آیا ہے اور صرف ایک مرتبہ استعمال ہوا ہے، سورۂ یوسف میں ہے کہ

وَ اٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا — اس نے (یعنی یوسفؑ کی مالکہ نے) ان (مہمان) عورتوں میں سے ہر ایک کو ایک

له پروفیسر ڈی۔ Allan Ross آجکل برٹش یونیورسٹی میں شعبہ لسانیات کے صدر ہیں، انھوں نے Ginger کی لسانی تحقیق میں ایسا کمال پیدا کیا ہو اور اس میں اس استیعاب اور استقصا سے کام لیا ہے کہ انکے احباب نے انکو ازراہ ظرافت Ginger Ross کا nick-name دے رکھا ہے۔

امام راغب اصفہانی "مفردات" میں لکھتے ہیں کہ

"السکین سُمّی لازالتہ حرکۃ المذبوح۔	یعنی چھری کو سکین اسلیے کہا گیا ہو کہ وہ ذبیح کی حرکت کو زائل کر دیتی ہے"۔

میری رائے میں امام ممدوح نے سکین کی جو توجیہ فرمائی ہے، وہ ان کا ذاتی قیاس ہے جس کی تائید کسی دوسری روایت یا شہادت سے نہیں ہوتی۔

ابو منصور جوالیقی، امام سیوطی اور قاضی خفاجی نے بھی سکین کو معرّبات میں شمار نہیں کیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک بھی یہ لفظ خالص عربی ہے۔

لیکن مغربی علماء کا خیال ہے کہ سکین کا لفظ آرامی ہے، جو عربی میں باہر سے آکر دخیل ہوا ہے، اس کی تائید دیگر قرائن کے علاوہ اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ جن ایام میں ہادیٔ انام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) مدینہ منورہ میں تشریف فرما تھے۔ ایک دن آپ نے انصار سے فرمایا کہ اِئْتِنِی السِّکِّیْنَۃَ یعنی "مجھے سکین دو"۔ لیکن حاضرین میں سے کسی نے رسول مقبولؐ کی بات نہ سمجھی۔ آخر کار جب آپ نے اپنا مطلب سمجھایا تو انصار بولے کہ اچھا، آپ کو "مُدْیَہ" درکار ہے، اس روایت سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں سکین کا لفظ مدینہ میں معروف نہ تھا۔ بلکہ وہاں کے لوگ چھری کے لیے مُدْیَہ کا لفظ استعمال کرتے تھے، عہد نبوی میں فلسطین اور شام میں آرامی عوامی زبان کی حیثیت سے رائج تھی، اس لیے یہ بات عین ممکن ہے کہ قریش کے تجارتی روابط سے سکین کا لفظ مکہ میں بھی رائج ہو گیا ہو، اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ جس طرح یہ لفظ قرآن مجید میں صرف ایک مرتبہ آیا ہے، اسی طرح راوی حدیث کے قول کے مطابق یہ لفظ صرف اسی ایک حدیث میں پایا گیا ہے۔

۱۰۔ صراط۔ صراط کا لفظ قرآن مجید میں تقریباً ۴۵ مرتبہ آیا ہے، صراط کے لغوی معنے راستہ کے ہیں، لیکن قرآن پاک میں یہ لفظ ایک خاص مذہبی رنگ میں استعمال ہوا ہے، یعنی صراطِ مستقیم صحیح مذہبی روش کے لیے آیا ہے، جیسا کہ سورہ فاتحہ میں ہے:

اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین

اگرچہ جوالیقی اور خفاجی نے صراط کو معرب الفاظ میں شمار نہیں کیا ہے، لیکن امام سیوطی نے اتقان میں النقاش اور ابن الجوزی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ صراط رومی زبان میں راستہ کو کہتے ہیں، اور ان سے پہلے ابوحاتم احمد بن حمدان الرازی (متوفی ۳۲۲ھ) بھی اپنی کتاب الزینہ میں اس کو رومی الفاظ میں شمار کر چکا تھا۔[1] عہد حاضر کے مغربی محققین کی بھی یہی رائے ہے کہ صراط دراصل لاطینی (یعنی رومی) لفظ Strata سے ہے، جو پہلے شام میں مروج ہوا، اور پھر سریانی کے واسطے سے عربی میں داخل ہوا۔

صراط کا لفظ جاہلی شعرا کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لفظ خاصہ قدیم زمانے ہی سے عربی میں منتقل ہو چکا تھا، اور قرآن مجید میں جس کثرت اور بے تکلفی سے استعمال ہوا ہے، اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت صراط عربی کا ایک عام فہم لفظ بن چکا تھا۔

---

[1] کتاب الزینہ، تصحیح و تحشیہ ڈاکٹر حسین بن فیض اللہ ہمدانی، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۵۷ء جلد اول، ص ۱۴۰-۱۴۱

۱۱۔ فرعون ۔ فرعون مصر قدیم کے حکمرانوں کا لقب ہے ۔ جو بنی اسرائیل کے ذکر میں تورات اور قرآن دونوں کتابوں میں بکثرت آیا ہے ۔ اور قرآن پاک میں ۷۴ مرتبہ مذکور ہوا ہے ۔

امام طبری اور قاضی بیضاوی سورہ بقرہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ جس طرح ایرانیوں اور رومیوں کے حکمرانوں کا لقب کسریٰ اور قیصر تھا ، اسی طرح عمالقہ کے فرمانروا فرعون کے لقب سے پکارے جاتے تھے ، سیبویہ اور جوالیقی بھی فرعون کو عجمی کلمہ تسلیم کرتے ہیں ، اور خفاجی نے بھی اسے معرب بتایا ہے ، اسی طرح راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ فرعون عجمی نام ہے ، لیکن ان فضلاء میں سے کسی نے اس بات پر روشنی نہیں ڈالی کہ اس لفظ کے لغوی معنے کیا ہیں اور اس کی اصل صورت کیا تھی ۔

مغربی فضلاء کی تحقیق یہ ہے کہ قدیم مصری اپنے حکمرانوں کو "پرعو" (Per-O) کے لقب سے پکارتے تھے ، پرعو کے لفظی معنے "دو دان عالی" ہے ، لیکن رفتہ رفتہ اس لفظ نے ایک اصطلاحی صورت اختیار کرلی اور یہ لفظ مصری حکمرانوں کا مخصوص لقب بن گیا ، فرعون کا لفظ اسی مصری کلمہ "پرعو" کی عبرانی صورت ہے ، جو عبرانی کے توسط سے عربی میں بھی مروج ہوئی ، تاریخی قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ جب بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں مصر سے نکلے تو اس لفظ کو اپنے ساتھ لائے جو بعد میں فرعون کی صورت میں تورات میں مستعمل ہوا ، اور اس کے بعد عربی میں منتقل ہوا ۔

عربوں نے اپنے قواعد لسانی کے مطابق فرعون کی جمع فراعنہ بنالی ، اور اس سے کچھ مشتقات بھی بنائے ہیں ، مثلاً تَفَرْعُن بمعنے تکبر و تمرد ۔

انگریزی میں فرعون کو Pharaoh کہتے ہیں ۔

۲۳ ۔ فردوس ۔ فردوس کے لغوی معنی باغ ہیں لیکن اصطلاحی طور پر اس سے جنت یا بہشت بریں مراد لیتے ہیں ،

عربوں نے فردوس کی جمع فرادیس بنالی ہے ، اور اہلِ شام اپنے بستانوں اور انگور کے باغات کو فرادیس کہتے ہیں ،

فردوس کا لفظ قرآن مجید میں دو مرتبہ آیا ہے ، سورۃ الکہف میں ہے کہ

اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا	یعنی بیشک جو لوگ ایمان لائے اور
الصّٰلِحٰتِ کَانَتْ لَھُمْ جَنّٰتُ	انھوں نے نیک کام کیے ، انکی مہمانی کیلیے
الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا	فردوس کے باغات ہیں ۔

پھر سورۃ المومنون میں اس کا ذکر یوں آیا ہے ۔

اَلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ	یعنی جو لوگ فردوس کے وارث ہونگے
ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ	وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ۔

علمائے لغت میں جوہری ، مجد الدین فیروز آبادی اور ابن منظور وغیرہ تمام فضلاء اس بات پر متفق ہیں کہ فردوس کے لغوی معنے بستان یعنی باغ کے ہیں لیکن اس کے اصل ماخذ کے بارے میں ان میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے ، فیروز آبادی اور خفاجی کا قول ہے کہ فردوس عربی لفظ ہے ۔ اس کے برعکس اکثر علمائے لغت کی رائے ہے کہ عجمی ہے لیکن اس سوال کے جواب میں کہ یہ لفظ کس زبان سے آیا ہے ، مختلف اقوال ہیں ، عکرمہ نے اسے حبشی بتایا ہے ۔ اور مجاہد سے منقول ہے کہ فردوس رومی کلمہ ہے ، ان کے برعکس متعدد علماء مثلاً ثعالبی (فقہ اللغۃ) اور جوالیقی (کتاب المعرب) اس بات کے قائل ہیں کہ یہ لفظ یونانی ہے ، اور امام سیوطی نے اتقان اور مزہر میں اسی قول کو ترجیح دی ہے تعجب ہے

ان علماء میں سے کسی نے فردوس کے ایرانی الاصل ہونے کی طرف اشارہ نہیں کیا۔

اقوالِ بالا کے برخلاف عصرِ حاضر کے محققین کی رائے ہے کہ اگرچہ فردوس کا لفظ یونانی زبان میں پایا جاتا ہے لیکن اس کی اصل قدیم ایران سے ہے۔ زرتشتیوں کی قدیم ترین مذہبی کتاب اوستا میں یہ لفظ "پیری دائزہ" کی صورت میں پایا جاتا ہے، اور اس کے معنی حدیقہ کے ہیں، یونانی مورخ زینوفون (Xenophon) نے جس کا سنہ پیدائش ۴۳۰ قبل مسیح ہے، اور جس نے ایران کی جنگوں میں حصہ لیا تھا) اس لفظ کو شاہانِ ایران کے باغات کے لیے استعمال کرکے یونانی میں رائج کیا، اس کے بعد یہ لفظ تورات کے یونانی ترجمہ میں بھی مستعمل ہوا جو تیسری صدی قبل مسیح میں مصر کے یونانی فرمانروا بطلیموس (Ptolemy) کے ایما پر اسکندریہ میں تیار ہوا تھا، پھر اس لفظ نے یونانی کے توسط سے مشرق و مغرب کی بہت سی زبانوں میں رواج پایا، اور قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ عربی میں آرامی کے ذریعہ سے آیا ہے۔

یونانی میں اس لفظ کا املا Pradeisos کرتے ہیں اور لاطینی میں Paradisus۔ انگریزی لفظ Paradise اسی لاطینی کلمہ سے ماخوذ ہے یورپ کی مختلف زبانوں میں فردوس کے لیے جتنے الفاظ آئے ہیں وہ سب کے سب یونانی اور لاطینی کلمات پر مبنی ہیں، ان الفاظ کے باہمی تعلقات ذیل کے اندراج سے ظاہر ہوں گے۔

Avestic : Peri-daesa (= حدیقہ)

Greek : Paradeisos — Pahlavi

Latin : Paradisus — Aramaic

Arabic : فردوس

French : Paradis — Engl : Paradise — Germ[an] : Parad[ies]
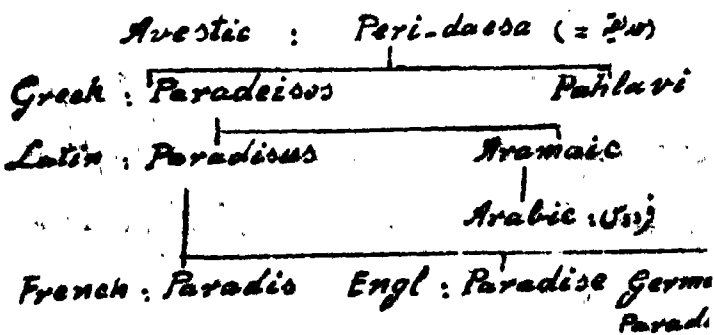
۱۳۔ قمیص ۔ بمعنے کرتا یا پیراہن، خصوصاً وہ زیر جامہ جو کتان یا سوت سے تیار کیا جائے۔

قمیص کا لفظ غلاف کے معنی میں بھی مستعمل ہے، مثلاً قمیص الکعبہ اور قمیص القلب۔

علمائے لغت نے قمیص کو عربی قرار دیا ہے، چنانچہ جوالیقی، سیوطی اور خفاجی میں سے کسی نے بھی اسے معرب الفاظ میں شمار نہیں کیا، گویا یہ لفظ ان کے نزدیک خالص عربی ہے۔

قمیص کا لفظ قرآن مجید میں چار مرتبہ آیا ہے، لیکن یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ صرف حضرت یوسفؑ کے قصہ کے سلسلہ میں مستعمل ہوا ہے۔

مغربی محققین کی رائے ہے کہ قمیص لاطینی کلمہ Camisia سے ماخوذ ہے، جس کے معنی سوتی کرتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب رومی تاجر پانچویں صدی میں شام میں آئے تو ان کے ذریعے یہ لفظ شام میں رائج ہوا، پھر عربوں کے استعمال میں آیا، فرانسیسی لفظ شمیز (Chemise) بھی اسی لاطینی کلمہ سے مشتق ہے، شمیز وہ ہلکا سا سوتی زیر جامہ ہے، جو خواتین اپنے لباس کے نیچے پہنتی ہیں۔ قمیص اور شمیز کی اصل ایک ہے لیکن وہ ہمارے ہاں دو مختلف راستوں سے آئے ہیں، اس لیے ان کے مفہوم میں بھی فرق پیدا ہو گیا ہے:

Late Latin : Camisia

French : Chemise — Arabic قمیص

Urdu : شمیز — Urdu قمیص

۱۴۔ قلم ۔ قلم لکھنے کا وہ آلہ ہے جسے نے یا نیزے کو تراش کر تحریر کے لیے کام میں لایا جاتا ہے، جمع اس کی اقلام آتی ہے، قلم سے چند اور الفاظ بھی مشتق ہوئے ہیں

مثلاً قُلامہ وہ تراشہ ہے جو قلم تراشتے وقت نکلتا ہے، اور مِقلمہ قلمدان کو کہتے ہیں۔

قلم کے اصلی لغوی معنی "نے" یا نیزہ ہے، جسے پنجابی میں کانا اور انگریزی میں Reed کہتے ہیں۔ قاموس میں ہے کہ القلم الیَرَاعَۃُ یعنی قلم کے معنی نیزہ ہے، دوسرے معنی بعد میں پیدا ہوئے۔

قلم کا لفظ بعض اوقات رسم الخط کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ابن الندیم بغدادی نے اپنی فہرست کے ابتدائی باب میں جہاں مختلف قوموں کے خطوط (Scripts) کا ذکر کیا ہے، وہاں قلم کا لفظ رسم الخط کے لیے استعمال کیا ہے۔ مثلاً حمیر کے خط کو "القلم الحمیریؔ" لکھا ہے، اور سریانی رسم الخط کو "القلم السریانی" کہا ہے۔

قلم کا لفظ عربی کے علاوہ دیگر سامی زبانوں مثلاً آرامی، سریانی اور حبشی میں بھی موجود ہے۔

فارسی، ترکی اور اردو زبانوں میں بھی اسی معنی میں مروج ہے اور غالبؔ عربی سے ماخوذ ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ قلم کا لفظ یونانی اور لاطینی زبانوں میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ یونانی میں اُسے Kalamos اور لاطینی میں Calamus کہتے ہیں۔ یونانی کلمہ کے آخر میں جو os ہے وہ اس کے مرفوع ہونے کی علامت ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہ لفظ لاطینی میں یونانی سے آیا ہے۔ کیونکہ رومیوں نے اپنے اکثر علوم یونانیوں سے حاصل کیے تھے۔ یونانی اُن سے بلحاظ زمانہ قدیم تھے۔ اور علمی لحاظ سے بھی اُن پر فوقیت رکھتے تھے۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ قلم کا لفظ سنسکرت میں بھی پایا جاتا ہے،

جس کا املا بصورت Calamus کر سکتے ہیں، اور سنسکرت میں اس لفظ کے معنی بھی وہی ہیں جو عربی اور دیگر زبانوں میں ہیں، یعنی

(۱) نے یا نیزہ (Reed)

(۲) لکھنے کا آلہ جو نے سے بنایا جاتا ہے۔

بیان بالا سے ظاہر ہے کہ قلم کا لفظ بہت سی سامی اور آریائی زبانوں کا مشترکہ کلمہ ہے۔ اتنی کثیر اور اہم علمی زبانوں میں اس لفظ کا وجود ایک قابلِ غور امر ہے، جو محض توارد اور توافق نہیں ہو سکتا۔ اسی کے ساتھ ہی یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ اس لفظ کا استعمال سب سے پہلے کس قوم یا ملک کی زبان میں شروع ہوا اور باقی قوموں یا زبانوں میں کب اور کیسے پھیلا۔ مغربی علماء کا قول ہے کہ اس کی اصل یونانی ہے، لیکن یہ قول مزید تحقیق اور تصدیق کا محتاج ہے۔

بہرحال قلم کے لیے یہ شرف کیا کم ہے کہ یہ لفظ سب سے پہلی وحی میں استعمال ہوا ہے، جو رسول اکرم (صلعم) پر غارِ حرا میں نازل ہوئی تھی۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ	(اے نبی) پڑھ ساتھ نام اس پروردگار
خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَأْ	کے جس نے (تمام کائنات) کو پیدا کیا اور
وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ	انسان کو خونِ بستہ سے بنایا، پڑھ اور
بِالْقَلَمِ۔ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ	جان لے کہ تیرا پروردگار بڑا بزرگ ہے،
يَعْلَمْ۔	جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا اور
	انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

اس کے علاوہ قرآن مجید کی ایک سورت کا نام ہی "سورۃ القلم" ہے، جس میں قلم کی

قسم کھائی گئی ہے،

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ	(ن) اور قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جو
مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ	وہ لکھتے ہیں، اپنے پروردگار کی مہربانی
	سے تو دیوانہ نہیں ہے۔

سورہ لقمان میں قلم کا لفظ بصورت جمع بھی آیا ہے۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ	اور اگر جس قدر زمین میں درخت ہیں،
شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ	قلمیں بن جائیں اور سمندر اس کی سیاہی
مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ	اور اس کے بعد سات سمندر اس میں تو
كَلِمٰتُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ	ملا دیئے جائیں، تب بھی خدا کی باتیں
حَكِيْمٌ	ختم نہ ہوں گی۔

قلم کی تعریف، توصیف میں ادیبوں اور شاعروں نے بہت کچھ کہا ہے۔ ناظرین
کی خدمت میں صرف چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں :۔

ذا الفخر الابطال یوماً بسیفهم	وعدّوه مما یکسب المجد والکرم
کفی قلم الکتّاب فخراً ورفعة	مدی الدهر ان الله اقسم بالقلم
ناظر الصنع انظر صنع کاتبہ	لقد ابان یواقیتاً من القلم
سناء کلاء لا تحصی محاسنها	نفسی فداها لحسن الخط والرقم

۱۵۔ کافور۔ کافور سفید رنگ کا ایک شفاف اور خوشبودار مادہ ہے، جو
تاثیر میں سرد اور مسکّن ہے۔ دوسرے خواص کے علاوہ کرم کش بھی ہے، اسلیے بطور
disinfectant بھی استعمال ہوتا ہے، اور دواؤں میں بھی ڈالا جاتا ہے،

کافور ایک درخت کی لکڑی سے حاصل ہوتا ہے، جو مشرقی ملکوں کی خاص پیداوار ہے، اور چین اور جاپان کے علاوہ جزائر فارموسا اور بورنیو میں بھی پایا جاتا ہے، عرب قرونِ وسطیٰ میں جن چیزوں کی تجارت کرتے تھے، اُن میں کافور بھی شامل تھا،

کافور کا ذکر قرآن مجید (سورۃ الانسان) میں جنت کی نعمتوں کے ضمن میں یوں آیا ہے :-

اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ	یعنی نیک لوگ بیشک ریسے جام میسے
كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا	پئیں گے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی،

اگرچہ لسان العرب میں کافور کو خالص عربی لفظ بتایا گیا ہے، لیکن ثعالبی، جوالیقی، سیوطی اور خفاجی سب نے لکھا ہے کہ کافور فارسی سے ماخوذ ہے، پہلوی میں اس لفظ کی صورت کاپور تھی، اس لیے یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ کافور پہلوی کاپور کا معرب ہو۔

دوسری مشرقی زبانوں میں کافور کے لیے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں، اس بحث میں ان کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے، مثلاً سنسکرت میں کرپور، ہندی میں کپور اور ملایا اور جاوا کی زبانوں میں کاپور ہے، اور چونکہ کافور مشرقِ بعید کی پیداوار ہے، اور عرب مصنفین کے بیان کے مطابق عرب تاجر کافور جاوا اور سماٹرا سے حاصل کرتے تھے، اس لیے اغلب یہ ہے کہ عربوں نے جہاں کافور ان ملکوں سے حاصل کیا، اس کا نام بھی انہی ملکوں کی زبان سے براہ راست اخذ کیا ہو،

پروفیسر جیفری لکھتے ہیں کہ عربوں نے کافور کا لفظ غالباً سریانی سے لیا ہے۔ (جو سوریہ یعنی شام والوں کی زبان تھی) کافور کا لفظ سریانی میں بھی موجود ہوگا۔ لیکن یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ عرب ایک ایسی چیز کا نام ایک شمالی

ملک کی زبان سے لیں، جو در اصل حضرمی لحیہ کی پیداوار ہے، اور جن کے ساتھ انکے براہ راست تجارتی تعلقات قائم تھے،

معلوم ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت ایران یا کم از کم دربار ایران میں کافور کی بہت کھپت تھی، عربی مورخوں نے لکھا ہے کہ جب عربوں نے ایران کے دارالسلطنت مدائن کو فتح کیا تو انھیں وہاں کے شاہی محل میں کافور کی بہت بڑی مقدار ملی، اور اسلامی لشکر کے بعض بدویوں نے اسے نمک سمجھ کر اپنی ہنڈیوں میں ڈال لیا۔

۱۶۔ مسک۔ مسک کا لفظ فارسی مُشک کا معرب ہے۔

مُشک ایک خوشبودار مادہ ہے، جو ایک خاص قسم کے ہرن کے نافہ سے حاصل ہوتا ہے یہ ہرن عرب میں نہیں پایا جاتا، اس لیے عرب لوگ مشک باہر کے ملکوں سے حاصل کرتے تھے،

مسک کا لفظ قدیم جاہلی شعراء کے کلام میں پایا گیا ہے، اور قرآن مجید میں بھی جنت کی نعمتوں کے بیان میں ایک مرتبہ آیا ہے، سورۃ التطفیف میں ہے:

يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ	ان کو شراب خالص سربمہر پلائی جائیگی
خِتَامُهٗ مِسْكٌ	جس کی مہر مُشک کی ہوگی۔

ثعالبی، جوالیقی، سیوطی، خفاجی اور ابن منظور (صاحب لسان العرب) سبھوں نے اس لفظ کو معرب بتایا ہے جس کی اصل فارسی ہے، پہلوی میں اسکی صورت مشک ہے، اور سنسکرت میں مُشکا، اور غالباً یہی مشکا پہلوی مشک کی اصل ہے، بہرحال عرب لغت نویسوں کے بیان کے مطابق یہ لفظ فارسی (یعنی پہلوی) سے آیا ہے۔ مُشک کا لفظ کم و بیش تبدیلی کے ساتھ یونانی، لاطینی اور یورپ کی دیگر

متعدد زبانوں میں موجود ہے، اور غالباً پہلوی سے ماخوذ ہے۔

مشک کو فرانسیسی میں musc کہتے ہیں، اور انگریزی میں musk اور ہرن کی جس قسم سے مشک حاصل ہوتا ہے اسے musk-deer کہتے ہیں۔

۱۷۔ آدم۔ عربی کلمہ ہے بمعنے ابو البشر۔ تورات اور قرآن پاک کی رو سے آدم پہلا بشر ہے جسے خداوند کریم نے پیدا کیا تھا،

آدم کا لفظ عربی کے علاوہ کنعانی (یعنی فنیقی) عبرانی اور سریانی زبانوں میں بھی موجود ہے،

آدم کا لفظ سب سے پہلے تورات کی سفر التکوین (یعنی کتاب پیدائش) میں استعمال ہوا، اور بعد ازاں قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں کم از کم پچیس ۲۵ مرتبہ آیا ہے،

ابو منصور جوالیقی نے اپنی کتاب المعرب میں آدم کے لفظ کو عربی بتایا ہے لیکن علامہ زمخشری (اور قاضی بیضاوی) نے اسے عجمی کلمہ قرار دیا ہے، امام راغب اصفہانی نے لفظ آدم کے اشتقاق کے بارے میں متعدد اقوال روایت کیے ہیں، اور ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ آدم اُدمۃ سے مشتق ہے جس کے معنی گندمی رنگت کے ہیں، اور اس قول کو قبول کر لیا جائے تو آدم کا وزن (اسود اور احمر کی طرح) اَفعَل قرار پائے گا۔

عربی میں آدم کا لفظ صرف اسم علم کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ لیکن عبرانی اور کنعانی زبانوں میں عام انسانوں کے لیے بھی آیا ہے۔

آدم کا لفظ مغربی قوموں نے بھی اسم علم کے طور پر اختیار کیا ہے، اور ان کے ہاں ذیل کی مختلف صورتوں میں پایا جاتا ہے:-

English, German, French & Danish	Adam
Italian	Adamo
Spanish	Adan
Portuguese	Adão

سیاست میں اسلام

(۴)

مترجمہ محمد نعیم ندوی صدیقی رفیق دار المصنفین

جنوب مشرقی ایشیا

جنوب مشرقی ایشیا میں اسلام کی شکل مشرق وسطی سے کافی حد تک مختلف ہے،

یہاں مسلمان ایک بہت وسیع و عریض خطے میں پھیلے ہوئے ہیں جس میں انڈونیشیا، ملائشیا، تھائی لینڈ، فلپائن اور اس کے گرد و نواح کے علاقے اور جمہوریہ سنگاپور شامل ہیں، اس خطہ کی مسلم آبادی کا اندازہ ۹ کروڑ سے زائد لگایا جاتا ہے[1]، یہ علاقہ درمیان میں سمندروں کے حائل ہونے کے باعث مسلمانوں کے خاص مرکزوں سے الگ تھلگ رہا ہے، دنیاے اسلام میں اس کا اضافہ تقریباً چودھویں صدی میں ہوا، جب مسلم تہذیب اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی، یہاں اسلام کی آمد بہت سست رفتاری کے ساتھ ہوئی لیکن اس کی اشاعت کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا، کچھ علاقے تو ایسے ہیں جہاں کے باشندے ابھی حال ہی میں مشرف باسلام ہوئے ہیں، اور اب

---

[1] مترجم۔ فاضل مقالہ نگار نے جنوب مشرقی ایشیا میں صرف پانچ ہی ملکوں کا ذکر کیا ہے حالانکہ ایشیا کا یہ خطہ اٹھارہ ممالک پر مشتمل ہے، اور اسکی مسلم آبادی مجموعی طور پر بیس کروڑ سے بھی زائد ہے، جن ملکوں کو مقالہ نگار نے نظر انداز کر دیا ہے ان میں ویٹ نام (مسلمان ۲۰ لاکھ) لاؤس (ایک لاکھ تیس ہزار) کمبوڈیا (چار لاکھ) برما (اٹھارہ لاکھ پچاس ہزار) شمالی بورنیو (۲ لاکھ ۷۰ ہزار) پرتگالی تیمار (ایک لاکھ پچاس ہزار) سراوک (۴ لاکھ ۳۰ ہزار) برونی (۳۰ ہزار) بھارت (۵ کروڑ) نیوگنی (۵ لاکھ) پرتگالی ہند (۲ لاکھ ۵۰ ہزار) سیلون (۱۰ لاکھ) اور پاکستان (۷ کروڑ) شامل ہیں، ان تمام ممالک کے مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی رجحانات کا جائزہ لیے بغیر جنوب مشرقی ایشیا کے مسلمانوں کی پوزیشن مکمل طور پر واضح نہیں ہوگی۔ 'ن'

آہستہ آہستہ انڈونیشیا کے سب سے بڑے جزیرہ بورنیو، مغربی آئرین اور کالیمنتان کے علاقوں میں بسنے والی غیر مسلم اقلیت بھی اسلام سے متاثر ہو رہی ہے،

اس خطہ کو دنیائے اسلام کا سرحدی علاقہ کہا جا سکتا ہے۔ دور دراز کے اسلامی ممالک خصوصاً مصر و پاکستان کے اسلامی خیالات نے یہاں کے لوگوں کے ذہنوں پر گہرا اثر ڈالا ہے، اس خطہ میں ایک طرف تو وہ طبقہ دکھائی دیتا ہے جو اسلام کی پیروی میں نہایت متشدد ہے دوسری طرف وہ طبقہ ہے جس نے بعض اسلامی تعلیمات کو ناقابل عمل تصور کر کے ان میں ترمیم کر لی ہے، اس کے علاوہ یہاں اسلامی اصولوں کے ساتھ مقامی رسم و رواج کی آمیزش بھی پائی جاتی ہے، یہ رسم و رواج مسلم تہذیب کے اثرات سے پہلے ہندو سوسائٹی یا بے دین فرقوں کی دین ہیں اس لیے اس خطہ کے مختلف علاقوں میں اسلام کی شکل مختلف ہے، لیکن تمام مسلم فرقوں کے درمیان سیاسی اور سماجی ہم آہنگی پورے طور پر پائی جاتی ہے، اس کا اہم سبب یہ ہے کہ یہاں ان کا واسطہ تقریباً ایک کروڑ چینیوں سے برابر پڑتا رہتا ہے، جو ایک طاقتور اقلیت کی شکل میں گذشتہ ایک صدی سے ہر حیثیت سے ترقی کر رہے ہیں، اور اس علاقہ کی معاشیات پر ان کا پورا قبضہ ہے، ان چینیوں کی وجہ سے اسلام کو اس خطہ میں ایک بڑے چیلنج کا سامنا ہے، یہاں کے مسلمانوں میں اس چیلنج کا احساس تو ضرور ہے لیکن اس خطرہ کی شدت کو انھوں نے پوری طرح محسوس نہیں کیا ہے،

جنوب مشرقی ایشیا میں مسلمانوں کا مقابلہ ایک ایسی قوم سے ہے جو تعلیمی، معاشی اور سیاسی ہر اعتبار سے ان سے برتر ہے، یہ لوگ اپنے سیکولر اور مادہ پرستانہ نظریات کے سبب سے دوسرے اہل مذاہب معاشی امور کے علاوہ کسی اور شعبۂ حیات میں کسی طرح کا واسطہ نہیں رکھتے۔ حالانکہ وہاں کنفیوشس کے نظریات پر فکر ہوتے اور قمری تیوہار منائے جاتے رہتے ہیں، چینی اپنے خاندان کی مادی ترقی کے علاوہ مذہب کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، ملایا اور انڈونیشیا کے مسلمان چینیوں کے ان خود غرضانہ اور مادہ پرستانہ خیالات سے بہت دور ہیں، لیکن ان کو بادل ناخواستہ ان بے دین چینیوں سے تعلقات قائم رکھنے

پڑتے ہیں، اسکی وجہ یہ ہے کہ اس خطہ کی تین اہم حکومتوں یعنی انڈونیشیا، متحدہ جمہوریہ ملیشیا اور سنگاپور کی معاشیات پر ان چینیوں کا زبردست قبضہ ہے، جو وہاں کی ایک بڑی اقلیت شمار ہوتی ہے جسکی تعداد اس خطہ میں ۳۵٪ ہے، بہت سے اہم تجارتی مرکزوں میں تو وہ اکثریت میں ہیں، کوالالمپور، جزائر مالوکا اور پنانگ میں خاص طور سے ان کی اکثریت ہے، خاص شہر سنگاپور میں وہ ۷۵ فیصدی ہیں، اور ایشیا میں صنعتی ترقی کے اعتبار سے جاپان کے بعد سنگاپور کا دوسرا نمبر ہے، اور ملائیشیا اور انڈونیشیا بھی اس کے تعاون اور صنعتی اشتراک کے ضرورت مند رہتے ہیں،

اس خطہ کے سرحدی علاقوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے، ملیشیا، انڈونیشیا اور سنگاپور کی حکومتیں سیاسی طور پر چینیوں کی تعداد اور طاقت سے کافی حد تک متاثر ہوتی رہی ہیں، ان چینیوں نے اندرون ملک ملایائی اور انڈونیشی عناصر سے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے، وہ طبعاً انقلابی اور تخریب پسند واقع ہوئے ہیں، اور ان کو سمندر پار سرخ چین کی مدد پر بھی بھروسہ ہے، ملایا اور انڈونیشیا کی ثقافت کو ان چینیوں سے جو خطرہ لاحق ہے اس کے تدارک کے لیے جو اقدامات کیے گئے ہیں وہ قطعی ناکافی ہیں، اس لیے ملیشیا کے اہم علاقوں میں چینی اکثریت نے شہریت اور حقوق رائے دہندگی کے قوانین کو کافی متاثر کیا، چینیوں کی اس اکثریت نے دینی امور سے متعلق مرکزی وزارت کے قیام کی راہ میں بھی رکاوٹیں پیدا کی ہیں،

۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۵ء کے درمیان ملیشیا اور سنگاپور کا جو فیڈریشن وجود میں آیا ہے، اس کا مقصد سیاسی، مذہبی اور قومی ہم آہنگی پیدا کرنا تھا، بعد میں شمالی بورنیو کے برطانوی علاقے سراوک اور صباح بھی اس فیڈریشن میں شامل کر لیے گئے، تاکہ چینی اکثریت والے علاقے سنگاپور میں ملایائی باشندے اقلیت میں نہ آجائیں، لیکن اگست ۱۹۶۵ء میں سنگاپور نے اس فیڈریشن سے اپنی علیحدگی اور بے تعلقی کا اعلان کر دیا جس سے ان دونوں ٹکڑوں میں ہم آہنگی قائم ہونا ناممکن ہو گیا۔

اس دوران میں انڈونیشیا جو ۱۹۴۹ء میں آزاد ہوا تھا مختلف قسم کے سیاسی اور معاشی مسائل سے دو چار رہا، اس کی مذہبی و ثقافتی حالت ملیشیا یا سنگاپور سے بہت مختلف تھی، ان دونوں ملکوں میں ملایائی ہونے کا مطلب مسلمان ہونا تھا، اور اس رشتہ سے ان کے لیے تمام قانونی پابندیوں کا احترام لازمی تھا، اس فیڈریشن کا سرکاری مذہب اسلام تھا، اور گو آئین کی بعض دفعات میں مذہبی آزادی کی صریح ضمانت دی گئی ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ شرط بھی لگا دی گئی ہے کہ "حکومت مسلمانوں کو کسی اور مذہب کی طرف راغب کرنے والی تحریکوں پر قانونی پابندی عائد کرسکتی ہے"، ملایائی مسلمانوں کی کمزور معاشی حالت کا اندازہ ان تحفظات سے ہوسکتا ہے جو ملازمتوں اور محفوظ زمینوں کے بارے میں ان کو "خاص حقوق" کے طور پر دیے گئے، اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ فیڈریشن سے علٰحدہ ہوجانے والے سنگاپور میں بھی پندرہ فیصد ملایائی اقلیتوں کے لیے "حقوق خاص" اب تک قائم ہیں، لیکن انڈونیشیا میں صورت حال اس سے مختلف ہے، وہاں تاریخی حالات کچھ ایسے رہے ہیں کہ انڈونیشی اور مسلمان دونوں مترادف سمجھے جاتے ہیں، مثلاً جاوا کے باشندے ہندو اور بودھ تہذیب اور اس کی روایات کے پیرو اور سری وجایا، سلینڈرا اور مجاپہت[۵] کے ماننے والے ہیں، جزیرہ بالی ہندو تہذیب کا ایک جدید نمونہ ہے، کچھ علاقوں میں تھوڑے سے عیسائی بھی ہیں، یہاں

---

[۵] مترجم۔ سری وجایا، سلینڈرا اور مجاپہت انڈونیشیا کی قدیم بودھ سلطنتوں کے نام ہیں، جن کا زمانہ اندازاً ساتویں اور آٹھویں صدی بتایا جاتا ہے، ۸۶۰ء میں سلینڈرا نے سری وجایا کی سلطنت کو فتح کرکے اپنی حکومت میں شامل کرلیا تھا، یہ وسطی جاوا میں پھیلی ہوئی تھی، اسی طرح مجاپہت بھی انڈونیشیا کی اہم ترین سلطنت تھی جس کا بانی راون وجایا بیان کیا جاتا ہے، اس سلطنت کا زمانہ ۱۲۹۳ء-۱۵۲۰ء ہے یہ انڈونیشیا میں ہندوؤں کی سب سے بڑی سلطنت تھی، اور اس کی شکست کے بعد ہندو دور حکومت ختم ہوگیا اور مسلمان سلطنتوں کے قیام سے انڈونیشیا کی تاریخ میں دور عظیم کا آغاز ہوا۔

چینی باشندے معاشی طور پر کتنے ہی مضبوط کیوں نہ ہوں، تعداد میں وہ مجموعی آبادی کا محض پانچ فیصدی حصہ ہیں، سب سے اہم بات یہ ہے کہ انڈونیشیا، جہاں بیسویں صدی کے آغاز یعنی ۱۹۱۲ء میں اسلامی اخوت اور بین الاسلامی اتحاد کے فروغ اور مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح و ترقی کے لیے ایک نئی جماعت "شرکت اسلام"[۱] کا قیام عمل میں آیا تھا، وہ سوکارنو اور سہارتو کے دور میں کافی حد تک سیکولر ہو گیا، آزادی کے بعد انڈونیشیا میں اسلامی اور بے دین طاقتوں کے درمیان برابر تصادم ہوتا رہا، دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ پر انڈونیشیا نے ایک فیصلہ کن قدم اٹھایا، اور نظام حکومت کے لیے "پنج شیلا" (اصول پنجگانہ) کو اپنایا جس میں صرف خدا پر ایمان کو اہمیت دی گئی ہے، کوئی ایسی بات جس کا اسلام سے تعلق ہو اس میں ت ر نہیں تھی،

آج ملیشیا میں ایک قومی زبان کی تحریک جس زور و شور کے ساتھ چل رہی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں دونوں قوموں کی شیرازہ بندی کی کوششوں اور اسلام کو ذہنی حفاظت کا قلعہ بنانے کے تجربے دونوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، لیکن انڈونیشیا میں مختلف النوع سوسائٹیوں کے باوجود ایک مشترک قومیت کا جذبہ مضبوط ہوتا جا رہا ہے، ملیشیائی

---

[۱] مترجم۔ جماعت "شرکت اسلام" کا قیام حاجی عمر سعید کے زیر صدارت ۱۹۱۲ء میں اس وقت عمل میں آیا تھا جب ولندیزیوں نے "شرکت تانگ اسلام" کو غیر قانونی جماعت قرار دیا تھا، شرکت اسلام کے بنیادی مقاصد یہ تھے: (۱) مسلمانوں کو صحیح اسلامی تعلیمات سے واقف کرانا (۲) غیر اسلامی طرز معاشرت اور فرسودہ رسم و رواج کو مٹانا (۳) اسلامی اخوت اور بین الاسلامی اتحاد کو فروغ دینا (۴) اہل ملک کی ذہنی اور تعلیمی ترقی کیلئے کام کرنا (۵) صنعت و تجارت کو فروغ دینا (۶) عوام کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کی تدبیریں اختیار کرنا۔

شرکت اسلام کے قیام سے انڈونیشیا میں قومی بیداری کے اہم ترین باب کا آغاز ہوا، اور اسی کی کوششوں سے ولندیزی سامراج کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں اور صرف ۳۵ سال کے مختصر عرصہ میں انڈونیشیا نے مکمل آزادی حاصل کر لی۔ ن

ارباب اقتدار کی بہ نسبت انڈونیشی حکمران دینی امور میں اعتدال پسند واقع ہوئے
ہیں، چنانچہ انڈونیشیا میں آزادی کے بعد سے مذہب سے زیادہ سیاست کو اہمیت
دی گئی ہے، مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہاں مذہبی احساس سرد یا ختم ہو چکا
ہے، ۱۹۵۰ء میں جماعت دار الاسلام[1] کی گوریلا سرگرمیاں، ماشومی[2] (مجلس شوریٰ
مسلمی انڈونیشیا) کی تحریک اور اکتوبر ۱۹۶۵ء کے خونی انقلاب کے بعد کمیونسٹوں
کے خلاف انڈونیشی مسلمانوں کے اقدامات وہاں کی اسلامی زندگی اور اس کی آب و تاب
کا بین ثبوت ہیں، بلاشبہ ماشومی ایک سیاسی تحریک ہے، جو دوسرے مسلم ممالک کی
طرح اسلام کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرتی رہی ہے، مگر اسلام کا یہ مصرف
ملیشیا کے مزاج کے بالکل خلاف ہے،

---

[1] مترجم۔ "دار الاسلام" انڈونیشیا کی اسلامی جماعتوں میں سب سے زیادہ کٹر، انتہا پسند اور جنگجو جماعت شمار ہوتی ہے، اس کا نصب العین اسلامی مملکت کا قیام ہے، ماشومی کے برخلاف یہ جماعت دہشت پسندی، جنگ اور خونریزی کی قائل تھی اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کیلیے اس قسم کے تمام وسائل سے کام لینا جائز تصور کرتی ہے، دار الاسلام کے رہنما کارتوسو ویریو (Kartosoewirjo) تھے لیکن بعد میں وہ اس سے بے تعلق ہو گئے۔ "ن"

[2] مترجم۔ ۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو ڈاکٹر محمد سوکیمان نے مجلس شوریٰ مسلمی انڈونیشیا Majlis Sjuro Muslimin Indonesia کے نام سے ایک نئی اسلامی تنظیم قائم کی جس کا مختصر نام ماشومی (Masjumi) ہے اور وہ اسی نام سے مشہور ہے، سوکیمان اور حامی اسلام دوسرے رہنماؤں نے اس تنظیم سے پورا فائدہ اٹھایا، اور مسلمانوں کو متحد کر کے آزادی اور اسلامی مملکت کی راہ ہموار کرنے لگے، اس تنظیم کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی تمام سیاسی جماعتیں اور غیر سیاسی مسلم ادارے اس تنظیم میں شامل ہو گئے، اور چند مہینوں کے اندر یہ انڈونیشیا کی سب سے بڑی اور پورے ملک کی نمائندہ جماعت بن گئی، اس تنظیم میں جن جماعتوں نے انضمام کر لیا تھا ان کے نام یہ ہیں، پارٹی اسلام انڈونیشیا، شرکت اسلام انڈونیشیا، پے تیند لہ پارلیسان شرکت اسلام کیو دا، جمعیۃ المحمدیہ اور نہضۃ "ن"

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جنوب مشرقی ایشیا کے مسلم معاشرہ کا ایک نمایاں جزو چینی باشندے ہیں، اور یہی چیز انڈونیشیا میں مسلمانوں کے فرقہ وارانہ تنازعات کا سبب بنی ہے، ان مسائل کو حل کرنے کے لیے جو بھی کوششیں کی گئیں ان کا نتیجہ دونوں ملکوں (انڈونیشیا اور ملیشیا) میں مختلف نکلا ہے۔ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۶ء تک ڈاکٹر سوکارنو نے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کئی ناکام کوششیں کیں، اور اسی کے سہارے انھوں نے ملک کے عوام کو ملکی مسائل کی سنگینی کا احساس نہ ہونے دیا، لیکن ان دونوں پڑوسی ملکوں کے درمیان جو نیم مسلح کشمکش چل رہی تھی، وہ اب کم ہوتی نظر آتی ہے۔

اب توقع ہے کہ کچھ عرصہ میں ایک متحدہ ملایائی، انڈونیشیائی ثقافت وجود میں آئے گی، اس سلسلہ میں امید کی ایک شعاع اس سے بھی پیدا ہوتی ہے کہ حال میں ان دونوں ملکوں اور فلپائن کو ملاکر "مفی انڈو" (ملیشیا، فلپائن اور انڈونیشیا کا فیڈریشن) قائم کرنے کی تجویز رکھی گئی ہے، اور وہ پرانا جذبہ جس کے ذریعہ ہند چینی کے درمیانی علاقوں کو ایک مشترک حکومت "نوسنترا" مانا جاتا تھا، پھر سے عود کر آیا ہے، اس کا ثبوت اس پرجوش استقبال سے ملتا ہے، جو ملیشیائی لیڈروں نے ان انڈونیشی فوجی افسروں کا کیا ہے، جو حال ہی میں سیاسی ناکہ بندی کا خاتمہ کرنے کی غرض سے کوالالمپور پہنچے تھے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس اتحاد کی بنیاد کیا ہوگی؟ اور ان ملکوں کے باہمی تعلقات کیسے ہوں گے؟ اس میں شبہہ نہیں کہ حالیہ چند برسوں میں انڈونیشیا کے جذبۂ دشمنی نے ملایا کو اچھی نظر سے دیکھنے کا جذبہ ختم کر دیا ہے، خاص طور سے انڈونیشیا نے سیکولر نظریات اور مشترکہ کلچر کے ذریعہ دنیا میں اپنا جو مقام بنا لیا تھا

اس کی بنا پر اس نے ملائشیا کی مسلم پرستی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا، ملائشیا کو انڈونیشیا کے وسیع ثقافتی اور لسانی خزانے سے بہت کچھ لینے کی ضرورت ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر دونوں ملکوں میں تمدنی اثرات کی مکمل طور پر لین دین ہو تو ان میں بہت خوشگوار تعلقات پیدا ہونے کی امید ہے، لیکن ایک ملک میں مذہبی جذبہ کی شدت اور دوسرے میں سیکولر نظریات کی تائید (گو زبانی ہی سہی) ایک ایسا ٹکراؤ ہے جو دونوں ملکوں کے تعلقات میں ہمیشہ حائل رہے گا۔

اکتوبر ۱۹۶۵ء کے خونی انقلاب کے بعد انڈونیشیا میں قومیت کا جذبہ انتہائی شدت سے ابھر آیا ہے، جس کا نشانہ عام طور پر چینی اقلیت اور خصوصاً سرخ چین بنا، اس جذبہ کے ملیشیا میں بھی پھیل جانے کا قوی امکان ہے، جہاں ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۰ء تک کمیونسٹ تنظیموں کی بغاوت میں مقامی چینیوں نے نمایاں حصہ لیا (سیاسی ناکہ بندی) سے پہلے ان دونوں ملکوں (انڈونیشیا اور ملیشیا) میں انتہاپسند مذہبی اور سیکولر تنظیموں میں مصالحت کی کوشش کی گئی تھیں، اور اب ان چینیوں کے خلاف ایک نئے قسم کی ناکہ بندی اور ایک نیا جہاد شروع کرنے کے لیے عوام کو اپنی طرف مائل کر لینا کچھ دشوار کام نہیں ہے، انڈونیشیا میں تو چینی اقلیت کے خلاف تشدد کے ایسے واقعات ہوئے کہ پیکنگ حکومت کو اس کے خلاف احتجاج کرنا پڑا، انڈونیشیا اور ملیشیا دونوں میں چینیوں کے خلاف جذبہ پیدا ہونے کے کئی اسباب ہیں، (۱) وہ غیر ملکی ہیں، (۲) وہ نہ تو ان ملکوں کی سوسائٹی میں جذب ہو سکتے ہیں اور نہ ہونا چاہتے ہیں، (۳) معاشی اعتبار سے نہایت خوشحال ہیں، (۴) خود انتہا پسند کمیونسٹ ہیں یا ان کے معاون ہیں، (۵) سب سے بڑھ کر یہ

پر ایمان نہیں رکھتے، اس لیے بہت بڑا سوال یہ ہے کہ کیا ارباب اقتدار اس سیاسی مسئلہ کا کوئی عام پسند حل نکال سکتے ہیں یا یہ فرقہ وارانہ کشمکش ہمیشہ جاری رہے گی؟ ممکن ہے کہ دونوں ملکوں میں دبا ہوا مذہبی جذبہ شدت اختیار کر جائے۔ یہاں یہ بات بھی لائق ذکر ہے کہ اگرچہ نیوگنی (بورنیو) کے ملیشائی علاقوں میں انڈونیشی سرگرمیاں ختم ہو چکی ہیں، مگر کئی ہزار کمیونسٹ گوریلے اور ان کے چینی ہمی خواہ اب بھی جنگلوں میں روپوش ہیں، اگرچہ دونوں بازوؤں سے علیحدہ ہو جانے کے باعث ان کی حالت نازک ہے۔ ملیشیائی حکومت نے ان سے کہا ہے کہ وہ ہتیار ڈال کر از سر نو زندگی کے میدان میں قدم رکھیں اور اگر وہ ملیشیا سے باہر جانے کے خواہشمند ہوں تو اس کا بھی معقول انتظام کر دیا جائے گا، لیکن اگر خود ٹنکو کو ملک بدر ہونا پڑا تو وہ کہاں جائیں گے؟ سنگاپور یا چین؟

اس نازک مسئلہ کا حل حکومت سنگاپور کے ہاتھ میں ہے، کیونکہ باہر سے آنے والوں کے لیے سنگاپور ہی ایک مرکزی پناہ گاہ ہے۔ آج سراوک اور صباح میں باغیوں کے لیے جو اشتہارات گرائے جا رہے ہیں ان کے پیش نظر وزیر اعظم لی کوان یو کا یہ بیان قطعی حیرت انگیز نہیں ہے کہ "سمندر پار چینیوں کی بہترین پناہ گاہ سنگاپور ہے"۔

مذکورۂ بالا حقائق کی روشنی میں اس کا قوی امکان ہے کہ سنگاپور کی وسیع النظر پالیسی اور مختلف اقوام پر مشتمل وہاں کی مشترکہ سوسائٹی ان دونوں پڑوسی ملکوں پر بھی اثر انداز ہو گی، اور ان میں جذبۂ رواداری پیدا کرے گی۔ سنگاپور کو چینی اقلیت کی پناہ گاہ سمجھنا بالکل ویسا ہی ہے جیسے دیسفورا کے یہودیوں کے لیے اسرائیل ہے۔ ان چینیوں کا مسئلہ شمالی افریقہ کے ان یورپین باشندوں سے بہت مشابہ ہے جن کو ضرورت کے وقت اپنے ملک بھاگ جانے کی سہولت نہ تھی، پھر بھی وہ بھاگتے نہیں، بلکہ ایک غیر ملک میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے

بچے رہتے ہیں، بلا شبہ چینیوں کا بھی اپنا ایک وطن ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی آبائی وطن واپس جانا پسند نہیں کرتا۔ اسرائیل کی تقلید میں ان چینیوں نے بھی اس علاقے میں اپنے لیے ایک علحدہ ٹکڑا منتخب کرلیا ہے، جو اقوام متحدہ (U.N.O) کا ممبر اور بین الاقوامی سرگرمیوں میں پوری طرح شریک ہے، حقیقت یہ ہے کہ ایک جزیرے کی حیثیت سے سنگاپور زیادہ دنوں تک اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا، کیونکہ اس کے قدرتی وسائل بہت محدود ہیں، اسے دشمن ملکوں کے سمندر اسکا احاطہ کیے ہوئے ہیں، لیکن اس موقع پر اسرائیل کی مثال ہمارے سامنے آتی ہے جس نے سخت ترین دشواریوں کے باوجود اپنی معاشی طاقت کو کتنا مضبوط بنا لیا ہے۔ سنگاپور بھی اسی کے نقش قدم پر چل سکتا ہے، اور چینی ننیانگ کی سرمایہ کاری اور ذہنی صلاحیتوں سے کافی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس امکان کو کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ سرخ چین ایمرجنسی کے وقت سنگاپور کو پوری پوری مدد دے سکتا ہے، چین ملیشیا کو نوآبادیاتی نظام کا طرفدار اور انڈونیشیا کو ترقی پسندی کا مخالف شمار کرتا ہے، اگر چینی حکمراں اپنی طاقت کے بل پر شرارت کرنا چاہیں، جیسا کہ انڈونیشیا میں ہو چکا ہے، تو اس کا انجام نہایت تباہ کن ہوگا، اگر ملیشیا اور انڈونیشیا کے متحدہ وفاق کو کبھی چین دشمنی کا سامنا کرنا پڑا تو اس کا بھیانک انجام یہ ہوگا کہ ان دونوں ملکوں کا عظیم مسلم معاشرہ ختم ہو کر رہ جائے۔ اس لیے جنوب مشرق ایشیا کے مسلمانوں کو اپنی بقا و تحفظ کے لیے اسلامی ڈھانچہ کو مضبوط تر بنالے اور مسلم فرقہ کو زیادہ طاقتور کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ (ڈاکٹر چارلس ایف گیلاغر، مراکش)

وفیات

ڈاکٹر سید محمود

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۲)

انگلستان کے قیام میں ڈاکٹر صاحب کے وطنی اور ملی دونوں جذبات بیدار ہوتے رہے، ۱۹۰۹ء میں
ایران کی تقسیم کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تھا، انگریزوں نے وہاں بلوچیک فوج اتار دی، مسٹر بلنٹ اور پروفیسر
براؤن دونوں نے اس جھگڑے سے پوری دلچسپی لی، ڈاکٹر صاحب دونوں کی صحبت میں برابر رہا کرتے تھے
اس لئے وہ انہی کے ذریعہ سے ایران کے مشہور رہنماؤں میں مرزا یحییٰ اور آقا نقی وغیرہ سے ملتے رہے، پھر ایرانیوں
کی حمایت میں ایک جلسہ کرایا، پروفیسر براؤن نے اس جلسہ میں منظور کرانے کے لئے ایک تجویز مرتب کی، جس کو
ڈاکٹر صاحب نے لیجا کر مسٹر بلنٹ کو دکھایا، انھوں نے دیکھ کر کہا یہ تجویز بے جان ہے، انگریزوں کی سخت مذمت
کر کے ان کو گالیاں دو، تب ہی ان پر اثر ہوتا ہے، پھر انھوں نے خود ہی ایک بہت ہی سخت تجویز مرتب کی، جلسہ میں جب
یہ تجویز ڈاکٹر صاحب نے پیش کی تو پاس نہ ہو سکی، لیکن ایک دوسری تجویز میں سلطان ٹرکی اور امیر افغانستان سے
ایران کے مسئلہ میں مداخلت کرنے کی استدعا کی گئی، اس تجویز سے بھی انگلستان کے سیاسی حلقہ میں ایک ہلچل مچ گئی،
۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا، تو ڈاکٹر صاحب کی اسلامی حمیت بھڑک اٹھی، اور انھوں نے ترکوں
کی ہمدردی میں ایک جلسہ کرایا، جس میں انکی دعوت پر مسٹر بلنٹ اور پروفیسر براؤن بھی شریک ہوئے، اس میں مسٹر بلنٹ نے انگریزوں
کے خلاف اپنی سخت تقریر میں کہا کہ یہ بڑے سازشی ہیں، اٹلی کے ساتھ سازش میں شریک ہیں، اگر یہ چاہیں تو طرابلس سے اٹلی کی
فوجیں واپس جا سکتی ہیں، جنگ بلقان کے موقع پر بھی ڈاکٹر صاحب کی اسلامی غیرت ابھری، اس سلسلہ میں مسٹر بلنٹ نے

اُن کو ایک طویل خط لکھا جس کو انھوں نے مولانا محمد علی کے مشہور انگریزی ہفتہ وار اخبار کامریڈ میں شائع کردیا۔ وہ اپنے استاد کا بہت احترام کرتے، مگر بلقان کی جنگ کے سلسلہ میں ان کی رائے سے اختلاف کیا۔ اسی طرح مسٹر بلنٹ کا خیال تھا کہ اگر خلافت ترکی کے بجائے عربوں کے کسی ملک میں منتقل ہوجاتی تو زیادہ مفید ہوتی۔ مگر ڈاکٹر صاحب اپنے استاد کے اس خیال کو سیاسی مصلحتوں پر مبنی سمجھتے۔

ڈاکٹر صاحب نے رسالہ دوام کے ایک انٹرویو میں بیان کیا کہ مسٹر بلنٹ ہندوستان کی سیاحت کے لئے بھی آئے تھے۔ وہ علی گڑھ پہونچے تو سرسید نے ان کی دعوت کی جس میں ایک انگریز کلکٹر اور ایک انگریز جج کو اپنے دونوں طرف بٹھایا۔ مسٹر بلنٹ کو یہ انگریز نوازی ناگوار گذری، اور اپنی ڈائری میں ان انگریزوں کا ذکر حامی کی حیثیت سے کرکے سرسید کے متعلق لکھا کہ یہ غیر مخلص شخص (Insincere fellow) ہے۔ ڈاکٹر صاحب سرسید کے متعلق یہ رائے پسند نہیں کرسکتے تھے اس لئے وہ خوش تھے کہ مسٹر بلنٹ نے آخر میں یہ رائے بدل دی تھی، اور وہ سرسید کو مخلص سمجھنے لگے تھے، اس رائے کی تبدیلی میں یقیناً ڈاکٹر صاحب کا بھی حصہ رہا ہوگا۔ مسٹر بلنٹ اور پروفیسر براؤن کے بہت سے خطوط ڈاکٹر صاحب کے پاس آخر وقت تک محفوظ رہے، انھوں نے ان کو اپنے اس مجموعہ میں شامل کیا ہے، جو انھوں نے "مشاہیر کے خطوط ان کے نام" کے عنوان سے مرتب کیا تھا۔ افسوس ہے کہ یہ اب تک شائع نہیں ہوسکا ہے۔ اس سے ان کی سیاسی سرگرمیوں اور دوسری قسم کی دلچسپیوں کی اور زیادہ تفصیلات معلوم ہوتیں۔

ڈاکٹر صاحب کے قیام انگلستان ہی کے زمانہ میں رائٹ آنریبل جسٹس امیر علی نے لندن میں مسلم لیگ قائم کی تو اُن کو اس کا جائنٹ سکریٹری بنایا۔ اس کے ایک جلسہ میں

سر علی امام نے مشترکہ انتخاب کی تحریک پیش کی تو انھوں نے اس کی تائید کی، اور اس کے لئے مختلف جلسے بھی کرائے، یہ بات جسٹس امیر علی اور سر آغا خاں کو پسند نہ آئی، ان سے ڈاکٹر صاحب کا اختلاف بڑھا تو وہ مسلم لیگ سے مستعفی ہو گئے۔ وہ اپنی نجی گفتگو میں کہتے کہ مجھ کو اس وقت جداگانہ اور مشترکہ انتخاب کی بحث بالکل فضول معلوم ہوتی، وہ ہر دوام پر انگریزوں کی غلامی کا طوق ہندوستانیوں کی گردن سے اتار کر پھینک دینا چاہتے تھے، اس لئے وہ کوئی ایسا جھگڑا پسند نہیں کرتے جس سے ہندوستان کی آزادی میں رکاوٹ پیدا ہونے کا اندیشہ ہو جاتا۔ وہ ہندوستان سے انگریزوں کو جلد سے جلد اسلئے بھی رخصت ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے کہ انکا خیال تھا کہ ہندوستان سے انگریزوں کے اقتدار ختم ہونے کے ساتھ ہی اسلامی ممالک میں بھی ان کا تسلط خود بخود ختم ہو جائے گا وہ اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں:-

"طالب علمی ہی کے زمانہ میں اسلامی جذبے کے ماتحت ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں شریک ہوا اور اپنے دوستوں تصدق احمد خاں شروانی اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے ساتھ اس میدان میں اترا، اس وقت تمام اسلامی ممالک انگریزوں کے مظالم سے تباہ ہو رہے تھے، میرا عقیدہ تھا کہ جب تک انگریز ہندوستان پر مسلط رہیں گے اسلامی ممالک ان کے مظالم سے نجات نہیں پا سکتے، یہی اسلامی جذبہ طالب علمی کے زمانے میں چھایا رہا، جو خلافت کی مذہبی تحریک کے زمانے میں انتہا کو پہونچ گیا جس سے مجھ کو ہر طرح کے مالی و جانی نقصانات اٹھانے پڑے"

وہ انگریزوں کی مخالفت ضرور کرتے رہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ دو انگریزوں کے حوالے اپنی گفتگو میں برابر دیتے۔ دونوں کے نام مجھ کو اس وقت یاد نہیں آرہے ہیں، مگر انھوں نے اُن کا ذکر اپنے اس مقدمہ میں کیا ہے جو انھوں نے مشاہیر کے خطوط کے اس مجموعہ کے لئے لکھا تھا جو ان کے نام سے ہیں، ایک انگریز نے جو برسوں ہندوستان میں رہ چکا تھا، ان سے

۱۹۱۰ء میں کہا کہ آپ ہندوستان کی آزادی چاہتے ہیں مگر یاد رکھئے کہ جب انگریز ہندوستان چھوڑیں گے، تو ہندوستان مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گا، ڈاکٹر صاحب اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس انگریز کی پیشین گوئی کا ذکر برابر کرتے۔ اور کہتے کہ سیلون، برما، پاکستان، اور اب مشرقی پاکستان بھی آخر واقعی علٰحدہ ہو کر رہے۔ اپنے ایک دوسرے انگریز کی یہ بات بھی دہراتے کہ اس نے اُن سے کہا کہ ہم لوگ جب ہندوستان چھوڑیں گے تو سارے ہندوستانی زبان کے مسئلہ پر کٹ مریں گے۔ ہندوستان میں جو لسانی جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، ان پر ڈاکٹر صاحب تاسف کا اظہار کرتے ہوئے اس انگریز کی انجام بینی کی داد دیتے۔

کیمبرج کی تعلیم کے زمانے ہی میں ڈاکٹر صاحب اور پنڈت جواہر لال نہرو سے تعلقات پیدا ہوئے۔ جو آخر وقت تک استوار رہے، پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے

"میرے کیمبرج کے ساتھیوں میں کئی آدمی تھے جنھوں نے آگے چل کر ہندوستان میں کانگریس کے کاموں میں نمایاں حصہ لیا۔ ج۔ م۔ سین۔ گپتا، میرے کیمبرج پہنچنے کے تھوڑے دن بعد وہاں سے رخصت ہو گئے۔ سیف الدین کچلو، سید محمود اور تصدق احمد شروانی کم و بیش میرے ہم عصر تھے۔ شاہ محمد سلیمان بھی جو اب الٰہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہیں، میرے زمانہ میں پڑھتے تھے۔ میرے اور ہم عصر سول سروس کے رکن یا وزیر بن کر پھلے پھولے۔"

انگلستان کے قیام ہی کے زمانے میں اُن کو ۱۹۰۹ء میں گاندھی جی سے ملنے کا اتفاق ہوا، وہ وہاں جنوبی افریقہ سے آئے ہوئے تھے، اُن کی ملاقات کچھ ایسی نیک اور مبارک ثابت ہوئی کہ آئندہ دونوں ایک دوسرے کے گرویدہ ہو گئے۔

وہ ۱۹۱۳ء میں ہندوستان واپس آئے، اس وقت پٹنہ میں سر علی امام کا طوطی بولتا تھا،

ان کا شمار ہندوستان کے ممتاز بیرسٹروں میں تھا وہ وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کی اکزیکیٹیو کونسل کے ممبر بھی رہ چکے تھے، سیاسی خیالات میں قوم پروارانہ رجحانات رکھتے تھے، ان ہی کی خواہش پر ڈاکٹر صاحب نے پٹنہ ہی میں بیرسٹری شروع کی، اور نمایاں کامیابی حاصل کرنے لگے، مگر ہندوستان کی آزادی کی جو شمع ان کے دل میں روشن ہوئی تھی، وہ جلتی رہی، اسی لیے سیاسیات میں بھی حصہ لیتے رہے، اس زمانہ میں مسٹر مظہر الحق بھی جو بعد میں اپنی داڑھی اور مذہب کی وجہ سے مولانا مظہر الحق کہلانے لگے تھے، ہندوستان کے چوٹی کے بیرسٹروں میں تھے، اُن کی نظر ڈاکٹر صاحب کی طرف اٹھی، اور اپنی صاحبزادی سے اُن کی شادی ۱۹۱۵ء میں کر دی، مسٹر مظہر الحق کانگرس کی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیتے تھے۔ ان کی صحبت میں بھی ڈاکٹر صاحب کی وطنیت کی کیمیا کو ضرور آنچ ملی۔ چنانچہ وہ ۱۹۱۶ء میں آل انڈیا کانگرس کے ممبر بنے، اور اس وقت سے زندگی کے آخری لمحہ تک مخلص کھدر پوش کانگرسی رہے،

اُن کو شعر و شاعری، اور تاریخ کا بڑا اچھا ذوق رہا، مگر ان پر سیاست کچھ ایسی حاوی رہی کہ وہ ادبی اور تاریخی کتابوں کا مطالعہ کرتے، تو ان میں بھی اپنے ملی اور وطنی جذبات کی تشنگی بجھانے کی کوشش کرتے، مثلاً اُن کو غالب کے کلام سے بڑی دلچسپی رہی، انھوں نے غالب پر ایک مقالہ ۱۹۱۹ء میں لکھا، اس میں انھوں نے غالب کی شیریں بیانی، فصاحت، بلاغت، بلندی خیال، ذکاوت، تعمق خیال، وسعت نظر، عالمگیر ہمدردی، غم خواری، انسان اور اس کے فضائل سے گہری واقفیت، مشکل گوئی کے ساتھ طرز ادا کی سادگی، تشبیہوں کی جدت، استعاروں کی تازگی، بلند پروازی کے ساتھ شوخی وغیرہ کی تعریف کرتے، اور ان کی مثالیں دیتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ان کا کلام ہر زمانہ میں انسان کے دلی جذبات و خیالات کی تفسیر کر کے لوگوں کو خوش کرتا رہے گا، ان کا کلام شیلی کی پرواز، کیٹس کی فصاحت، گوئٹے

یق النظری شلر کی بلند خیالی ملٹن کے تخیل، مومن کے درد، سودا کی ظرافت اور
کی سادگی کا مجموعہ ہے۔ یہ تعریف غالب اپنے کانوں سے سنتے تو اپنی نا قدری کی
یت نہ کرتے۔ مگر اسی کے ساتھ اس مقالہ میں ڈاکٹر صاحب یہ بھی لکھ گئے کہ غالب
کی غزلوں کے اشعار میں اُن کے زمانہ کے خونچکاں سیاسی واقعات کی عکاسی نظر آتی ہے مثلاً
۱۸۵۷ء سے پہلے ہندوستانیوں کی زندگی کا خاتمہ ایک قوم کی حیثیت سے ہو چکا تھا۔ سیّد
دانشمند کی طرح غالب نے بھی اپنے گہرے احساس سے اس کو محسوس کیا، اور پُر درد پیرایہ
میں اس کا اظہار یہ کہہ کر کیا:

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

اسی بات کو دوسرے انداز میں اس طرح کہتے ہیں:-

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے

۱۸۵۷ء میں دہلی تباہ ہوئی، بندگانِ خدا بے خانماں ہوئے، شرفاء کے مکان
ویران اور برباد کر دیئے گئے۔ پورا شہر صحرا ہو گیا تو غالب اس کی تصویر اس طرح پیش
کرتے ہیں:-

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے، اُن کو دیکھ کر غالب نے کہا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

پھر انگریزوں نے ہندوستان کی تہذیب کو جس طرح مٹایا اس کا اثر غالب کے
دل پر بھی ہوا، انھوں نے پوشیدہ طور پر اس کا دردناک مرثیہ لکھا، جو حقیقۃً دل کو ہلا دیتا

رالا ہے، اور یہ ہندوستان کی مٹی ہوئی عظمت کو یاد دلاکر خون کے آنسو رلواتا ہے، اس کی
مثال اس قطعہ کے اشعار میں پیش کی، جو حسب ذیل شعر سے شروع ہوتا ہے

ظلمت کدہ میں میرے شب غم کا جوش ہے — اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

ملک کی کھوئی ہوئی آزادی پر اُن کے آنسو کبھی نہیں تھمے، اس لئے فرماتے ہیں۔

دیکھیں ہم کو بھی زنگا رنگ بزم آرائیاں — لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں
ے شیر آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق — میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

اسی قسم کے اور بہت سے خیالات کا اظہار کر کے آخر میں لکھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو
ندو مسلمان کے اتحاد کی تلقین اس طرح کرتے ہیں :۔

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہ رو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ڈاکٹر صاحب کا یہ مضمون نظامی بدایونی کی شرح کلام غالب کے پانچویں اڈیشن میں
شامل ہے۔ اس پر آس مسعود، یگانہ چنگیزی، ڈاکٹر سید عبداللطیف، شیخ اکرام
روغیرہ نے بڑی سخت تنقیدیں کیں، اور پھر یہ بھی ثابت کیا گیا کہ ڈاکٹر صاحب نے جن
ر کو غدر کی تباہی وغیرہ سے منسوب کیا ہے وہ غدر سے بہت پہلے لکھے جا چکے تھے،
ر صاحب کو جب اشعار کے کہنے کا زمانہ معلوم ہوا تو پھر انھوں نے اپنے خیالات
رجوع کر لیا۔ مگر وہ غالب کی وطن پرستی کے آخر وقت تک معترف رہے، میں نے اپنی
لیف کتاب "غالب مدح و قدح کی روشنی میں" ڈاکٹر صاحب کے اس مضمون
تبصرہ کیا ہے اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ انھوں نے جو اشعار غالب کی
ستی کے ثبوت میں پیش کئے ہیں، وہ تو یقیناً وطنی جذبے میں نہیں لکھے گئے لیکن ان کے

مجموعۂ کلام میں بنارس، پٹنہ، کلکتہ کی جو مداحی ہے یا اُن کے خطوط میں دہلی سے جو محبت اور لگاؤ کا اظہار ہے، یا اُن کے مکتوبات اور دستنبو میں دہلی کی تباہی اور بربادی کی جو خونچکاں تفصیلات ہیں، یا پھر اُن کو اپنے ہندو شاگردوں اور دوستوں سے جو شیفتگی رہی، اور موقع بموقع اپنی رواداری اور بے تعصبی کا ثبوت دیتے رہے، اس سے اس زمانہ کے معیار کے مطابق اُن کی وطنیت، جذباتی ہم آہنگی اور باہمی اتحاد کا اظہار ضرور ہوتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے میری کتاب کا یہ حصہ اصرار کرکے مجھ سے سُنا اور سُن کر فرمایا کہ جس طرف میری نظر پہنچی نہیں گئی تھی، تم نے منتقل کرا دی، میرے مضمون میں میرے دلائل صحیح نہ ہوں لیکن میں مطمئن ہوں کہ میں جس نتیجہ پر پہنچا تھا، وہ صحیح تھا، خوش ہوں کہ میرے مضمون ہی کی بدولت غالب کے پرستار غالب کے کلام اور تصانیف کو میری نگاہ سے بھی مطالعہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

ان کا ادبی اور علمی ذوق اُن کے سیاسی ذوق کی وجہ سے دبتا چلا گیا، ۲۱-۱۹۲۰ء میں خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں دونوں ساتھ چلیں تو انھوں نے ۱۹۲۱ء میں اپنی پریکٹس چھوڑ دی، اسی سال مرکزی خلافت کمیٹی کے جنرل سکریٹری بنائے گئے، مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کے ساتھ بمبئی میں رہنے لگے، مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کی وفات پر پُر اثر مضمون لکھا ہے، اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"آل انڈیا خلافت کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے کام بڑے جوش و خروش، اخلاص و کمال دیانت کے ساتھ کیا، جب ۱۹۲۱ء میں علی برادران قید ہوگئے تو اُن کی والدہ بی اماں مرحومہ کے دوروں کا انتظام کرایا، ان ہی دنوں انھوں نے ایک انگریزی کتاب خلافت اینڈ انگلینڈ لکھی، اور بھی بہت کچھ لکھا لکھایا، اسٹیشن اس وقت طاقتور اخبار تھا، وہ خلافت

کی دیانت و امانت پر زور و شور سے حملہ آور ہوا، دفاع میں سید محمود بھی میدان میں اترے اور دلائل و اعداد کی توپوں سے اس مورچہ کو سر کر لیا،

خلافت کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے ان کی سرگرمیوں کا کچھ اندازہ مولانا ابوالکلام آزاد کے حسب ذیل خط سے بھی ہوگا،

۴۶ - رپن لین کلکتہ

جی فی اللہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ، تار اور پھر خط پہنچا، آپ کا خط رمضان سے چند یوم پیشتر آیا تھا اور میں نے بروقت جواب دیدیا تھا، منتظر تھا کہ اس کا جواب آپ کی جانب سے موصول ہو تو بعض امور موعودہ کی نسبت لکھوں، بہرحال اب آپ کا منتظر ہوں اور احتیاطاً خط کا جواب بھی روانہ کر رہا ہوں، بہار کیلئے میری جانب سے کبھی کوتاہی نہ ہوگی، بشرطیکہ کم سے کم آپ پوری طرح مستعد رہیں، گاندھی جی سے بعض ضروری امور طے کرنے ہیں، اس لئے غالباً میں عید کی شام ہی کو بمبئی کے لئے روانہ ہو جاؤں اور پھر واپسی میں ناگپور ٹھہروں، آپ بہار کے لئے ایک منظم اور طے شدہ پروگرام طیار کر رکھیں، اور میرے لئے ایک ایک دن صرف ان جگہوں میں ٹھہرائیں، جہاں واقعی اور ناگزیر ضرورت ہو کیونکہ علاوہ بمبئی اور امرکزی خلافت کی ضروریات اور باہر کے ناجزکن تقاضوں کے خود بنگال کا تمام کام ویسا ہی دھرا ہے، اور شوال میں اس کیلئے کافی وقت نکالنا نہایت ضروری ہے، ۱۴ رجون سے ۲۵ تک بنگال کے لئے تاریخ دے چکا تھا، اور بعض مقامات کو مطلع بھی کر چکا تھا، لیکن آپ کے خط کی وجہ سے بہار کو ترجیح دی، اور بنگال کی تاریخیں پیچھے ڈال دیں، بس اس کا لحاظ رہے کہ کم سے کم وقت وہاں صرف ہو، اور صرف ناگزیر اور واقعی ضروری مقامات سردست منتخب کرنے جائیں، پھر جولائی میں انشاء اللہ بقیہ مقامات کا بھی دورہ ہو رہے گا،

امید ہے کہ آپ کی آمادگیاں جس کا میرٹھ میں تذکرہ ہوا تھا، قائم ہوں گی، بلکہ مزید محکم و استوار۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ کچھ دنوں معیت رہے، اور آپ کی خواہش کے مطابق سفر و حضر میں یکجائی ہو، علی الخصوص سفر میں، خدا نے چاہا تو موجب فتائجِ خیرات ہوگا۔

امید ہے کہ مسٹر مظہر الحق (جن کو اب بغا عدۂ عام مولانا مظہر الحق کہنا چاہئے اگرچہ وہ اس سے خوش نہ ہوں گے) بدستور مشغول و منہمک ہوں گے اب ان سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ اُن کے ایثار و اخلاص کو مزید قبولیت و ثمرات عطا فرمائے،

(فقیر ابو الکلام احمد کان اللہ لہ)

سنہ ۱۹۲۲ء میں جب خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں بڑے شد و مد کیساتھ بڑھیں تو ہزاروں محبانِ وطن کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کو بکسر شاہ آباد (بہار) کے برطانوی جیل خانہ کی تنگ و تاریک کوٹھری میں بند ہونا پڑا، اس وقت ہند و مسلمان کے اتحاد کا بڑا ہی شاندار منظر دیکھنے میں آتا تھا، گاندھی جی، موتی لال نہرو، سی۔آر۔داس، جواہر لال نہرو، مولانا شوکت علی، محمد علی، ابو الکلام آزاد، حکیم اجمل خان وغیرہ شمعِ اتحاد کے پروانے بنے ہوئے تھے ہر شخص اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ہند و مسلمان کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا، ڈاکٹر صاحب کا بھی یہ جذبہ اپنی انتہا تک پہونچ گیا تھا، بکسر جیل ہی میں انھوں نے ایک تحریر لکھنی شروع کی، جو پہلے تو روزنامہ خلافت بمبئی میں کئی مہینوں تک باقاعدہ شائع ہوتی رہی۔ پھر نظامی پریس ایجنسی بدایوں سے سنہ ۱۹۵۰ء میں کتابی شکل میں آج سے قبل کا ہندوستان" کے نام سے شائع ہوئی،

اس کتاب میں جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے علی گڈھ کے ہند و مسلمان طلبہ کی مجلسی گفتگو کے ذریعہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں ذہنی موافقت اور باہمی یگانگت پیدا کرنے کی خاطر ان

کی گذشتہ تاریخ کی کچھ تفصیلات بیان کی گئی ہیں، یہ بظاہر کوئی تحقیقی کتاب نہیں لیکن اس میں جو معلومات فراہم کی گئے ہیں وہ تاریخ ہند کے محققوں کیلئے سبق آموز اور مشعل راہ بھی ہیں۔ سارے تاریخی واقعات عبد الرحمٰن (بجنوری) کے ذریعہ بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ عبد الرحمٰن دراصل خود ڈاکٹر صاحب ہیں، جو کچھ کہنا چاہتے تھے۔ عبد الرحمٰن کی زبانی کہہ گئے ہیں، اپنا نام کہیں آنے نہیں دیا ہے۔ جو اُن کی کسر نفسی کی دلیل ہے، اُن کا آخر آخر وقت تک خیال رہا کہ ہندو مسلمانوں میں اختلاف، پھوٹ، اور کدورت کی ایک بڑی وجہ یہ رہی کہ وہ اپنے تعلیمی اداروں میں ہندوستان کی تاریخ کیا پڑھتے ہیں۔ بلکہ اس کے ذریعہ بس ملے دودھ پیتے رہتے ہیں، ان ہی کو پی کر جوان ہوتے ہیں، اپنی اس کتاب میں اسی بس کو دور کرنے کی کوشش کی،

انھوں نے مسلمانوں کو یہ سمجھایا کہ اگر وہ ہندوؤں کے مذہب، ان کے مقدس رشیوں اور بزرگوں کے طریق علم و عمل کا مطالعہ کریں، تو اُن کو معلوم ہوگا کہ ہندوؤں کے یہاں بھی خدا پرستی کی پوری شان اور توحید کی سچی تصویر نظر آئے گی، ہندو بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ خدا ایک ہے، اس کی ابتدا اور انتہا نہیں، ہر جگہ موجود ہے، پاک ہے، اپنی مرضی سے جو چاہتا ہے کرتا ہے، قادر مطلق ہے، دانائے کل ہے، زندگی بخشتا ہے، حکومت کرتا ہے، سب کی حفاظت کرتا ہے، اپنی بادشاہی میں نرالا ہے، وغیرہ وغیرہ، وہ اس کے ضرور قائل ہیں، کہ خدا انسان کی صورت میں جنم لیتا ہے، اسی کو اوتار کہتے ہیں، مگر وہ اوتار کو خدا نہیں تسلیم کرتے، وہ بت کو ضرور سامنے رکھتے ہیں، لیکن وہ دراصل اس کی پرستش نہیں کرتے۔ بلکہ اس کو اپنی دلجمعی کا وسیلہ سمجھتے ہیں، تاکہ ان کا دل دوسری طرف منتشر نہ ہو، وہ اپنی مدد خدا ہی سے ڈھونڈھتے ہیں، اور اسی کی پاکی کو سب سے برتر سمجھتے ہیں، اُن کی

مقدس کتاب رگ وید کا بڑا حصہ عبادت اور خدا کی تعریف سے بھرا ہوا ہے۔ اُن کی اور مذہبی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دلوں میں خدا کا خوف اور نیکی کرنے کا ذوق رہا۔ ان میں بھی سخاوت، مروّت، شجاعت اور شرافت، نیکی، نیک خیالی، ہمدردی، رواداری، سیرچشمی، وضعداری، اور سعادت مندی کی تعلیمات ہیں، اُن کی تہذیب، تمدن، علم شاعری، فلسفہ، اخلاقیات، ریاضیات، نجوم، منطق، موسیقی، فن تعمیرات، زراعت، پارچہ بافی، رنگ سازی وغیرہ کی بھی ترقی ہوتی رہی، ڈاکٹر صاحب نے مسلمانوں کو ان ساری باتوں کے رواداران طور پر مطالعہ کرنے کی تلقین کی،

پھر انھوں نے ہندوؤں کو یہ سمجھایا کہ وہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کو اتنا برا نہ تصور کریں جیسا کہ وہ کرتے ہیں، پھر ہر مسلمان حکمراں کی کچھ نہ کچھ خوبیاں بتائیں، مثلاً انھوں نے بتایا کہ محمد بن قاسم اتنا روادار تھا کہ جب وہ سوا تین برس حکومت کر کے خلیفہ کے حکم سے واپس بلایا گیا تو تمام ہندو اس کے لئے زار زار روتے تھے کیمیرج میں اس کا بُت بنا کر ایک عرصہ تک پوجتے رہے، محمود غزنوی نے اپنی ساری عمر میں کسی ایک ہندو کو بھی زبردستی مسلمان نہیں بنایا، راجہ تلک اس کا میر منشی اور پھر سپہ سالار مقرر ہوا، اس کو دربار کے تمام امراء پر فوقیت حاصل تھی، ایک دوسرا ہندو شیوندرائے نامی بھی اس کی فوج کا سپہ سالار تھا، ناتھ نامی ایک اور ہندو محمود کی فوج میں ایک بڑے عہدے پر مامور تھا، ایک اور فوجی کمانڈر بیجے رائے نامی تو محمود کا خاص دوست سمجھا جاتا تھا، اس کا دربار شاہی میں بڑا رتبہ تھا، محمود گجرات، پنجاب، قنوج میں پھرتا رہا لیکن وہاں کے مندر نہیں ڈھائے، عربوں کے زمانہ میں ملتان کے ایک مندر کو گرا کر اس جگہ مسجد بنائی گئی تھی، اُس نے ملتان فتح کیا تو اس مسجد کو نماز کے لئے بند کر دیا کہ وہ غصب سے حاصل ہوئی تھی، اس نے سومنات کا مندر ضرور گرایا، لیکن

اس نے متھرا کے مندروں کو صرف اس لئے چھوڑ دیا کہ وہ نہایت خوبصورت بنے ہوئے تھے
شہاب الدین غوری بڑا خدا ترس حکمران تھا، اس کو اپنی رعایا کی بہبودی کا بہت خیال
رہا، التمش کی عدل پروری کی شہرت دور دور تک تھی، رضیہ میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو
کسی اچھے سے اچھے حکمراں میں ہو سکتی ہیں، نصیر الدین محمود دنیا کی تاریخ میں بڑا عادل،
نیک نفس اور خدا ترس بادشاہ سمجھے جانے کا مستحق ہے، بلبن کی حکومت انصاف و عدل
کے لئے ہمیشہ ہندوستان میں یاد کی جائے گی، جلال الدین خلجی کی نیک طینی، رحم دلی، اور
دشمنوں کے ساتھ شریفانہ سلوک کے سب ہی مداح تھے، علاء الدین خلجی کے زمانے میں
غلہ کی ایسی ارزانی تھی کہ پھر کبھی ہندوستان کو ایسی نصیب نہ ہوئی، اس کے عہد میں ایک
شخص بنگال سے کابل اور مالابار سے کشمیر تک بلا خوف و خطر قیمتی سامان کے
ساتھ سفر کرتا تھا، اُس نے ملک کے دفاع کا ایسا اچھا انتظام کیا کہ مغل برابر پسپا ہو کر
واپس جاتے رہے، محمد تغلق نے تمام ملک میں شفاخانے بنوائے، صرف دہلی میں ستر شفاخانے
تھے، بارہ سو اطبا ملازم تھے، غربار و مساکین کے لئے خیرات خانے تھے، جن میں غریب
ہندو مسلمان کو خیرات ملتی تھی، ملک میں تعلیم کا خاص انتظام تھا، صرف صوبہ دہلی میں
ایک ہزار کالج تھے، فیروز شاہ تغلق نے بڑے بڑے شہر آباد کئے، نہریں جاری کیں، بے شمار
میووں کے باغات لگائے گئے، صرف شہر دہلی میں بارہ سو باغات تھے، رعایا خوشحال رہی
ان کے پاس دولت، مال، زیور، سونا اور چاندی کی کثرت رہی، خضر خاں اپنے امرا اور
رعایا میں ہر دلعزیز رہا، سیدوں کے زمانہ میں ہندوؤں کو سلطنت کے امور میں بڑا دخل
تھا، ہرسنگھ، ادھرن، سدپال وسدھارن کے بڑے معزز امراء تھے، راؤ، امرو، سہ، بایتہ، طوتول اور
کھر لم کے گروہ بہت مقتدر ہو گئے، سکندر لودی جفاکش، رحم دل، منکسر، نیک طینت، اور

نیک طبع بادشاہ تھا، مغلوں کی حکومت کی تعریف تو غیر بھی کرتے ہیں، ان کے دور حکومت میں ہندوستان عروس البلاد بن گیا تھا، اس دور میں شیر شاہ کے ساتھ بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے کارناموں سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، اورنگ زیب ہندوؤں میں ضرور بدنام ہے لیکن اگر وہ چند الزامات سے اپنے کو بری رکھتا، اور اس کی طبیعت دو ایک برائیوں سے صاف ہوتی، تو شاید وہ دنیا کے چند مشہور بادشاہوں کے ساتھ شمار کیا جاتا، شجاعت، ہمت، اولوالعزمی، استقلال، محنت، تہذیب، علم، بردباری، عقل و فراست میں اورنگزیب اپنا نظیر نہیں رکھتا تھا، اس پر مندروں کے منہدم کرنے کا الزام رکھا جاتا ہے اگر اورنگزیب ایک موقع پر بنارس کے گورنر کو لکھتا ہے کہ میں نے سنا ہے کہ بعض لوگ بنارس کے برہمنوں اور ہندوؤں کو اُن زمینوں پر جو ہندوؤں کی ہیں، اور قدیم زمانے سے اونہی کے قبضہ میں ہیں، بُت خانے بنانے سے روکتے ہیں، اس وجہ سے وہاں کے ہندو پریشان اور متردد ہیں، تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ اُن کو بُت خانہ اپنی زمین پر بنانے سے کوئی شخص نہ روکنے پائے، اور نہ ان کی عبادت میں کوئی مزاحم ہو، تاکید جانو"

پھر اسی اورنگ زیب نے ہندو مندروں کے لئے جاگیریں دیں، پجاریوں کے لئے وظیفے مقرر کئے، بہت سے مندروں کے پجاریوں کے پاس امداد کے سلسلہ میں اس کے شاہی فرامین موجود ہیں، مغلوں کے آخر زمانے میں ہندو امرا، دربار پر چھائے رہے، رتن چند اور راجہ اجیت سنگھ تو سید عبداللہ اور سید حسین کے ساتھ سلطنت کے کاموں میں برابر کے شریک دار تھے۔ رتن چند کے اختیارات تو اتنے وسیع تھے کہ ساری سلطنت میں قاضیوں کی موقوفی او بحالی اسی کے ہاتھ میں تھی، محمد شاہ کے عہد میں چھبیلا رام صوبہ آباد

کا گورنر رائے بسنت رام آگرہ کا گورنر اور راجہ خوشحال رائے اس کا سکریٹری تھا، اودھ میں نواب شجاع الدولہ کی سلطنت کا دراصل مالک راجہ بینی بہادر تھا، نواب صفدر جنگ کے وقت میں فوج کا کمانڈر انچیف مہاراجہ نول رائے تھا، آصف الدولہ کے زمانہ میں راجہ سورت سنگھ بریلی کا گورنر تھا، اور خوشحال رائے بخشی الممالک، پھر بعد میں وہ الہ آباد کا گورنر ہوا. بنگال میں راجہ موہن لال سراج الدولہ کا دیوان اور اس کی سلطنت کا مختار کل تھا، اسی کے زمانہ میں راجہ رام نرائن بہار کا گورنر رہا، الخ الخ۔

ڈاکٹر صاحب کی کتاب سے مثالیں گو بہت زیادہ پیش کر دی گئی ہیں لیکن ان کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے وطنی جذبے کی بنا پر اگر ہندوؤں کے مذہب اور تاریخ کو برا کہنے کے روادار نہ تھے، تو پھر اپنے ملی جذبات کی بنا پر نہ صرف اسلام، بلکہ مسلمان حکمرانوں کے بارہ میں بھی اُن کی بُرائیاں سننا پسند نہ کرتے تھے۔ بلکہ ان کو اچھا سمجھنے کی تلقین کرتے۔ ان ہی وطنی اور ملی جذبات کی ملی جلی شکل کا نام ڈاکٹر سید محمود تھا، اگر ان پر کبھی ضرورت سے زیادہ وطنی جذبہ غالب ہو جاتا، تو کبھی ملی جذبات سے بھی وہ مغلوب ہو جاتے، ان کے ان دونوں مشترک جذبات کی قدر کرنے والے زیادہ نہ تھے، مگر جنھوں نے قدر کی، اُن کی نظروں میں وہ باوقار رہے،

وہ ۱۹۲۳ء میں پنڈت موتی لال نہرو کے ساتھ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے، اسی کے بعد وہ نہرو خاندان سے ایسے وابستہ ہوتے گئے، کہ وہ اس خاندان کے رکن معلوم ہونے لگے، کانگریس کی سیاسی سرگرمیوں میں اُن کا برابر کا حصہ رہا، مگر ۱۹۲۳ء کے بعد ملک میں ہندو مسلم یکجہتی کا وہ خوشگوار منظر دیکھنے میں نہیں آیا جو ۱۹۲۰ء کے عدم تعاون اور خلافت کی تحریکوں کے زمانہ میں آیا تھا، دو تین سال کے اند

ں ہندو مسلمان کے تعلقات بگڑنے لگے کشیدگی بڑھی، فرقہ وارانہ فسادات ہونے لگے، عدم تعاون اور خلافت دونوں کی تحریکیں بے جان سی ہوتی چلی گئیں، ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۲۵ء میں پھر اپنی پرکٹس کی طرف توجہ کرنی چاہی، مگر اُن پر گاندھی جی، موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو کا ایسا دباؤ پڑا کہ سیاسی کاموں سے الگ نہ رہ سکے، ۱۹۲۶ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری کا عہدہ ان کو دیا گیا لیکن انھوں نے انکار کیا،

میں نے ان کو پہلی دفعہ مظفر پور (صوبہ بہار) میں ۱۹۲۶ء میں دیکھا تھا، وہاں مولانا شوکت علی تشریف لانے والے تھے، ریلوے اسٹیشن پر بہت سے مسلمان اُن کے استقبال کے لئے پہونچے، میں بھی ان کے ساتھ تھا، جاڑے کا موسم تھا، گاڑی صبح کے وقت پہونچی تھی، اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ فرسٹ کلاس کا دروازہ کھولا گیا، مولانا شوکت علی ڈبے کے پھاٹک پر نمودار ہوئے، تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر سید محمود بھی دکھائی دیئے، اس زمانہ میں کانگریس سے مسلمانوں کی بدگمانی شروع ہوگئی تھی، اس لئے ڈاکٹر صاحب سے مسلمانوں نے کوئی خاص گرمجوشی نہیں دکھائی، ایک صاحب میری بغل میں کھڑے تھے، انھوں نے کہا کہ یہ ہندوؤں کے خاص آدمی ہوگئے ہیں" میں خاموش رہا، ڈاکٹر صاحب کی صحبت میں رہنے کے بعد یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ خریدے نہیں جا سکتے تھے، وہ اپنے وطنی جذبے میں جو کچھ کرتے رہے، اس میں ان کا صرف اخلاص تھا، یہ اور بات ہے کہ ان کے مخلصانہ جذبات کو مسلمان شکوک نگاہوں سے دیکھتے رہے دیکھنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کے وطنی جذبات کو تو ہندو پریس میں خوب اچھالا جاتا لیکن وہ مسلمانوں کی ہمدردی میں جو کچھ کہتے یا کرتے، وہ پریس میں بلیک آوٹ ہو جاتا تھا، ڈاکٹر صاحب کی طرح دوسرے کانگریسی اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی سیاسی زندگی کا بھی

یہ کہا کہ اُن کی زندگی کا ایک ہی رُخ پریس میں آیا، دوسرے رُخ پر پردہ پڑا رہا، اس سے ملک کو بھی نقصان پہونچا، مسلمان کانگریسی رہنما مسلمانوں کے لئے جو ہمدردانہ جذبات رکھتے تھے، وہ بھی پریس میں آتے رہتے، تو اُن کی قیادت بھی ضرور موثر اور مفید ہوتی رہتی، ڈاکٹر صاحب ہی کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں انھوں نے مسلمانوں کی ہمدردی میں بہت کچھ کیا،

مثلاً ملابار میں موپلاؤں پر بڑے مظالم ڈھائے گئے، اُن کو ٹرین کے ڈبوں میں جانوروں کی طرح بھر بھر کر جلاوطن کیا گیا، ان کے گھر برباد کر دیئے گئے، اُن کو اپنی املاک سے محروم کر دیا گیا، ان مظالم کی تحقیقات کے لئے پہلی آواز ڈاکٹر صاحب ہی نے اٹھائی، پھر سرحد کے پٹھانوں کے ساتھ بھی جو مظالم ہوئے اُن کی تحقیقات کی تحریک بھی ان ہی کی کوشش سے ہوئی، لیکن یہ سب کچھ پریس میں نہیں آیا، اور عام مسلمان یہی سمجھتے رہے کہ ڈاکٹر صاحب وہی سب کچھ کرتے ہیں جو کانگریس کرنے کو کہتی ہے:

۱۹۲۹ء میں ڈاکٹر صاحب آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری بنائے گئے۔ اس فرض کو وہ ۱۹۳۰ء تک انجام دیتے رہے، اس دور کی کانگریس کی تاریخ میں اُن کا نام بھی نمایاں طور پر لکھے جانے کا مستحق ہے، اُن کی اس زمانہ کی پوری سرگرمیوں کا احاطہ کرنا اس مقالہ کا مقصد نہیں،

۱۹۳۰ء میں وہ سول نافرمانی کی تحریک کے سلسلہ میں پھر جیل گئے، اُن کے جیل جانے سے پہلے آل انڈیا کانگریس کمیٹی غیر قانونی قرار دے دی گئی۔ تو انھوں نے خفیہ مسنجر سسٹم کا طریقہ اختیار کیا، جس سے کانگریس کو اس کے کاموں میں بڑی مدد

ملا، پھر انھی کی مساعیِ جمیلہ سے ہندوستان کی کئی صوبوں پر کانگریس کا اقتدار حاصل ہوا،
کانگریس میں مسلمانوں کی آواز کو موثر بنانے کے لئے ۱۹۳۰ء میں مسلم نیشنلسٹ پارٹی
کے قیام کو عمل میں لائے۔ پھر ۱۹۳۲ء میں ہندو مسلمان کو ایک دوسرے سے قریب تر
کرنے کے لئے ایک اتحاد کانفرنس کی تجویز پیش کی، جو الٰہ آباد میں بلائی، اس میں ہندوؤں
کے تمام سربرآوردہ رہنما شریک ہوئے، ڈاکٹر صاحب اس کانفرنس کے نتیجہ سے خوش
تھے، کہ اس میں مسلمانوں کے تحفظات اور مطالبات کے تمام بنیادی اصول مان لئے
گئے تھے، جو بعد میں برطانوی حکومت کے ۱۹۳۵ء کے کمیونل ایوارڈ کی شکل میں
نمودار ہوئے،

ان کی سیاسی سلامت روی اور دیانت داری کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ مولانا محمد علی
کبھی اُن سے بدظن نہیں ہوئے، مولانا محمد علی کو کانگریس سے اختلاف ہوا تو وہ اس سے دور
ہٹتے چلے گئے، ڈاکٹر صاحب برابر کانگریس سے وابستہ رہے، اس کے باوجود مولانا محمد علی کو
ان کی ذات پر پورا اعتماد رہا، ان کو آخر وقت تک عزیز رکھا، اُن کو خط لکھتے تو "پیارے
محمود" سے مخاطب کرتے، اور کھل کر اپنے دل کی باتیں لکھتے، ۴ رمئی ۱۹۲۹ء یعنی اپنی وفات
سے تقریبًا ڈیڑھ سال پہلے ڈاکٹر صاحب کو ایک مکتوب لکھا اس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں:۔
"پیارے بھائی، بظاہر یہ دو سال ہمارے Character کے امتحان کا زمانہ ہے،
سب کا پردہ کھل رہا ہے، ہم لوگ دشمنانِ ملک اور رہزنانِ ملت ہیں، آج ....
زرطلب ملک پرور ملت دوست ہے، .... جن کو ساری عمر ہم نے گالیاں دیں اور کوسا وہ
ہم کو اپنا آلۂ کار بنانا چاہتے ہیں، سو جس طرح ہم مالوی اور مونجے کے یا نہرو اور چنتامنی کے آلۂ کار
نہیں بن سکتے، اسی طرح شفیع اور عبدالرحیم کے بھی آلۂ کار نہیں بن سکتے،

"اس وقت سوائے اس کے چارۂ کار ہی کیا ہے کہ دوا سے تھک کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائیں، ورمسلمانوں اور ہندوستان والوں کو خدا کے سپرد کر دیں، اور اُس وقت کا انتظار کریں جب کہ یہ اپنے نئے رہنماؤں کی ہدایت کا مزا چکھ کر پھر ہمارے پاس آئیں گے اور التجا کریں گے، چلو ہمیں انگریزوں اور اُن کے ہندو اور مسلمان غلاموں سے نجات دلا دو، خدا وہ وقت جلد لائے، یا ہم کو جلد اس دنیا سے اٹھائے، آمین، بہن اور بچیوں کو پیار،

تمہارا بھائی محمد علی"

مولانا عبد الماجد دریا بادی مولانا محمد علی کے بڑے پرستاروں میں ہیں، اُن سے گہرے ذاتی تعلقات بھی رہے، ڈاکٹر صاحب سے بھی ان کے مراسم تھے، اُن کے اور علی برادران کے تعلقات پر بڑا اچھا تبصرہ کیا ہے:۔

"سید محمود بڑی خوبیوں کے مالک تھے خصوصًا مشرقی قسم کی اخلاقی خوبیوں کے دردمندی، انکساری، مہمان نوازی، اور سب سے بڑھ کر مروت کے، شروع میں علی برادران سے خوب نبھ گئی لیکن آگے چل کر کہنا چاہیئے ۲۹-۱۹۲۸ء میں جب گاندھی جی اور علی برادران میں اختلاف ہوا، تو بے چارے کی پوزیشن عجب نازک سی ہو گئی، ادھر گاندھی جی کا اعتماد انھیں پورا حاصل تھا، اُدھر یہ بھی گوارا نہ تھا کہ بات علی برادران کی ضائع ہو جیوڈیشیل کمیٹیوں میں ووٹ دیتے وقت عجب کشمکش میں پڑ جاتے۔ اور کوشش اپنی دالی یہی کرتے کہ مروت کی عدالت سے ڈگری کسی کے خلاف بھی نہ صادر ہونے پائے، بے تکلف دوستوں پر یہ راز کھل گیا تھا، وہ شرافت کے اس منظر سے لطف لیتے۔"

ڈاکٹر صاحب کے سامنے مولانا محمد علی صاحب کا تذکرہ آجاتا تو وہ بھی اُن کا ذکر بڑی محبت اور عزت سے کرتے۔ اور مولانا مناظر احسن گیلانی کا جو مرثیہ مولانا محمد علی پر

اس کا یہ مصرع پڑھ کر اُن کو یاد کرتے،

ع عجب مستے عجب دیوانہ بودے

۱۹۳۵ء کی اصلاحات کے بموجب کانگریس نے مرکزی اور صوبائی قانون ساز مجلسوں کے انتخاب میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا، تو ڈاکٹر صاحب بھی ترہت (صوبہ بہار) کے دو حلقوں سے کھڑے ہوئے، اور کامیاب رہے، ان کو اپنے انتخابی حلقہ میں ایسی مقبولیت رہی کہ مسلم لیگ بھی اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں ان کو شکست نہ دے سکی، جداگانہ اور مخلوط انتخاب دونوں میں وہ ۱۹۶۵ء تک وہاں سے برابر منتخب ہوتے رہے،

۱۹۳۷ء کے انتخاب کے بعد جب بہار میں وزارت بنی تو وہ بھی اس کے ایک رکن تھے۔ اُن کے عقیدت مندوں کا تو خیال تھا کہ وہ اپنی خدمات اور آل انڈیا حیثیت کی بنا پر بہار کے وزیر اعلیٰ بنائے جائیں گے، لیکن ان کی جگہ پر سری کرشن سنہا اس عہدہ جلیلہ پر فائز کئے گئے، اس ناانصافی پر ڈاکٹر صاحب کو اندرونی شکایت تو ضرور پیدا ہوئی ہوگی، لیکن ان کی طبیعت میں جارحیت، جھگڑا، فساد، بالکل نہیں تھا وہ مکدر ضرور ہوتے، لیکن اپنے تکدر کا بوجھ خود برداشت کر لیتے، انھوں نے اپنی خانگی زندگی میں بھی غصے اور اشتعال کا اظہار شاید ہی کیا ہو، گھر میں کسی سے اُن کو رنج پہونچتا تو تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہ کر پھر خوش ہو جاتے، انھوں نے سری کرشن سنہا کے ساتھ پورا تعاون کیا، اور ان کو اپنا بھائی ہی سمجھتے رہے، اور جب اُن سے اس ناانصافی کا ذکر کیا جاتا تو وہ کہتے کہ وہ خود اس عہدے سے سری کرشن کے حق میں دست بردار ہو گئے تھے، اس طرح نکتہ چینوں کا منھ بند کر دیتے،

(باقی)

ادبیات

غزل

از جناب عروج زیدی

انقلاباتِ شب و روز کے حامل ہم ہیں
ہم ہیں اُن کی نگہ ناز کے قابل ہم ہیں

نہ وہ ذرہ تری دنیا کا فسردہ ہوتا
باعثِ گرمیٔ ہنگامۂ محفل ہم ہیں

سعیِ پیہم پہ بھی جس کو نہ فرشتے سمجھے
رمزِ دل ہی سے وہ عقدۂ مشکل ہم ہیں

جو حقیقت میں ہیں گردِ رہِ منزل اب تک
وہ سمجھتے ہیں چراغِ سرِ منزل ہم ہیں

وقت اپنا کے کبھی ہم سے کوئی کام تو لے
شورشِ سیل و سکوتِ لبِ ساحل ہم ہیں

ہاں حقیقت کی حقیقت سے خبردار ہیں ہم
کوئی حق ہیں ہو مگر عارفِ باطل ہم ہیں

ہمیں کونین نہیں، حاصلِ کونین ملے
جن کی ٹھوکر پہ ہیں کونین وہ سائل ہم ہیں

قوتِ سیلِ حوادث کا انھیں علم نہیں
جن کو یہ ناز ہے پروردۂ ساحل ہم ہیں

شرطِ انصاف نہیں اور جن پہ تہمت رکھنا
اپنی تابندہ روایات کے قاتل ہم ہیں

چاہے ہر خواب رہے تشنۂ تعبیر عروج
جو کبھی ہاتھ نہ پھیلائیں وہ سائل ہم ہیں

غزل

از جناب ڈاکٹر ولی الحق صاحب انصاری

دامانِ عشق آج بھی دستِ ہوس میں ہے
یہ طائرِ حسین ابھی تک قفس میں ہے

ہر چند ہوں فقیر، ہما دسترس میں ہے
گو تشنہ لب ہوں آبِ بقا ہر نفس میں ہے

زد پہ ہے آندھیوں کے ہر اک شمعِ آرزو
جو گل ہے زغۂ ستم خار و خس میں ہے

صحرا نوردِ بادیۂ راز کے لیے
اک تازہ انکشاف صدائے جرس میں ہے

مدت سے ہے تلاش مگر کچھ پتہ نہیں
شاید ہما بھی آج کسی کے قفس میں ہے

نازک سی شے ہے دل اسے جو چاہے توڑ دے
ٹوٹے دلوں کو جوڑ سکے کس کے بس میں ہے

واماندگانِ راہِ غمِ زندگی سنو
اک مژدۂ سکون بھی شورِ جرس میں ہے

اے خوشنوا چلن ہے زمانے کا اب یہی
تیری جگہ چمن میں نہیں ہے قفس میں ہے

دل کو ولی کے لذتِ دنیا کی ہے تلاش
یہ شاہبازِ فکر شکارِ مگس میں ہے

غزل

از جناب اسلم صاحب سندیلوی

لب ہیں مجبورِ تبسم اشک افشانی کے ساتھ
مجھکو جینا ہے بہر صورت گرانجانی کے ساتھ

طنز تھا یہ بھی خرد کی کوشش ناکام پر
قہقہہ دیوانگی کا چاک دامانی کے ساتھ

گلستاں میں بارشِ شبنم، گلوں کا ابتسام
سیم پاشی کے مناظر ہیں زر افشانی کے ساتھ

زیست کی دشواریوں کا بس یہی انعام ہے
منزلِ آخر جو طے ہو جائے آسانی کے ساتھ

آج پھوٹا ہے میرے دل کا تپکتا آبلہ
اشک میں کچھ خون کی سرخی بھی ہے پانی کے ساتھ

دستِ گلچیں سے مگر اس کو اماں ممکن نہیں
پھول گو رہتا ہے کانٹوں کی نگہبانی کے ساتھ

کہہ رہی ہے، مٹ نہیں سکتا مقدر کا لکھا
اشکِ شبنم پہ ہنسی گل کی پشیمانی کے ساتھ

یوسفستانِ محبت سے یہ آتی ہے صدا
چاک دامانی ہے لیکن پاک دامانی کے ساتھ

اس جہاں میں کون ہے اسلم کسی کا غمگسار
اب بھی آتی ہیں بہاریں جلوہ سامانی کے ساتھ

مطبوعات جدیدہ

علی گڑھ ماضی و حال ۔ از پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی، تقطیع بڑی، صفحات ۴۴ کاغذ نفیس، خوبصورت ٹائپ میں چھپا ہے، پروفیسر خلیق احمد نظامی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ملیگی۔

مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کا تنہا تعلیمی ادارہ نہیں، بلکہ ان کی تہذیب ثقافت کی تربیت گاہ اور ان کی ملی حیات کا سرچشمہ بھی ہے، مسلمانوں کی فلاح و ترقی میں اس کا بڑا حصہ رہا ہے، ان کی بڑی بڑی شخصیتیں اسی نے پیدا کیں، جنھوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی قابلیت کا ثبوت دیا اور ملک و ملت دونوں کی خدمت اور رہنمائی کا فرض انجام دیا اور آیندہ بھی مسلمانوں کی بہت سی توقعات اسی سے وابستہ ہیں، اس لیے وہ ہندوستان میں ان کا بڑا قیمتی سرمایہ ہے اور اس سے ان کو بڑا ذہنی لگاؤ ہے، پروفیسر رشید احمد صاحب کی پوری زندگی علی گڑھ میں گذری، وہ اس کی تاریخ اور روایات کے اس دور میں بہت بڑے امین ہیں اور اس سے ان کو ایسی والہانہ شیفتگی ہے کہ اسکی علامت بن گئے ہیں، اسلیے اسکی ترجمانی کا سب سے زیادہ حق انھی کو ہے، جس کو وہ برابر ادا کرتے رہتے ہیں اور علی گڑھ ان کا خاص موضوع بن گیا ہے، یونیورسٹی پر بہتوں نے لکھا ہے، لیکن جو خلوص و دلسوزی اور یونیورسٹی کی روایات کا جو جاندار اور شاندار مرقع ان کی تحریروں میں نظر آتا ہے اس سے دوسرے مضامین خالی ہیں، گذشتہ سال انھوں نے "سرسید تیموریل لکچرز" کے سلسلہ میں "علی گڑھ کے ماضی و حال" پر ایک خطبہ دیا تھا جس کو کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے، اس میں علی گڑھ کی تحریک، اس کی جامعیت اور سرسید کے کارناموں کی مختصر

۔گذشت امد مسلم یونیورسٹی کی روایات وخصوصیات کو اس خوبی واختصار سے پیش کیا گیا ہے کہ اس کا پورا مرقع سامنے آجاتا ہے، اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یونیورسٹی کے مستقبل کا ہو .ں سے مسلمانوں میں بےچینی ہے، رشید صاحب ان حالات سے مایوس اور شکستہ دل نہیں .نہ یہ مژدہ سنایا ہے

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی

اور موجودہ حالات کا تجزیہ کرکے حکومت، یونیورسٹی اور مسلمانوں کو بڑے مفید مشورے دیے ہیں اور یہ دکھایا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ تنہا مسلمانوں کا نہیں بلکہ جمہوریت اور سیکولرزم کے فروغ اور ملک کی تعمیر وترقی کا مسئلہ اور اس کی ناگزیر ضرورت ہے، یونیورسٹی کے پنچایتوں کو آزاد ہندوستان کی تعمیر میں پورا حصہ لینا ہے، ان کے بغیر اس کی تصویر میں رنگ نہیں بھر سکتا، اس سلسلہ میں مسلمانوں کے بعض دوسرے مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں، رشید صاحب ان لوگوں میں ہیں جو ماضی سے رشتہ منقطع کرنا پسند نہیں کرتے، بلکہ پرانی بنیادوں پر حال ومستقبل کی تعمیر چاہتے ہیں، اس رسالہ میں بھی یہ چیز نمایاں ہے، یہ رسالہ اگرچہ مختصر ہے لیکن بقامت کہتر وبقیمت بہتر کا مصداق ہے۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد ۔تقطیع بڑی، ضخامت ۳۲ صفحات، کتابت و طباعت بہتر، پتہ: دفتر رسالہ فکر ونظر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ملے گا۔

یہ رسالہ بھی رشید صاحب کے قلم سے ہے، انھوں نے رسالہ فکر ونظر میں ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم پر ایک مضمون لکھا تھا جس کو کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا گیا ہے، اس میں مسلم یونیورسٹی سے متعلق ڈاکٹر صاحب مرحوم کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کا جواب دیا گیا ہے، یہ واقعہ ہے کہ

سید اور ان کے رفقار کے بعد مسلم یونیورسٹی کی سب سے زیادہ خدمت ڈاکٹر ضیاء الدین
مرحوم نے کی ہے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی اس کے لیے وقف کردی تھی۔ اور
مختلف موقعوں پر اس کو سنبھالا اور مختلف حیثیتوں سے ترقی دی۔ انجینیرنگ کالج
ان کا کارنامہ، میڈیکل کالج کی بنیاد بھی انھی نے ڈالی تھی، ان میں مسلمانوں کی
تعلیم کی اتنی لگن تھی کہ اس راہ میں کسی رکاوٹ کی پروا نہ کی۔ اس کے لیے بدنامی بھی
مول لی، غریب طلبہ کی تعلیم کے لیے انھوں نے جس قدر آسانیاں فراہم کیں اور جتنے
نوجوانوں کو کام سے لگایا، اس کی دوسری مثال مشکل سے مل سکتی ہے۔ ان
خوبیوں کے ساتھ ان میں بعض خامیاں بھی تھیں، اور ان سے کون انسان خالی
ہے، لیکن ان کی بیشتر خامیاں بھی درحقیقت یونیورسٹی اور طلبہ کے فائدہ ہی کے لیے تھیں،
حکومت پرستی سے کوئی دور بھی خالی نہیں رہا ہے، لیکن پرانے حکومت پرستوں نے اس سے
اپنی قوم و ملت کو فائدہ پہنچایا، اور موجودہ دور کے حکومت پرستوں کا مقصد صرف ذاتی منفعت ہے،
اور اس کے لیے ان کو ملت فروشی میں بھی باک نہیں ہوتا۔

م

لاہور کا جو ذکر کیا - از جناب گوپال متل صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت
عمدہ، صفحات ۱۶۵ مجلد مع رنگین گرد پوش، قیمت تے، پتہ: مکتبہ تحریک ۹ انصاری مارکیٹ
دریا گنج، دہلی ۶

یہ مشہور صحافی و ادیب جناب گوپال متل کی ۳۲ء تا ۱۹۴۷ء کی دلچسپ یادداشتوں کا
مجموعہ ہے۔ ان کی ادبی زندگی کی بسم اللہ اردو صحافت سے ہوئی تھی، اور یہ زمانہ انھوں نے
اس کے مرکز لاہور کے مختلف اخباروں اور رسالوں کے شعبۂ ادارت میں بسر کیا تھا،

اسی لیے ان کے تعلقات اس دور کے اکثر اہل قلم صحافیوں، شاعروں اور ادیبوں سے رہے، جن میں بعض ملک گیر شہرت کے مالک تھے، اس کتاب میں انھوں نے اپنی سرگذشت کے ضمن میں ان لوگوں کے واقعات بھی تحریر کیے ہیں، اس لیے یہ آپ بیتی اور جگ بیتی دونوں ہے، اور اس میں اس زمانہ کے لاہور کی ادبی انجمنوں، اخباری سرگرمیوں اور مختلف سیاسی، نیم سیاسی سماجی، مذہبی اور علاقائی تحریکوں خصوصاً احرار، کانگریس اور مسلم لیگ کا اچھا خاصہ ذکر ہے، لیگ اور کانگریس کی بعض معرکہ آرائیوں کی روداد بھی ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب اس عہد کے حالات کی تاریخ بھی ہے، اور اتنی دلچسپ ہے کہ شروع کرنے کے بعد ختم کیے بغیر چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا،

نیم باز - از جناب عنوان چشتی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۲۸ مجلد مع گرد پوش، قیمت للعہ، پتہ: مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

جناب افتخار الحسن عنوان چشتی لکچرار اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کو نظم پر یکساں قدرت ہے، "نیم باز" ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے، جو غزلوں، نظموں، رباعیوں اور قطعات پر مشتمل ہے، عنوان صاحب نے "اپنی شاعری کو اپنی زندگی، زمانہ اور ماحول کی لطافتوں اور کثافتوں کا عکس بتایا ہے"، اس مجموعہ سے بڑی حد تک اس کی تصدیق ہوتی ہے

واقعات النبیؐ - مرتبہ مولانا عبد الباطن صاحب جونپوری، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۲۸، قیمت ۶؍ پتہ: کتب خانہ کرامتیہ، محلہ ملا ٹولہ، جونپور

اس کتاب میں رسول اللہ صلعم کے معجزات، اوصاف و محامد، پاکیزہ سیرت اور ستودہ کردار سے متعلق نتیجہ خیز و سبق آموز واقعات جمع کیے گئے ہیں، زبان عام فہم اور پیرایۂ بیان آسان ہے، اس لیے ہر مسلمان کے لیے مفید و کار آمد ہے۔

"ض"

ہماری بعض نئی مطبوعات

مقالات سلیمان جلد اول تاریخی

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے ان اہم تاریخی مضامین کا مجموعہ جو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، قیمت : للعہ

مقالات سلیمان جلد دوم تحقیقی

سید صاحب کے علمی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں ہندوستان میں علم حدیث، محمد بن عمر الواقدی، عرب و امریکہ، اسلامی رصد خانے کے علاوہ اور بھی بہت سے محققانہ مضامین ہیں، قیمت : للعہ

مقالات سلیمان جلد سوم قرآنی

مولانا سید سلیمان ندوی کے مقالات کا تیسرا مجموعہ جو صرف قرآن کے مختلف پہلوؤں اور اس کی بعض آیات کی تفسیر و تعبیر سے متعلق ہیں، (زیر طبع)

مقالات عبد السلام

مولانا عبد السلام ندوی کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور تقریروں کا مجموعہ، قیمت : عہ

تذکرۃ المحدثین (جلد اول)

دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک صحاح ستہ کے مصنفین کے علاوہ دوسرے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام وغیرہ کے حالات و سوانح، اور ان کے خدمات حدیث کی تفصیل مرتبہ مولوی ضیاء الدین اصلاحی رفیق دار المصنفین، قیمت : ہے

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری حضرت شمس تبریز کی ملاقات کی روداد، اور ان کی زندگی کے بہت سے واقعات کی تفصیل، مؤلفہ قاضی تلمذ حسین صاحب مرحوم، قیمت :- عہ

کشمیر سلاطین کے عہد میں

جنت نظیر کشمیر میں مغل فرمانرواؤں سے پہلے جن مسلمان فرمانرواؤں کی حکومت رہی ہے، اور جنھوں نے اس کو جنت و کرشک جناں بنا دیا، انکی بہت ہی مستند اور مفصل سیاسی و تمدنی تاریخ، مترجمہ علی حماد عباسی ایم اے قیمت : ہے

(منیجر دار المصنفین اعظم گڑھ)